منتخباتِ یوسفی

ڈاکٹر میمونہ مسعود

شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ

منتخباتِ یوسفی

مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری

مع

انتخابِ مضامین

ڈاکٹر میمونہ مسعود

شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ

کتاب کا نام	:	''منتخبات یوسفی''
مرتبہ	:	ڈاکٹر میمونہ مسعود
سن اشاعت	:	۲۰۰۵
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۲۰۰
سرورق	:	محمد مسعود علی
کمپوزنگ	:	محمد منہاج الدین فیصل: 9849061134
طباعت	:	شارپ کمپیوٹرس چادر گھاٹ: Ph:55704044
		وی ایس گرافک۔ دلسکھ نگر۔
ناشر	:	وطن پبلشر 10-2-5/10
		اے۔سی۔ گارڈز' حیدرآباد۔ اے پی۔
		Ph:23391388

کتاب ملنے کے پتے:

- وطن پبلیشر 10-5-5/10 اے سی گارڈز، حیدرآباد۔ اے پی۔
- انجمن ترقی اُردو' آندھراپردیش' اُردو ہال' حمایت نگر۔
- سب رس کتاب گھر' ایوان اُردو پنجہ گٹہ' حیدرآباد۔
- حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان' حیدرآباد۔
- دفتر رسالہ شگوفہ بیچلرس کوارٹرس' معظم جاہی مارکٹ' حیدرآباد۔
- انجمن ترقی اُردو' اُردو گھر' نئی دہلی۔

انتساب

میرے

پیرومرشد حضرت حبیب محمد عمر حسینی قادری قبلہ مدظلہٗ

اور

میرے رفیق حیات محمد مسعود علی

کے نام

فہرست مضامین

☆☆☆

حرفِ آغاز

MUJTABA HUSSAIN

10/10/2005

اس وقت میرے پیشِ نظر ڈاکٹر میمونہ وحید شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی کتاب "ملخصاتِ یوسفی" ہے۔ ڈاکٹر میمونہ نے اس کتاب کو ترتیب دے کر ہمارے قارئین کو جو پہلے سے ہی تن آسانی اور کاہلی کا شکار ہیں کچھ اور کاہل اور تن آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی چار کتابوں "چراغ تلے" "خاکم بدہن" "زرگزشت" اور "آبِ گم" کے نہایت منتخب حصے انھوں نے چُنے ہیں تاکہ پڑھنے والے یا تو ہر کتاب کو دیکھے بغیر اس کا مزہ چکھ لیں یا ان نمونوں کی لذت سے بے تاب ہو کر اصل کتابوں کو پڑھنے کی طرف راغب ہوں۔

مشتاق یوسفی کی ہر تحریر منفرد ہوتی ہے۔ یوسفی نے ہمارے طنز و مزاح کو عالمی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ اُن کا ہر جملہ بلکہ فل اسٹاپ اور کاما تک نیا تُلا ہوتا ہے ہمیں اُن کی تحریر کی کاٹ کو سمجھنے کے لیے فل اسٹاپ اور کاما تک کو پڑھنا پڑتا ہے۔

طنز و مزاح کی وہ لہر جو غالب کے قلم سے اُٹھی تھی جس میں لکھنے والا اپنے آپ پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتا ہے اُسے یوسفی نے نقطۂ عروج پر پہنچایا ہے۔ وہ نہ کسی کے مقلد ہیں اور نہ کوئی اُن کی نقل کر سکتا ہے۔ طنز و مزاح کی دنیا میں اُن کی اپنی سلطنت آباد ہے جس کے وہ شہنشاہ ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کا معیار اُن کی پہلی کتاب سے ہی برقرار ہے۔ چراغ تلے کے انشائیے قدرے مختصر ہیں۔ خاکم بدہن میں اُن کے مضامین نسبتاً طویل ہیں۔ زرگزشت تو پوری کی پوری سوانح عمری ہے اور آبِ گم میں یادوں پر مبنی ناول کی

J.N. Road, Hyderabad - 500 001. Tel: (O) 24744180, 24744114
Fax: 040-24603188. e-mail: info@siasat.com
502, Maphar Regency, A.C. Guards, Hyderabad-500 004. Tel: (R) 23396633

کیفیت ہے

بڑے بڑے مزاح نگاروں کے پاس بھی تکرار ملتی ہے لیکن یوسفی کی تحریریں اس عیب سے یکسر پاک ہیں۔ ہم اردو والے کسی کے جوہرِ قابل کو پہچاننے اور اس کو صحیح رتبہ دینے میں ہمیشہ پس و پیش کرتے ہیں۔ ابتداء میں یوسفی کو رشید احمد صدیقی کا مقلد اور جانشین بتایا گیا حالانکہ یوسفی اب اپنے تمام پیش روؤں سے آگے نکل چکے ہیں۔

ایسے منفرد مزاح نگار کا جو اپنے ہر جملے پر بلا کی محنت کرتا ہے انتخاب کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عطر کا عطر نکالے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کام اتنا آسان بھی ہے کہ آپ کہیں سے بھی کوئی حصہ لے سکتے ہیں اور اس کو انتخاب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر میمونہ نے محنت کے ساتھ یہ انتخاب تیار کیا ہے۔ پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ جب یہ کتاب شائع ہوگی تو یوسفی کے چاہنے والے اُن سے شکایت کریں گے کہ کئی عمدہ حصے شائع ہونے سے رہ گئے۔ ایسی صورت میں آپ کو شکایت مرتب سے نہیں بلکہ خود مشتاق احمد یوسفی سے ہونی چاہیے جو سر تا پا انتخاب ہیں۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

میں میمونہ وحید کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اس کتاب کی مناسب پذیرائی ہوگی۔

۱۰ جون ۲۰۰۵
حیدرآباد

(مجتبیٰ حسین)

دیباچہ

موجودہ دور میں اُردو طنز و مزاح کو اعلیٰ و ارفع بنانے میں مشتاق احمد یوسفی منفرد مقام رکھتے ہیں۔ دیگر مزاح نگاروں کے برخلاف ان کے پاس طنز کم سے کم اور مزاح زیادہ سے زیادہ ملتا ہے۔ اور پھر طنز کو مزاح بنا کر پیش کرنا انہی کا حصہ ہے۔ ابھی تک ان کی چار تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ (1) چراغ تلے (2) خاکم بدہن (3) زرگذشت (4) آب گم۔

مشتاق احمد یوسفی کی فن کارانہ صلاحیت کا اندازہ لگانے کے لئے ان کی چاروں تصانیف کا مطالعہ ضروری ہے۔ چراغ تلے اور خاکم بدہن میں مختلف موضوعات سے متعلق مزاحیہ مضامین اور خاکے شامل ہیں تو زرگذشت سوانح عمری اور آب گم کو ناول کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں کی گئی۔ گو یہ دونوں تصانیف میں (Fact) کو Fiction کے ساتھ آمیز کیا گیا ہے۔ اس کے لئے یوسفی نے ایک نئی اصطلاح Faction کی استعمال کی ہے۔ اس طرح ان کی جدت طراز فطرت نے فن کے جوہر دکھائے۔ ان کی ہر کتاب علاحدہ نوعیت رکھتی ہے۔ ہر ایک کو فن کے ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور وہ اس میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی تصانیف کا انداز بیان، طرز تحریر، تخیل کی پرواز اور انشاء پردازی کی شان ان کی مزاح نگاری ہی میں مضمر ہے۔ جس کا اندازہ شاید اس انتخاب مضامین سے بآسانی ہو سکے گا۔ تاکہ ان کی تمام تصانیف کے مطالعہ کی زحمت پیش نہ ہو یا پھر ان مضامین کے مطالعہ سے ان کی تصانیف کو پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہو۔ چنانچہ اس نقطہ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے راقمہ نے ان کی ہر کتاب سے ایسے چندہ چندہ مضامین کا انتخاب کیا ہے جس سے ان کی فن کارانہ صلاحیت اجاگر ہو سکے اور پھر ساتھ ساتھ ان کے مزاحیہ پہلوؤں سے لطف اندوز بھی ہو جائے۔ فرد، سماج اور قوم کی بے اعتدالیاں دور کرنے میں معاون بھی ثابت ہو سکے۔

انتخاب میں چاروں کتابوں کے دیباچوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ کہنے کو تو یہ دیباچے ہیں لیکن ان کے فکر و فن کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اس میں فن مزاح اور مزاح نگار کے فرائض منصبی سے متعلق بصیرت افروز خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ کوئی بھی مزاح نگار ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ہی بہترین مزاح نگار بن سکتا ہے۔ مزاح نگاری بہت مشکل فن ہے۔ بقول یوسفی ''لہو کی آگ میں جل کر نکھرنے کا نام ہے۔ یہ آگ کے شعلے نہیں برساتی بلکہ خون جگر پی کر پھول برساتی ہے۔''

اس انتخاب میں یوسفی کی کتابوں سے حسب ذیل مضامین شامل کیئے گئے ہیں۔جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

چراغ تلے : پڑیئے گر بیمار۔کافی۔چارپائی اور کلچر

خاکم بدہن : صبغے اینڈ سیزر۔سیزر ماتا ہری اور مرزا۔بارے آلو کا کچھ بیان ہو جائے۔

زرگذشت : سبق یہ تھا پہلا کتاب ربا کا

آب گم : حویلی

غیر مطبوعہ کتاب: شاہ جی کی کہانی دوسرے شاہ جی کی زبانی

مشتاق احمد یوسفی کی آنے والی کتاب سے جو مضمون لیا گیا ہے وہ دراصل مشہور و معروف مزاحیہ ادب کے رسالے ''شگوفہ'' میں شائع ہوا۔یہ یوسفی کی آنے والی کتاب میں شامل ہوگا۔اس کا پتا کیسے چلا اس کا قصہ دلچسپ ہے۔ہوا یوں کہ جب راقمہ نے اپنا انتخاب مکمل کر لیا تو اس کتاب کے ''حرف آغاز'' لکھنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔اس سلسلے میں جب استاد محترم پروفیسر یوسف سرمست صاحب سے میں نے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا پاکستان کے سب سے بڑے مزاح نگار کے مضامین پر کا انتخاب پر ہندوستان کے سب سے بڑے مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے لکھوایئے۔مجتبیٰ حسین صاحب سے راقمہ کو جب نیاز حاصل ہوا تو انہوں نے مشتاق احمد یوسفی کا ٹیلی فون نمبر دیتے ہوئے کہا کہ ان سے کتاب کی اشاعت کی اجازت لیجئے۔مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ محترم یوسفی صاحب سے کئی بار گفتگو کرنے کا اعزاز راقمہ کو حاصل ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے نہ صرف اس انتخاب کو شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ یہ بھی کہا کہ ''اگر کوئی ایک جملہ بھی میرا پسند کرتا ہے تو میں اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔'' یہ جملہ میرے لیئے جتنی خوشی کی بات ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے یوسفی صاحب کی بڑائی کا جتنا اظہار ہوتا ہے اس کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔شائع ہونے والی کتاب کے بارے میں راقمہ نے جب دریافت کیا کہ آپ اس کتاب میں کس مضمون کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں تو انہوں نے کہا ''آپ لوگوں کی پسند ہی میرے لیئے سب کچھ ہے۔'' مجتبیٰ حسین صاحب کے ذکر پر انہوں نے کہا مجتبیٰ حسین بہت بلند پایہ مزاح نگار ہیں۔راقمہ کو یہ لکھتے ہوئے بھی بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ یوسفی صاحب نے یہ بتایا کہ وہ ایک ناول بھی لکھ رہے ہیں۔

یوسفی کو موجودہ زمانے تک محدود کر دینا بھی ان کے مقام کو نہ سمجھنے کے مترادف ہوگا۔وہ اُردو ادب کی مزاح کی تاریخ میں بے نظیر اور بے مثال حیثیت رکھتے ہیں۔انہوں نے جو چار کتابیں لکھی ہیں۔اگر ساری کتابوں کو جمع کر کے ''کلیات یوسفی'' مرتب کیا جائے تو وہ کم و بیش ہزار صفحات پر مشتمل ہوگا۔کلیات یوسفی ابھی مرتب نہیں ہوا۔ان کی چاروں کتابوں کو خریدنا ہر ایک کے لئے ممکن نہ ہوگا۔اس وجہ سے بھی راقمہ کو یہ

خیال آیا کہ ان کا ایک انتخاب ترتیب دیا جائے۔ جس سے ''چراغ تلے'' میں یوسفی نے مزاح کے جو چراغ روشن کیے ہیں۔ اس کا اجالا حاصل ہو جائے'' خاکم بدہن'' سے منہ کو ایک بالکل نئے ذائقہ سے آشنا کیا جائے۔ ''زرگذشت'' میں جوان کی سرگزشت چھپی ہوئی ہے۔ اس کو سامنے لایا جائے اور ''آب گم'' میں جو آب وتاب ہے۔ اس سے بصارت وبصیرت کا سامان مہیا کیا جائے۔ آنے والی کتاب سے کیا کچھ حاصل ہوگا یہ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ یوں ہر ایک کتاب کو دیکھے بغیر ہر کتاب کا مزہ چکھ لیا جائے۔ اسی لئے یوسفی کا ایک نمائندہ انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔

یوسفی کی ہر تحریر اگر یہ کہا جائے کہ بجائے خود منتخب ہوتی ہے۔ تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اس لئے یوسفی کے مزاح نگاری کا انتخاب بہت کٹھن اور دشوار گذار مرحلہ تھا۔ اس وجہ سے ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ جن مضامین کو زیادہ سے زیادہ لوگوں نے پسند کیا اور جن کو ہم بھی سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ انہیں انتخاب میں شامل کیا جائے۔ اور اس انتخاب میں جس خاص بات کا خیال رکھا گیا ہے۔ وہ ہے ''اُردو زبان'' کی وہ ادائیں جن کو یوسفی نے اپنی تحریروں میں منعکس کیا ہے۔ اس دیباچے کو پروفیسر ال احمد سرور کے ایک مختصر سے اقتباس پر ختم کرتے ہیں:

> ''اُردو زبان کی ہر ادا اور ہر کروٹ دیار یوسفی میں جلوہ گر ہے۔ اس سے زیادہ کسی کے لئے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہمارے مزاحیہ ادب کی آبرو تو ہیں یہی اُردو ادب کی بھی آبرو ہیں۔''

اس انتخاب کے سلسلہ میں سب سے پہلے استاد محترم پروفیسر یوسف سرمست صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے اس طرف میری توجہ مبذول کروائی اور انہی کے مشورہ سے انتخاب عمل میں آیا۔ اور یہ کتاب مرتب کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ محترم مجتبیٰ حسین صاحب کی مشکور ہوں کہ انہوں نے حرف آغاز لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ والدین کی دعا' محنت اور محبت کا ثمر ہے کہ آج میں اس مقام پر ہوں۔ رفیق حیات محمد مسعود علی کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔ وہ جس خاموشی سے میری مدد کرتے ہیں اس کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں محمد منہاج الدین فیصل اُردو کمپوزنگ ، ناشر وطن پبلیشر اور مصطفیٰ قاسمی شارپ کمپیوٹر کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں جن کی کوشش سے کتاب کی اشاعت جلد ممکن ہوسکی۔

ڈاکٹر میمونہ مسعود

☆☆☆

مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری

اُردو طنز و مزاح کے موجودہ دور میں مشتاق احمد یوسفی بے حد اہم اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت و مقبولیت اور انفرادیت ایسی ہے جو بہت کم مزاح نگاروں کے حصے میں آتی ہے۔ انہوں نے اُردو کے عام مزاح نگاروں کے برخلاف طنز کے بجائے مزاح کی نرمی کو اپنایا۔ ان کے پاس طنز کم سے کم اور مزاح زیادہ سے زیادہ ملتا ہے۔ شاید اسی لئے ال احمد سرور یوسفی کو سب سے پہلے مزاح نگار، ظرافت نگار اور پھر بعد میں طنز نگار کی حیثیت عطا کرتے ہیں:

> ''یوسفی کے ہاں یوں تو مزاح، ظرافت، طنز تینوں کی کارفرمائی ہے مگر میرے نزدیک وہ مزاح نگار اور ظرافت نگار پہلے ہیں، طنز نگار بعد میں۔ طنز نگار خاصا بے رحم ہوتا ہے۔ وہ کسی کمزوری کو نہیں بخشتا اور بعض کمزوری پر وار نہیں کرتا بلکہ ''توپ دم'' کر کے ہی مطمئن ہوتا ہے۔ مزاح نگار زیادہ دردمند، زیادہ ہمدرد ہوتا ہے۔ یوسفی کی دردمندی، ان کی ہر تحریر سے جھلکتی ہے۔''
>
> (مشتاق احمد یوسفی ایک مطالعہ مرتب مظہر امام ص ۱۲۳)

اسی طرح ڈاکٹر مجیب السلام کے نزدیک یوسفی خالص مزاح نگار ہیں۔ ان کے فن کو یورپی مزاح کا نمونہ قرار دے کر لکھا ہے کہ

> ''یوسفی خالص مزاح نگار ہیں۔ ان کا فن یورپی مزاح کا نمونہ ہے۔ جس سے اُردو کا شاید ہی کوئی مزاح نگار ان کا ہم پلہ ہو۔''
>
> (مشتاق احمد یوسفی ایک مطالعہ مرتب مظہر امام ص ۱۲۰)

اُردو طنز یہ و مزاحیہ نثر کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے، اس کے میدان کو وسعت بخشنے اور معیار کو بلند سے بلند تر کرنے میں یوں تو کئی نام ملتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے پہلے پطرس بخاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنی جدت طرازی کی بدولت اُردو مزاح میں اتنے اضافے کئے کہ اُردو طنز و مزاح کی تاریخ میں ایک عہد کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور موجودہ دور میں یہی حال مشتاق احمد یوسفی کا ہے۔ یہ فطرتاً مزاح نگار واقع ہوئے ہیں اور انہوں نے نہ صرف پطرس بخاری اور ان کے ہمعصروں کے بنائے ہوئے وقار کو قائم رکھا بلکہ جدت طرازی کی بدولت اس میں بہت کچھ اضافے بھی کیئے اور یہی چیز انہیں حیات ابدی بخشنے کے لئے کافی ہے۔

دراصل یوسفی کی مزاح نگاری' اُردو مزاح نگاری کی بہترین روایت کا شاندار تسلسل ہے اس وجہ سے بعض حضرات ان کی تحریر کو کبھی پطرس بخاری اور کبھی رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری کی خصوصیات کا حامل سمجھتے ہیں۔ بعض وقت ان دونوں کی خصوصیات کو یوسفی میں یکجا دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ

''یوسفی کو پڑھ کر آپ پطرس اور رشید احمد صدیقی کو الگ الگ پڑھنے کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔''

(سو ہے وہ بھی آدمی ۶۲)

''چراغ تلے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ثناءاللہ نے یوسفی کا رشتہ رشید احمد صدیقی سے جوڑتے ہوئے لکھا ہے:

''مشتاق احمد یوسفی' پطرس کی روایت کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کی تحریر کا سلسلہ نسب پطرس سے نہیں رشید احمد صدیقی سے ملتا ہے۔ چاہے انہوں نے جا بجا پطرس سے استفادہ ہی کیوں نہ کیا ہو۔''

(''نیا دور'' کراچی خاص نمبر جون ۱۹۶۲ء ص ۳۵۸)

پروفیسر نظیر صدیقی' یوسفی کے اسلوب کو رشید احمد صدیقی کی تقلید بتاتے ہوئے بھی ان کی انفرادیت اور اہمیت کے یوں قائل نظر آتے ہیں:

''خصوصاً مشتاق احمد یوسفی کے اسلوب پر رشید احمد صدیقی کا عکس زیادہ اور گہرا اور واضح ہے وہی Alliteration کا استعمال' وہی خیالات اور الفاظ کی حیرت انگیز اجماع' وہی غیر متوقع موڑ Tun' وہی خیالات کی چمک Flashas غالب کے اشعار کا ویسا ہی استعمال۔ پھر لطف یہ کہ مشتاق احمد یوسفی' رشید احمد صدیقی کی خوبیوں کو اپنانے کے باوجود ان کی کمزوریوں سے محفوظ رہے ہیں۔''

(میرے خیال میں از پروفیسر نظیر صدیقی ص ۲۰۱)

مشتاق احمد یوسفی لاکھ انکار کریں ہمیں تو ان کی تحریروں کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ وہ پطرس بخاری سے کافی حد تک متاثر ہیں۔ ان کی تحریر میں جگہ جگہ پطرس کے اثرات صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے وہ اپنے مضمون ''سیزر' ماتا ہری اور مرزا'' میں مرزا کی زبانی پطرس بخاری کو یوں یاد کیا ہے:

''کتا پالنے کی حسرت کا اظہار ہم نے بارہا مرزا کے سامنے کیا مگر وہ کتے کا نام آتے ہی کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ کہتے ہیں واہیات جانور ہے۔ بالکل بے مصرف' کتے کی تخلیق کا واحد مقصد یہ تھا کہ پطرس اس پر ایک لاجواب مضمون لکھے۔ سو یہ مقصد' عرصہ ہوا پورا ہو چکا اور اب اس نسل کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔'' (خاکم بدہن ص ۱۴۱ تا ۱۴۲)

یوسفی کے مضمون ''سیزر،ماتا ہری اور مرزا'' میں پطرس کا انداز نظر آتا ہے:

''اگر بجے حکم دیتے کہ جاؤ اس راہ گیر کے پیچھے لگ جاؤ تو یہ میرا شیر اپنی کمین نگاہ سے نکل کر تعمیلاً جھپٹ پڑتا اور اس کی ٹائی پکڑ کر لٹک جاتا۔لیکن جب دوسرا حکم ملتا کہ چھوڑ دو۔تو مجال ہے،جو چھوڑے''۔

(خاکم بدہن ص ۵۰)

پطرس بخاری کا انداز ملاحظہ فرمائیے:

اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون اور کوٹ کو دیکھتے ہی بھونکنے لگ جاتے ہیں۔''

(مضامین پطرس ص ۲۷)

یوسفی کا مضمون ''پڑیئے گر بیمار'' میں خیال کی ندرت اور الفاظ کے حسن کا جادو ملاحظہ فرمائیے:

ان کا آنا فرشتہ موت کا آنا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل السلام روح قبض کرتے وقت اتنی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔زکام انہیں نمونیہ کا پیش خیمہ دکھائی دیتا ہے اور خرہ میں ٹائیفائیڈ کے آثار نظر آتے ہیں۔ان کی عادت ہے کہ جہاں محض سیٹی سے کام چل سکتا ہے وہاں بے دھڑک بگل بجادیتے ہیں۔مختصر یہ کہ ایک ہی سانس میں خدانخواستہ سے اناللہ تک تمام منزلیں طے کر لیتے ہیں۔

(چراغ تلے ص ۲۵)

پطرس بخاری کے پاس یہی چیز اس طرح موجود ہے:

''یہ سوتے کو جگاتے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں اور حضرت عیسیٰ بھی تو واجبی طور پر ہلکی سی قم کہہ دیا کرتے ہوں گے۔زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کر تھوڑی پڑ جاتے ہیں تو پیں داغا کرتے ہیں۔''

(مضامین پطرس ۱۸ تا ۱۹)

خود یوسفی کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے سے پیش رو،ہمعصر مزاح نگاروں کی بدولت لکھ رہے ہیں۔جن مزاح نگاروں کے نام انہوں نے گنائے ہیں ان میں شفیق الرحمٰن،کرنل محمد خاں،ضمیر جعفری،ابن انشاء،محمد خالد اختر،مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم شامل ہیں۔پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کا وہ علاحدہ طور پر نام لے کر انہیں سرفہرست بتاتے ہیں۔وہ ان تمام مزاح نگاروں کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''یہ تو ایک خوش نصیبی ہے کہ ہم ایسے دور میں پیدا ہوئے کہ جس میں یہ کچھ ہمیں پڑھنے کو ملا۔اگر یہ حضرات نہ ہوتے تو ہم بھی نہ ہوتے۔ہم جو کچھ

بھی لکھ رہے ہیں کہ یہ حضرات ہم سے پہلے یا ہمارے زمانے میں لکھ رہے
تھے۔ جہاں تک پسندیدگی کا تعلق ہے تو وہ تو سب پسند ہیں۔"

لیکن اس کے بعد وہ خصوصیت سے پطرس کا ذکر کرتے ہیں۔ اور یہاں تک کہتے ہیں کہ قلم کی گاڑی جب "اٹک" جاتی ہے تو پطرس کو پڑھنے کے بعد وہ رواں ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"لیکن پطرس آج بھی ایسا ہے کہ کبھی گاڑی اٹک جاتی ہے تو اس کا ایک صفحہ
کھولتے ہیں تو ذہن کی بہت سی گرہیں کھل جاتی ہیں اور قلم رواں ہو جاتا ہے۔"

(مشتاق احمد یوسفی ایک مطالعہ ص ۳۷)

قلم کی روانی کا اعتراف کرنے کے باوجود وہ پطرس کے "اثر" کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ صرف انگریزی مصنفین سے متاثر ہیں۔ وہ پطرس ہی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"یہ پطرس ہی کی بات ہے لیکن ایک بات میں عرض کر دو کہ یہ سوال گھوم پھر
کے آتا ہے جہاں تک میرے ماخذ کا تعلق ہے۔ وہ انگریزی مصنفین ہیں۔"

(مشتاق احمد یوسفی ایک مطالعہ ص ۳۷)

وہ جن انگریزی مصنفین سے متاثر ہیں۔ ان میں مارک ٹوئین، سوئفٹ، اسٹیفن لی کاک، جارج میکش، جیمز جوئس اور انتھونی برجیس کے نام گناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر متاثر یا Influenced کا لفظ استعمال ہی کرنا ہے تو میں ان کا نام لوں گا۔ لیکن لوگ ان حقیقی ماخذ کے بارے میں نہیں لکھتے۔ ان کے کہنے کے مطابق:

"کبھی کبھی مجھے اس سے ضرور مایوسی ہوتی ہے کہ لوگ میری تحریروں میں
حقیقی یا فرضی پرچھائیاں، کبھی رشید احمد صدیقی یا کبھی پطرس کی ان کو دکھائی دیتی
ہیں لیکن جو میرے اصل ماخذ ہیں ان کی طرف آج تک کسی کی نظر نہیں گئی۔"

(مشتاق احمد یوسفی ص ۳۸)

مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت اور تخلیقی کارناموں میں بڑی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ ان کی تخلیقات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے۔ اور وہ وسیع النظر، وسیع القلب، بلند حوصلہ، باریک بین، شائستہ مہذب، ہمدرد، مخلص، زندہ دل، خوش گفتار، خوش اطوار اور شگفتہ بیان واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیت کے یہی پہلو انہیں مزاح نگار بنانے میں معاون ثابت ہوئے۔

یوسفی نہ صرف ایک اچھے مزاح نگار ہیں بلکہ طنز و مزاح کی بنیادی خصوصیات سے کماحقہ واقف بھی ہیں۔ ان خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے۔ اس راہ میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ان کا بڑی گہرائی کے ساتھ یوں تجزیہ کرتے ہیں:

"سادہ و پرکار طنز بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔ بڑے بڑوں کے جی چھوٹ

جاتے ہیں۔ اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسے پر اتر اتر کر کرتب نہیں دکھاتے بلکہ رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر اور اگر ژال پال سارتر کی مانند "دماغ روشن و دل تیرہ وہ نگہ بیباک" ہو تو جنم جنم کی یہ جھنجھلاہٹ آخر کار بڑی چیز کو چھوٹی کر دکھانے کا ہنر بن جاتی ہے۔ لیکن یہی زہر غم جب رگ و پے میں سرایت کر کے لہو کو کچھ اور تیز و تند و توانا کر دے تو نس نس سے مزاح کے شرارے پھوٹنے لگتے ہیں۔ عمل مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔ لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ۔ لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا' ہیرا بن جاتا ہے۔"

(چراغ تلے ص ۱۴ تا ۱۵)

ایک اور جگہ طنز نگار جب توازن کھو دیتا ہے تو اس کے فن کی جو حالت ہوتی ہے اسے ایک تشبیہ کے ذریعہ یوں نمایاں کیا ہے:

"انسان واحد جانور ہے جسے خلاق عالم نے اپنے حال پر رونے کے لیے غدود گریہ بخشے ہیں۔ کثرت استعمال سے یہ بڑھ جائیں تو حساس طنز نگار دنیا سے یوں خفا ہو جاتے ہیں جیسے اگلے وقتوں میں آقا نمک حرام لونڈیوں سے روٹھ جاتے تھے۔ لغزش غیر پر انہیں ہنسی کے بجائے طیش آ جاتا ہے۔"

(خاکم بدہن ص ۸)

مزاح نگاری کے فن کی شریعت میں جو باتیں جائز نہیں ہیں۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لیکن مزاح نگار کے لیے نصیحت' فضیحت اور فہماش حرام ہیں۔ وہ اپنے تلخ حقائق کے درمیان ایک قد آدم دیوار قہقہہ کھڑا کر لیتا ہے۔ وہ اپنا روئے خنداں سورج مکھی پھول کی مانند ہمیشہ سرچشمہ نور کی جانب رکھتا ہے۔ اور جب اس کا سورج ڈوب جاتا ہے تو اپنا رخ اس سمت کر لیتا ہے۔ جدھر سے وہ پھر طلوع ہوگا۔"

(خاکم بدہن ص ۸)

ایک جگہ مزاح نگار کی خوبی کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"مزاح نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں اس طرح کہہ جاتا ہے کہ سننے والے کو بھی بہت بعد میں خبر ہوتی ہے۔ میں نے کبھی کسی پختہ کار مولوی یا مزاح نگار کو محض تقریر و تحریر کی پاداش میں جیل جاتے نہیں دیکھا۔ مزاح کی میٹھی مار بھی شوخ آنکھ' پرکا عورت اور دلیر کے وار کی طرح کبھی خالی نہیں جاتی:

نین چھپائے نا چھپیں' پٹ گھونگھٹ کی روٹ
چتر نار اور سورما کریں لاکھ میں چوٹ"

(زرگذشت ص ۱۳)

یوسفی گو مزاح کی کاری گری اور اثر کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کو یہ بھی پوری طرح معلوم ہے کہ مزاح کس حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے۔ وہ مزاح کی اثر اندازی کے حدود مقرر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اپنے وسیلہ اظہار......مزاح......کے باب میں میں کسی خوش گمانی میں مبتلا نہیں۔ قہقہوں سے قلعوں کی دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں۔ چٹنی اور اچار لاکھ چٹخارے دار سہی' لیکن ان سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔ نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے۔ ہاں' ریگستان کے شدائد کم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز' اندوہ و انبساط' کرب ولذت کی منزلوں سے بے نیازانہ گذر جانا بڑے حوصلے کی بات ہے۔

بار الم اٹھایا' رنگ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

(زرگذشت ۱۳)

ایک اور جگہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مزاح کو میں دفاعی میکے نزم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار نہیں' اس شخص کا زرہ بکتر ہے جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے پہن لیتا ہے۔ زین بدھ ازم میں ہنسی کو گیان کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اونچ نیچ کا سچا گیان اس سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کھمبے پر چڑھنے کے بعد کوئی نیچے سے سیڑھی ہٹا لے۔ مگر ایک کہاوت یہ بھی سنی کہ بندر پیٹر کی پھننگ پرے زمیق پر گر پڑے تب بھی بندر ہی رہتا ہے۔"

(اب گم ص ۲۳)

یوسفی نے مزاح نگاری کے آداب پر جس بصیرت افروز انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ وہ مزاح نگاری کے حدود کا تعین اور اس کے فنی رموز کو آگاہی بخشتے ہیں۔ یہ ایسے اصول وضوابط کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس کو اپنا کر کوئی بھی مزاح نگار منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے:

"یوں تو مزاح' مذہب اور الکحل ہر چیز میں بآسانی حل ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص اُردو ادب میں لیکن مزاح کے اپنے تقاضے' اپنے آداب ہیں۔ شرط یہ کہ

برہمی' بیزاری اور کدورت دل میں راہ نہ پائے ورنہ یہ مرنگ ملٹ کر خودشکاری کا
کام تمام کردیتا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ آگ بھی لگے اور کوئی انگلی نہ اٹھا سکے کہ یہ
دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے۔'' مزاح نگاری اس وقت تک تبسم زیرلب کا سنہرا
وار نہیں۔ جب تک اس نے دنیا اور اہل دنیا سے رچ کے پیار نہ کیا ہو۔ ان سے
ان کی بے مہری وکم نگاہی سے ان کی سرخوشی وہشیاری سے ان کی تردامنی اور تقدس
سے۔ ایک پیمبر کے دامن پر پڑنے والا ہاتھ گستاخ ضرور ہے۔ مگر مشتاق وآرزو
مند بھی ہے۔ یہ زلیخا کا ہاتھ ہے۔ خواب کو چھو کر دیکھنے والا ہاتھ''
''صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی۔''

(خاکم بدہن ص ۹)

یہ آشنائے فن کے وہ تنقیدی اصول ہیں جن کی وجہ سے اس کے فن میں ایسی جلا آئی ہے جو اس کے فن پارہ کو ہمیشہ تابندہ وتابناک رکھے گی۔ دراصل یوسفی نے طنز ومزاح کی جو تعریف کی ہے اور اس کے جو اصول و ضوابط مقرر کئے ہیں اور طنز ومزاح نگاری کی جن خصوصیات کو نمایاں کیا ہے۔ اس پر وہ خود عمل پیرا بھی رہے ہیں۔ ان کی تمام تصانیف میں انہی اصولوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اب تک ان کی چار تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

(1) ''چراغ تلے'' ۱۹۶۱ء یہ ان کی پہلی تصنیف ہے۔ بقول یوسفی یہ کھٹے میٹھے مضامین ہیں۔ اس کتاب کی خاص خوبی بقول کسی حکیم صاحب کہ ''مجھے برسوں سے قبض کی شکایت تھی چراغ تلے پڑھنے کے بعد جاتی رہی۔''

(2) خاکم بدہن ۱۹۶۹ء اس تعلق سے بھی کیا خوب کہا گیا۔ ''بڑی مفرح کتاب ہے۔ برسوں سے بلیڈ پیشر بڑھا ہوا تھا وہ خاکم بدہن کے استعمال سے معتدل ہوگیا۔

(3) زرگذشت ۱۹۸۹ء۔ بقول یوسفی سوانح نوعمری ہے۔ دراصل یہ آپ بیتی ہے لیکن یہ آپ بیتی ان کی بینک بیتی تک ہی محدود ہوکر رہ گئی۔ اسی لئے انہوں نے اس کا عنوان ''زرگذشت'' رکھا ہے۔ دوران ملازمت کے بعض واقعات' تجربات' مشاہدات اور تاثرات کو افسانوی رنگ دے کر اس طرح پیش کیا ہے کہ خود مشکل سے نظر آتے ہیں۔ اسی لئے کہا ہے کہ

''ان واقعات' مشاہدات اور تاثرات کا تعلق میرے بینکنگ کیریئر کے
ان ابتدائی چھ سات برسوں سے ہے جب اس پیشے کا بھرم قائم تھا۔ البتہ
انشورنس ایجنٹوں سے لوگ چھپتے پھرتے تھے۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا کہ انشورنس
ایجنٹ تک بینکروں سے منہ چھپانے لگے۔

پھرتے ہیں سود خوار کوئی پوچھتا نہیں۔

نامہ اعمال میں چند تبدیلیاں بوجوہ ناگزیر تھیں۔ اس میں پردہ نشینوں کے علاوہ کچھ کرسی نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ چنانچہ باستثنائے مسٹر اینڈرسن نام ومقام بدل دیئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں واقعات وابواب میں تقدیم وتاخیر نظر آئے گی۔ چند کردار بھی عمداً گڈمڈ کردیئے ہیں۔ اور خوف فساد خلق سے سیاہ و سفید کو سفید وسیاہ کردیا ہے۔ اس کے باوجود اگر کہیں کسی شخصیت یا حقیقت سے مماثلت پائی جائے تو اسے ''فکشن'' کا سقم تصور کیا جائے۔ یہ ایک نوآموز بیکار کی آشفتہ بیانی ہے۔ کسی مقتول کا بیان نزعی نہیں جس کے اختتام پر اسے مرنے کی اجازت اور ملزم کو پھانسی دے دی جائے۔

کچھ خواب ہے' کچھ اصل' کچھ طرز ادا ہے۔''

(زر گذشت ص ۱۱)

(4) آب گم (۱۹۹۰ء)...... یہ کتاب بھی یوسفی کی دیگر تصانیف سے الگ ومختلف ہے۔ چراغ تلے' خاکم بدہن اور زرگذشت میں یوسفی جس طرح زندگی اور کاروبار زندگی کے بارے میں مشتاق نظر آتے ہیں وہ کیفیت یہاں گم ہوگئی ہے۔ ان کتابوں میں انہیں یوسفی کی جگہ ''مشتاق'' بھی کہا جاسکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک خاص عمر کے بعد یہ اشتیاق کی کیفیت باقی نہیں رہتی۔ وہ اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' تاہم آپ اس کتاب کا موضوع' مزاج اور ذائقہ مختلف پائیں گے موضوع اور تجربہ خود اپنا پیرایہ اور لہجہ متین کرتے چلے جاتے ہیں۔''

(آب گم ص ۲۱)

آب گم میں یوسفی نے کرداروں کا کمال دکھایا ہے۔ اس میں روزمرہ زندگی کے عام کرداروں کی چلتی پھرتی' ہنستی اور بولتی تصویریں ملتی ہے۔ جن کا نفسیاتی تجزیہ بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ دراصل انہوں نے ایک نیا تجربہ کیا کہ زندگی کے عام مشاہدات اور واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''آب گم'' کے پانچ کہانی نما خاکوں میں آپ جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے' اس کا ان دوستوں کے واقعات زندگی یا ان کے احباب' بزرگوں اور لواحقین سے قطعاً کوئی تعلق یا مماثلت نہیں ہے۔ مودبانہ گزارش ہے کہ فکشن کو فکشن ہی سمجھ کر پڑھا جائے۔ اگر کوئی واقعہ سچ یا کردار ''اصل'' نظر آئے۔ تو اسے محض سوءاتفاق تصور

فرمائیے۔تمام تر واقعات و کردار فرضی ہیں۔البتہ جن مشاہیر کا ذکر جہاں کہیں
''بہ بدی'' یا بر بنائے تنقیص آیا'' ہے اُسے جھوٹ نہ سمجھا جائے۔ اتنا ضرور ہے
کہ میں نے حتی الامکان منور حسین اور میاں احسان الٰہی کے مخصوص پیرایۂ بیان
اور اندازِ گفتگو کی لٹک ...... اور کہیں کہیں آپس کی نوک جھوک کے دوران شرار
جستہ و فقرہ برجستہ...... کو جوں کی توں برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔''

(آب گم ص ۱۳ تا ۱۴)

دوستانہ گفتگو کی روداد میں مختلف کرداروں کو شامل کر کے ایک کہانی بنائی ہے۔ یہ کہانی بنی ہے یا نہیں یہ الگ بحث ہے گو ان کو یہ اصرار کہ یہ ''افسانوی ادب'' ہے گو انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے۔ ''پلاٹ'' کے فقدان کی وجہ سے شاید اس کو افسانوی ادب میں شمار نہ کیا جائے۔ اس لئے انہوں نے دنیا کے بعض عظیم ادیبوں کے حوالے دیئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر تھوڑا سا بھی پڑھا لکھا ہو تو وہ ان کے وسیع مطالعے کے رعب میں آجاتا ہے۔ کیونکہ وہ دنیا بھر کے عظیم ادیبوں کے ناموں اور کارناموں کو گنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اب معلوم نہیں ان کی اس کتاب کا شمار افسانوی ادب میں ہو سکتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں کوئی پلاٹ ہے نہ ہی کوئی افسانوی سانچا ملتا ہے۔ پلاٹ کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''میں نے پہلے کسی اور ضمن میں عرض کیا ہے کہ پلاٹ کو فلموں،
ڈراموں، ناولوں اور سازشوں میں ہوتا ہے۔ ہمیں تو روزمرہ کی
زندگی میں دور دور تک اس کا نشان نہیں ملتا۔''

(آب گم ص ۲۴)

وہ جزئیات نگاری کو ہی افسانوی ادب سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ افسانوی سانچے میں ڈھلی ہوں یا نہ ڈھلی ہوں:

''وہی جزئیات نگاری اور باریک بینی تو اس میں فی نفسہ کوئی عیب نہیں
اور نہ خوبی۔ جزئیات نگاری اگر خوردہ گیری پر مبنی نہیں سچی اور جاندار ہیں تو اپنی
کہانی اپنی زبانی کہتی چلی جاتی ہیں۔ انہیں توڑ مروڑ کر افسانوی سانچے میں
ڈھالنے یا کسی آدرش سانچے میں کسنے کی ضرورت نہیں۔'' (آب گم ص ۲۴)

بہر حال ان عالمانہ بحث میں پڑے بغیر بھی اس کتاب سے محظوظ ہوا جا سکتا ہے اور معلوم نہیں خود یوسفی نے یہ بحث کیوں چھیڑی۔ یہ کتاب افسانوی ادب کا حصہ بنے تو بھی ان کے ادبی مقام میں فرق آنے والا نہیں تھا اور نہ بنے تب بھی جیسا کہ خود انہوں نے لکھا ہے:

''ایک چینی دانا کا قول ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بلی سیاہ ہے یا

سفید۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ چوہے پکڑ سکتی ہے یا نہیں۔''

(آب گم ص ۱۴)

یوسفی باتوں باتوں میں بڑے پتے کی بات یوں کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو بعض وقت یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس میں کیسی اور کتنی پتے کی باتیں کہی گئی ہیں۔ مذکورہ بالا جملوں میں مزاح نگاری کے بنیادی مقصد کو انہوں نے کس مہارت اور فنکاری سے نمایاں کردیا ہے۔ حقیقت ہو یا افسانہ مزاح نگاری کا مقصد تو مزاح پیدا کرنا ہے اور اس میں جب وہ کامیاب ہوجاتا ہے تو حقیقت نگاری بھی افسانہ نگاری بن جاتی ہے اور افسانہ نگاری بھی حقیقت نگاری۔

ان کے مزاحیہ مضامین کی تخلیق چند بے تکلف دوستانہ محفلوں کی گفتگو کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ گفتگو اعلیٰ معیار کی گفتگو ہے۔ جو مزاح کا لبادہ اوڑھے اس قدر آگے بڑھتی جاتی ہے کہ باتوں باتوں میں حقیقت کا پردا چاک ہوتا جاتا ہے۔ یوسفی کبھی اپنے مخلص دوست مرزا عبدالودود بیگ سے تو کبھی شاہد احمد دہلوی سے تو کبھی پروفیسر عبدالقدوس سے تو کبھی کسی سے بہر حال کسی نہ کسی سے محوئے گفتگو نظر آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں دو یا دو سے زیادہ افراد موجود ہوتے ہیں۔ کبھی اپنے بیتے ہوئے واقعات تو کبھی دوسروں کے بیتے ہوئے واقعات، تو کبھی اپنے تاثرات تو کبھی دوسروں کے۔ کبھی اپنے انداز بیان سے تو کبھی دوسروں کے انداز بیان سے ہنستے اور ہنساتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اعلیٰ ذہانت اور بلند تخیل کبھی مکالموں کے انداز میں تو کبھی بحث و مباحث میں تو کبھی سوال و جواب کی صورت میں تو کبھی لطائف کی شکل میں مزاح کا لبادہ اوڑھے ہمارے سامنے رونق افروز ہوتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوسکے گا۔ دوران ملازم بینک افسر مسٹر اینڈرسن سے گفتگو کا انداز ملاحظہ فرمائیے:

تمہاری پاس D.J ہے؟ مسٹر اینڈرسن نے پوچھا

''یہ کیا ہوتی ہے؟''

''ڈنر جیکٹ۔ بلیک ٹائی۔''

''وہی جس کا کالر سیاہ سائن کا ہوتا ہے اور پتلون پر بینڈ بجانے والوں کی لسی ریشمی پٹی لگی ہوتی ہے۔؟''

''سلوا تو لو۔ بینک سے ڈسمس ہونے کے بعد بینک کی انتظامیہ کی طرف سے بینڈ بجانے پر کوئی پابندی نہیں۔ تم نے سنا ہوگا' ڈنر جیکٹ پہن کر تو بینکر کی بھی اشرافوں کی سی صورت نکل آتی ہے۔؟

''سر! میں نے ڈنر جیکٹ پہن کر کہاں جاؤں گا؟

اُردو میں مثل ہے کہ جنگل میں مورنا چا کس نے دیکھا۔''

(زرگزشت ص ۲۲۱)

مکالموں کا استعمال یوسفی کے مزاحیہ فن کو ایک خاص انفرادیت عطا کرتا ہے۔ اُردو کے کسی بھی مزاح

نگار نے اس طرح مکالموں کے ذریعہ اپنے فن کے اثر کو دوبالا نہیں کیا ہے۔ مکالموں کی وجہ سے یوسفی کے مزاحیہ فن میں جو ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔'' کاغذی ہے پیرہن'' مضمون تمام کا تمام مکالموں کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی مضامین جیسا کہ ''پڑیئے گر بیمار'' کا یہ مکالمہ ملاحظہ فرمائیے:

ملاقاتی :ماشاءاللہ! آج منہ پر بڑی رونق ہے۔

مریض :جی ہاں! آج شیو نہیں کیا۔

ملاقاتی :آواز میں کرارا پن ہے۔

مریض کی بیوی: ڈاکٹر نے صبح سے ساگودانہ بھی بند کر دیا'' (چراغ تلے ص ۳۱)

بعض وقت وہ مکالمے کو سوال و جواب کے انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے ان کا مضمون '' کافی'' میں سوال و جواب یوں ملتے ہیں۔

''میں نے سوال کیا۔ آپ کافی کیوں پیتے ہیں؟
انہوں نے جواب دیا۔ آپ کیوں نہیں پیتے؟
مجھے اس میں سگار کی سی بو آتی ہے۔
اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی سوندھی خوشبو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوت شامہ کی کوتاہی ہے۔''

(چراغ تلے ص ۳۷)

ایک جگہ عشق اور شادی سے متعلق سوال و جواب کے انداز میں گفتگو عجیب لطف دیتی ہے۔ ہر سوال جاندار اور ساتھ میں جواب اس قدر برمحل اور غیر متوقع کہ تبسم زیر لب کا حق دار بن جاتا ہے ملاحظہ فرمائیے:

''خاں صاحب! آپ نے کبھی عشق بھی کیا؟''
''آپ کی مراد لونڈے سے ہے یا زنخے سے؟
''وہ خود استہزائی پر اتر آئے۔''
''آپ کو کبھی کوئی عورت اچھی لگی''؟

''میں نے کوئی جوان عورت بدصورت نہیں دیکھی مگر آپ بھی تو اپنے پتے دکھائیے۔ کبھی کسی کو تختہ عشق بنایا؟ شادی والدین کی پسند سے کی یا......؟

کس کے والدین؟
''میرا مطلب ہے۔ شادی والدین نے طے کی یا اپنی پسند سے کی۔؟''

''میں نے اپنی بیوی کی پسند کی شادی کی۔
رکوع میں چلے گئے۔ اپنی شادی تو اس طرح ہوئی جیسے لوگوں کی موت واقع ہوتی ہے۔ اچانک۔ بغیر مرضی کے۔''

(زرگزشت ص ۱۳۶)

مکالموں کے ذریعے وہ اپنی بات جس درجے پر لطف انداز میں کہہ جاتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ان ہی باتوں کو اگر بغیر مکالموں کے لکھا جائے تو تحریر کا سارا لطف اور مزہ ختم ہو جاتا ہے۔ دیکھئے یہاں بھی مکالموں کے ذریعے انہوں نے اپنے مزاح کا جادو جگایا ہے جو لطیفہ کی شکل میں نمودار ہوا ہے:

''مشرقی افریقہ کے (ایک انگریز افسر کی) کافی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پر تکلف دعوت کی۔ جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظر حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب پوچھی، حبشی نے جواب دیا کہ بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں پھر اس میں کافی ملا کر دم کرتا ہوں۔''

''لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو۔ بہت مہین چھنی ہوتی ہے'' حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔''

کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی موزے استعمال کرتے ہو؟ آقا نے غضب ناک ہو کر پوچھا' خانساماں سہم گیا۔ نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔''

لطیفہ کے ذریعہ مزاح پیدا کرنے کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔

''مرزا۔ تمہارے ہوٹل ہذا میں اور کون سامن وسلویٰ اترتا ہے۔؟ بولا حرام گوشت کے علاوہ دنیا بھر کی ڈیشس ملتی ہے جو چاہیں آرڈر کریں' جناب! آلو مٹر' آلو گوبھی' آلو میتھی' آلو گوش' آلو مچھی' آلو بریانی اور خدا تمہارا بھلا کرے۔ آلو کوفتہ' آلو بڑیاں' آلو سموسہ' آلو کارائتہ' آلو کا بھرتا' آلو کیا۔ ہم نے روک کر پوچھا اور سویٹ ڈیش؟ بولا۔ آلو کی کھیر' ہم نے کہا بھلے آدمی! تم نے تو آلو کا پہاڑہ سنا دیا۔ تمہارے ہوٹل میں کوئی ایسی ڈیش بھی ہے۔ جس میں آلو کا نام نہ آئے۔

فاتحانہ تبسم کے ساتھ فرمایا۔ کیوں نہیں!

پوئے ٹولکٹ! حاضر کروں جناب۔

(خاکم بدہن ص ۶۸۔۶۹)

یوسفی کی مزاح نگاری کی خاص خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے نثر میں تلمیحی انداز کو اختیار کیا۔ اس انداز کی وجہ سے معنویت میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور مزاح نگاریوں دریا کو کوزہ میں بند کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چند جملوں میں بڑے سے بڑے تاریخی واقعہ کو سمیٹ لیتے ہیں۔ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کی پوری تاریخ چند جملوں میں یوں سما گئی ملاحظہ فرمائیے:

''بولے آپ تجارت کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں۔ انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ترازو تھی۔''

اسی طرح موجودہ زمانے کے حالات کو وہ اس خوبی سے چند جملوں میں یوں بیان کر دیتے ہیں کہ معاشی اور سیاسی حالات بھی سامنے آجاتے ہیں اور ان پر گہرا طنز بھی ہو جاتا ہے:

''سنا ہے کہ چائے کے بڑے خوبصورت باغ ہوتے ہیں یہ بات یوں بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں میں پیدا ہوتی تو ایشیائی ممالک میں اتنی افراط سے نہیں ملتی بلکہ غلہ کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔''

اس اقتباس کو بھی ملاحظہ فرمائیے کہ انہوں نے کس طرح تاریخ عالم میں چین کی انفرادیت کو نمایاں کیا ہے:

''سنا ہے بعض روادار افریقی قبائل کھانے کے معاملہ میں جانور اور انسان کے گوشت کو مساوی درجہ دیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، ہم نے ان کے بارے میں کوئی بری بات نہیں سنی مگر ہم چینیوں کی رچی ہوئی حس شامہ کی داد دیتے ہیں کہ نہ منگول حکمرانوں کا جبر و تشدد انہیں پنیر کھانے پر مجبور کر سکا اور نہ امریکہ انہیں کافی پینے پر آمادہ کر سکا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان کی نفاست نے سخت قحط کے زمانے میں بھی فاقے اور اپنے فلسفے کو پنیر اور کافی پر ترجیح دی۔''

(چراغ تلے ص ۴۶)

اودھ کی سلطنت کے زوال کی تاریخ ان جملوں میں اسیر ہے۔

''پھر ایک دن شام کے کھانے پر مرزا نے ناک سکیٹر کر کہا۔ میاں! کیا کھیر میں کھٹملوں کا بگھار دیا ہے؟ سفید دیوار پر کوئلے سے سودے کا حساب لکھتے ہوئے حقارت سے بولے۔'' آپ کو معلوم نہیں؟

شاہان اودھ لگی ہوئی فیرنی کھاتے تھے؟

مگر تم نے دیکھا کیا انجام ہوا۔ اودھ کی سلطنت کا۔"

(چراغ تلے ۹۶)

یوسفی بڑے بڑے عالمی سیاسی امور پر بھی اپنے شگفتہ انداز میں یوں روشنی ڈالتے ہیں کہ اس صورت حال کا ایک بالکل نیا پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جیسے مختلف گول میز کانفرنسوں نے بین الاقوامی سیاست کو جس طرح متاثر کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں جو مسائل پیش ہوئے ہیں۔ یوسفی اس کی جانب بلیغ انداز میں اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غور کیجئے تو مباحثے اور مناظرے کے لئے چارپائی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ فریقین آمنے سامنے نہیں بلکہ عموماً اپنے حریف کی پیٹھ کا سہارا لے کر آرام سے بیٹھتے ہیں اور بحث و تکرار کے لئے اس سے بہتر طرز نشست ممکن نہیں۔ کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ فریقین کو ایک دوسرے کی صورت نظر نہ آئے تو کبھی آپ سے باہر نہیں ہوتے اسی بنا پر میرا عرصے سے یہ خیال ہے کہ اگر بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوئے ہوتے تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔"

(چراغ تلے ص ۱۶)

پاکستان میں ایک زمانے میں وزیراعظم جس تیزی سے بدلتے تھے اور جس کی بناء پر ایک آئی اے ایس افسر کے انٹرویو میں اس سوال کے جواب میں کہ اب کون وزیراعظم ہے۔ امیدوار نے جواب دیا تھا۔ رات میں تو محمد علی وزیراعظم تھے۔ معلوم نہیں صبح کون ہو گئے ہیں کیونکہ صبح کا اخبار ابھی تک میں نے نہیں دیکھا ہے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"اب سے چند مہینے پہلے تک بعض گرم و سرد چشیدہ سیاست داں خرابی موسم کو آئے دن کے وزارتی ردوبدل کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کراچی کا موسم بھی انگریز ہی کی ایک چال ہے۔ لیکن موسم گزیدہ عوام کو یقین ہو چلا تھا کہ درحقیقت وزارتی ردوبدل کے سبب یہاں کا موسم خراب ہو گیا ہے۔"

(۱۵۷ چراغ تلے)

انگریزوں نے دنیا کے بڑے حصے کو فتح کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے کہا جاتا تھا کہ ان کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا ہے۔ اس تاریخی واقعہ کی طرف وہ مزاحیہ انداز میں یوں اشارہ کرتے ہیں:

"کراچی کے باشندوں کو غیر ملکی سیر و سیاحت پر اُکسانے میں آب و ہوا کو بڑا دخل ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انگلستان کا موسم اگر اتنا

ظالم نہ ہوتا تو انگریز دوسرے ملکوں کو فتح کرنے کو ہرگز نہ نکلتے۔''

(چراغ تلے ۱۶۰)

موجودہ زمانہ میں میڈیکل سائنس اتنی ترقی کرتی جارہی ہے کہ روز ایک نیا مرض دریافت ہوتا جارہا ہے۔ چونکہ یہ مرض لادوا ہوتا ہے اسی سے موت واقع ہوتی ہے۔ اس طرح میڈیکل سائنس کی ترقی کو یوں بیان کیا ہے:

''پھر بھی آخر ہوا کیا۔؟ پا بہ رکاب مرد بزرگ نے اپنا سوال دہرایا بھلے چنگے تھے۔ اچانک ایک ہچکی آئی اور جاں بحق ہوگئے''
دوسرے بزرگ نے انگوٹھے سے ایک فرضی آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔
''سنا ہے چالیس برس سے مرض الموت میں بمتلا تھے۔'' ایک صاحب نے سوکھے سے منہ سے کہا۔ کیا مطلب؟
چالیس برس سے کھانسی میں بمتلا تھے۔ اور آخر اسی میں انتقال فرمایا۔
صاحب! جنتی تھے کہ کسی اجنبی مرض میں نہیں مرے۔ ورنہ اب تو میڈیکل سائنس کی ترقی کا یہ حال ہے کہ روز ایک نیا مرض ایجاد ہوتا ہے۔

(خاکم بدہن ص ۱۲۵)

یوسفی کو انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ ہے۔ انسانی نفسیات کو اس طرح واضح کرتے ہیں کہ انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر یہی انبساط اور مسکراہٹ قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ میرٹھ کے نزدیک کامیاب مزاح وہی ہے جو فکر بھی پیدا کرے۔ وہ لکھتا ہے:

''کامیاب ظرافت وہ ہے جو ہنسائے لیکن ساتھ ہی فکر کو بیدار بھی کرے''۔

حقائق کا پردافاش کرنے میں ان کے جملے کلیدی حصہ ادا کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کا ہر جملہ بے مثل اور بے ساختہ ہوتا ہے۔ دراصل یوسفی جملے بازی اور زبان و بیان کے بازیگر ہیں۔ ان کے جملوں میں جو معنویت ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ موقع ومحل کی مناسبت سے موزوں بات کہہ جاتے ہیں۔ ان کے صرف ایک جملہ میں اتنی گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے کہ غزل کا شعر معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر مزاحیہ جملے ان کے مخصوص سیاق و سباق میں مزہ دیتے ہیں۔ لیکن یوسفی کے مزاحیہ فن کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ ان کے منفرد جملے بذات خود

مزاح کی تمام تر رعنائیوں سے مملو ہوتے ہیں۔ اور ان میں اصلاحی کیفیت بھی موجود ہوتی ہے۔ یہاں چند جملے پیش کئے جاتے ہیں جو چٹکلوں کی ساری کیفیت رکھتے ہیں۔ جو لوگ صرف زبان چلاتے ہیں۔ ان کی حالت زار کی تصویر یوں سامنے آجاتی ہے:

''انھوں نے زندگی بھر زبان کے علاوہ کسی دوسرے عضو کو تکلیف نہیں دی تھی''۔

(خاکم بدہن ص ۹۴)

آدمی ایک دفعہ پروفیسر بن جاتا ہے تو زندگی بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے۔ اس بات سے فائدہ اٹھا کر جو مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا جواب نہیں لیکن اس کے ساتھ پروفیسر صاحبان کے ان سارے لطیفوں کا خیال کیجئے اور اس جملہ کی بلاغت سے محظوظ ہوئیے۔

''بقول مرزا آدمی ایک دفعہ پروفیسر بن جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے۔ خواہ بعد میں وہ سمجھداری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔''

(خاکم بدہن ۹۳)

ایک ایسا شخص جو ہنسنا نہیں جانتا اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ جانتا ہے اس کو ''جہل مرکب'' کہا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی اصلاح تمام عمر نہیں ہوسکتی۔ اس حقیقت کو یوسفی نے حد درجہ خوبصورت انداز میں یوں پیش کیا ہے:

''اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہنسنا اور کھانا آتا ہے۔ اسی وجہ سے پچھلے سو برس سے یہ فن ترقی نہ کر سکا۔''

(چراغ تلے ص ۸۹)

ایک جگہ اسی حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ بعض اشخاص کی صورت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ جسے دیکھ کر دوسرے شخص کو طرح طرح کے برتاؤ کا خیال آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''یوں تو ان کی صورت ہی ایسی ہے کہ ہر کس و ناکس کو بے اختیار نصیحت کرنے کو جی چاہتا ہے''۔

اور چند منفرد جملے ملاحظہ فرمائیے:

- ☆ غرض مند صرف آئینہ کو منہ چڑا سکتا ہے۔
- ☆ یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی' کانسی کی لٹیا' بالی عمریا اور چگی داڑھی ہی میں دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیراؤ اتنی ہی چمکتی ہے۔
- ☆ داغ دار لکڑی میں نے آج تک نہیں بیچی۔ داغ تو صرف دو چیزوں پر سجتا ہے دل اور جوانی۔
- ☆ جس بات کو کہنے والے اور سننے والے دونوں ہی جھوٹ سمجھیں اس کا گناہ نہیں ہوتا۔

☆ سوڈے اور خنجر کی بوتل کی صرف بدہضمی اور ہندو مسلم فساد میں استعمال کی جاتی ہے۔

☆ وہ صرف رمضان میں ہاتھاپائی کرتا ہے۔اس واسطے کہ روزے میں گالی دینا منع ہے۔

☆ تاریخ شاید ہے کہ آج تک کسی موٹی عورت کی وجہ سے جنگ نہیں ہوئی' جدید سائنس نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ دماغ کے علاوہ جسم کا ہر حصہ حسب منشا گھٹایا بڑھایا جاسکتا ہے۔

☆ انہوں نے اپنی ذات ہی کو انجمن خیال کیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مستقل اپنی ہی صحبت نے ان کو خراب کردیا۔

☆ بیمار کو مشورہ دینا ہر تندرست آدمی اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فیصدی لوگ ایک دوسرے کو مشورہ کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں۔

☆ اس کا کیا علاج کہ انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔

☆ الحمدللہ! میں منافق' ریاکار نہیں۔میں نے گناہ کو گناہ سمجھ کر کیا۔

ان کے بعض جملے اقوال زریں کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے

☆ بلی چوہے پکڑ سکتی ہے یا نہیں۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ سیاہ ہے یا سفید

☆ میں دماغی صحت کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے۔

☆ آپ تجارت اور عبادت تو کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں۔لیکن تاش صرف اشرافوں کے ساتھ کھیلنے جائیں۔(کرکٹ)

☆ خیر مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں۔مگر عورتیں اس لحاظ سے قابل ستائش ہیں کہ انہیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

☆ زندگی کے نشیب و فراز' اندوہ و انبساط' کرب و لذت کی منزلوں سے بے نیاز گذر جانا بڑے حوصلے کی بات ہے۔

☆ ایسے ارباب ذوق کی کمی نہیں' جنہیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔

یوسفی بعض جملوں میں اتنی اور ایسی بلاغت سے کام لیتے ہیں کہ اس کی توضیح اور تشریح کی جائے تو دفتر بن جائے۔جیسے ہندوستان میں عورتوں کی حالت زار پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔اس پورے دفتر کو وہ یوں چند جملوں میں بیان کردیتے ہیں۔

> "اب اس وضعدار طبقے کے افراد باورچی کو نوکر رکھنے کے بجائے نکاح ثانی کر لیتے ہیں۔اس لئے کہ گیا گذرا باورچی بھی روٹی' کپڑا اور تنخواہ مانگتا ہے جبکہ منکوحہ فقط روٹی' کپڑے پر ہی راضی ہوجاتی ہے۔بلکہ اکثر و بیشتر کھانے اور پکانے کے برتن بھی ساتھ لاتی ہے۔"

(چراغ تلے ص ۹۰)

قدیم اور جدید تعلیم کے فرق کو جس لطف کے ساتھ وہ بیان کرتے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے:

''ہم بذات خود سوفی صد تفریح کے حق میں ہیں۔ خواہ وہ تفریح برائے تعلیم ہو خواہ تعلیم براہ تفریح ہم تو محض یہ امر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اگر چہ قدیم طریق تعلیم سے جدید طرز تفریح ہزار درجہ بہتر ہے۔
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ''

(چراغ تلے ص ۱۳۱)

تفریح کرنے میں ہم غیر شعوری طور پر جس اصول پر کار فرما ہوتے ہیں۔ اس کو یوسفی یوں واشگاف کرتے ہیں:

''تفریح میں بری صحبت سے پرہیز لازم ہے۔ یاد رکھیئے آپ تجارت اور عبادت تو کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں لیکن تاش صرف اشرافوں کے ساتھ کھیلنا چاہئے۔ یہی نہیں یوروپ میں بھی اس فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ وہاں بڑے سے بڑے اسٹاک ایکسچینج اور گرجا میں ہر کس و ناکس کو بے روک ٹوک جانے کی اجازت ہے مگر کلب اور کینور قمار خانہ میں فقط خاندانی شرفاء بار پاتے ہیں۔''

(چراغ تلے ص ۱۳۴)

قول محال Paradox سے مزاح پیدا کرنے میں یوسفی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مزاح پیدا کرنے کا ایک خاص انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ آخر میں اچانک ایک بالکل غیر متوقع بات سامنے آجائے اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں کتے کو نیند کی گولی دی جا رہی تھی۔ پہلے ایک دی گئی بعد میں دو لیکن اثر نہیں ہوا۔ وہ بھونکتا ہی رہتا تھا۔ تیسری رات بجائے کتے کو تین گولیاں دینے کے خود مالک وہ گولیاں کھا کر سو رہتا ہے۔ اور اس رات کتا بالکل نہیں بھونکتا۔ یہ اچانک پن پر لطف ہوتا ہے۔ اس طرح سے مزاح پیدا کرنے میں یوسفی خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

قاضی عبدالقدوس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا کہ بڑا کتا بڑی مشکل سے سدھارا جاتا ہے۔ پھر نیا گھر۔ نئے چہرے 'نئی بوباس' نتیجہ یہ کہ پہلی رات خود سویا نہ دوسروں کو سونے دیا۔ رات بھر ایک سانس میں منہ زبانی بھونکتا ہی رہا۔ دوسری رات بھی وحشت کا یہی عالم رہا۔ البتہ چوبیس گھنٹے کی تربیت سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ فجر کے وقت جن اراکین خاندان کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ان کے منہ چاٹ چاٹ کر خواب غفلت سے بیدار کیا۔ تیرے رتجگے سے پہلے ہم نے اسے ایک سونے کی گولی دی۔ کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ چوتھی رات دو دیں۔ مگر صاحب کیا مجال جو ذرا چپکا ہو جائے۔ زچ ہو کر مرزا سے رجوع کیا۔ تو کہنے

لگے میری مانو آج اسے کچھ نہ دو خود تین گولیاں کھالو۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اس
رات وہ بالکل نہیں بھونکا۔''

(خاکم بدہن ص ۴۷ تا ۴۸)

وہ بعض وقت ایک جملے میں جو بات کہہ جاتے ہیں دوسرے جملے میں اس کو مکمل طور پر رد کر دیتے ہیں۔ اس سے جملے میں جو غیر متوقع بات سامنے آتی ہے وہ عجیب لطف پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

''صبح تک سب کو پیچش ہوگئی صرف ہمیں نہیں ہوئی۔ اور ہمیں اس لئے
نہیں ہوئی کہ ہم پہلے ہی سے اس میں مبتلا تھے۔''

یوسفی اکثر جگہ بڑی ہنرمندی سے لطیف مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مزاح کی خاص خوبی سنجیدگی اور شائستگی ہے۔ وہ ایک طرح کا کلائمکس پیدا کرتے ہیں۔ قاری ایک طرح کی سنجیدگی سے رفتہ رفتہ آگے بڑھتا ہے اور یکا یک تبسم زیرلب تک پہنچ جاتا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ تھی کہ مرزا چائے کہ ساتھ آلو کے ''چپس'' اڑا رہے
تھے۔ ہم نے کہا' مرزا تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ بولے (اور ایسی آواز میں
بولے گویا کسی اندھے کنویں کے پیندے سے بول رہے ہیں) ڈاکٹر کہتے ہیں
کہ تمہارا وزن بہت کم ہے۔ تمہیں آلو اور ایسی چیزیں خوب کھانی چاہئے۔ جن
میں اسٹارچ اور کاربوہائی ڈریٹ کی افراط ہو۔ صاحب! آلو ایک نعمت ہے۔
کم از کم سائنس کی رو سے! ہم نے کہا تو پھر دباب آلو کھا کر ہی صحت یاب
ہو جاؤ۔ اس لئے کہ یہ نرسس اس قدر بدصورت ہیں کہ کوئی جو اپنے منہ پہ
آنکھیں رکھتا ہے۔ یہاں زیادہ عرصہ پڑا نہیں رہ سکتا۔

(خاکم بدہن ص ۴۳ تا ۴۷)

یوسفی کی مزاح نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ تشبیہات سے کام لیتے ہیں۔ شبلی نے کلام میں نادر تشبیہ کی شمولیت کو شاعری کہا ہے۔ یوسفی کی ندرتِ خیال نے نثر میں نادر تشبہات کا استعمال کیا ہے اور یہ تشبیہات سماجی' سیاسی اور اخلاقی بے اعتدالیوں کو بڑی خوبی سے عیاں کرتی ہیں۔ ان کے پاس بڑی ہی نادر اور انوکھی تشبیہیں ملتی ہیں۔ جس کا برجستہ استعمال ان کے مزاحیہ اسلوب کی خاص خوبی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یقین جانو تیزن ایک نمبر اشراف عورت تھی۔ ایسی ویسی نہیں۔ بیاہی
تاہی تھی۔ پڑوس میں رہتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے جوانی اور پڑوس کے گھر
میں ایک ساتھ ہی قدم رکھا۔ عمر میں مجھ سے بیس نہیں تو پندرہ برس ضرور بڑی

ہوگی۔ پر بدن جیسے کسی کسائی ڈھولک۔ ہوا بھی چھو جائے تو بجنے لگے۔''

ایک جگہ فرسودہ موٹر کے بارے میں لکھتے ہیں:

اب وہ اسٹارٹ ہونے اور چلنے میں ایسی غیر ضروری اور بے محل پھرتی اور نمائش چینی دکھانے لگی۔ جیسے ریٹارڈ لوگ ملازمت میں توسیع سے پہلے یا بعض بوڑھے دوسری شادی کے بعد دکھائی دیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''ساری گفتگو اور بحث مباحثہ مچھر دانیوں کے اندر بیٹھے بیٹھے ہوئے البتہ کسی کو دوران تقریر جوش آجاتا تو وہ مچھر دانی اس طرح ہٹاتا جیسے دولہا نکاح کے بعد سہرا الٹ دیتا ہے۔''

یوسفی کو تشبیہات اختراع کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ کیسی اچھوتی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

☆ کمال کے استاد تھے ان کی بات دل میں ایسی اترتی تھی جیسے باؤلی میں سیڑھیاں

☆ موسم ایسا جیسے کسی کے دل میں بغض بھرا ہوا۔

یوسفی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی جزئیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اسی لئے ایسی تشبیہات استعمال کرتے ہیں جو ان سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کی تھیں۔ اسی بناء پر ان کی تحریر میں محاکات کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں تیز تیز پیدل چل کے آیا تھا۔ پسینے میں شرابور ململ کا کرتا پیاز کی جھلی کی طرح چپک گیا''۔

یوسفی کی تصانیف کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں بلکہ ان کی معلومات عامہ اور ادبیات کا مطالعہ وسیع ہے۔ خاص پر فارسی' اُردو اور انگریزی کا بڑی وسعت اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی تاریخ اور سیاست پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے مطالعہ کی یہ وسعت ان کی تحریر کا سرۂ امتیاز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک قاری کا مطالعہ بھی گہرا اور وسیع نہ ہو یوسفی کی تحریر سے مکمل طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا چونکہ وہ اپنی بات کی وضاحت یا اس میں شدت پیدا کرنے کے لئے کسی نہ کسی شاعر' ادیب اور مفکر کا حوالہ یا قول اس برجستگی اور روانی سے دیتے ہیں کہ جب تک قاری بھی ان کا ہم رکاب نہ ہو وہ اس جملے کی معنویت کو پا نہیں سکتا۔ وہ جس لطف اور مزے سے قومی اور بین قومی واقعات اور حادثات کا حوالہ دیتے ہیں وہ بھی ان کی مزاح نگاری کی ممتاز صفت بنتی ہے۔ امریکن تہذیب اور کافی دونوں بین قومی حیثیت حاصل کر چکے ہیں لیکن دونوں میں جو رشتہ ہے اس کی وضاحت وہ

اس طرح کرتے ہیں:

''کافی امریکہ کا قومی مشروف ہے اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلایا کافی کلچر کے زور سے رائج ہوئی۔ یہ بعینہ ایسا سوال ہے جیسے کوئی بے ادب یہ پوچھ بیٹھے کہ غبار خاطر چائے کی وجہ سے مقبول ہوئی یا چائے غبار خاطر کے باعث۔''

(ص ۴۵)

جب تک قارئین ادباوشعراء کی شخصیت' ان کی علمی و ادبی اور فن کارانہ صلاحیت' ان کے اسلوب نگارش کی خصوصیت سے کماحقہ واقف نہ ہوں ان کے مزاح سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے ابوالکلام کی شخصیت و سیرت اوران کے اسلوب بیان سے واقف ہوئے بغیر وہ یوسفی کے اس پر لطف جملوں سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

''فرمایا۔ ان کی نثر کا مطالعہ ایسا ہے جیسے دلدل میں تیرنا اسی لئے مولوی عبدالحق اعلانیہ انہیں اُردو کا دشمن کہتے ہیں۔ علم و دانش اپنی جگہ' مگر اس کو کیا کیجئے کہ وہ اپنی انا اور اُردو پر آخر دم تک قابو نہ پا سکے۔ کبھی کبھار رمضان میں ان کا ترجمان القرآن پڑھتا ہوں تو نعوذ باللہ محسوس ہوتا ہے گویا کلام اللہ کے پردے میں ابوالکلام بول رہا ہے۔''

ایک اور جگہ مولانا کی نثر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد تو نثر کا آرائشی فریم صرف اپنے پسندیدہ فارسی اشعار ٹانگنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اشعار بے محل نہیں ہوتے' ملحقہ نثر بے محل ہوتی ہے۔''

(آب گم ص ۶۳)

جیسا کہ کہا جا چکا ہے یوسفی کے مزاح سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے ادبی پس منظر سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر

''مثال کے طور پر شیخ سعدی کے متعلق یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ کبھی بچہ رہے ہوں گے۔ حالی جوان ہونے سے پیشتر بڑھا گئے۔ مہدی افادی جذباتی اعتبار سے ادھیڑ پیدا ہوئے اور ادھیڑ مرے۔ شبلی عمر طبعی کے خلاف جہاد کر کے ثابت کر دیا کہ عشق عطیہ قدرت ہے پیر و جواں کی قید نہیں۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی اور اختر شیرانی جب تک جیے دائمی

جوانی میں مبتلا رہے اور آخر اسی میں انتقال کیا۔ اس سے اختر شیرانی کی تنقیص
یا آغا کی مذمت مقصود نہیں کہ میرے کانوں میں آج بھی آغا کے وہ الفاظ گونج
رہے ہیں جو انہوں نے ٹیگور پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہے تھے۔ ''برا مانو یا بھلا
لیکن جوان مولوی اور بوڑھے شاعر پر اپنا دل تو نہیں ٹھکتا۔ کیا سمجھے؟''

(خاکم بدہن ص ۵۹)

مزاح کے لئے اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے تب ہی وہ تیز نشتر برسانے کے بجائے طنز میں بھی نرمی برتا ہے۔ وہ غصہ، نفرت، جھنجھلاہٹ اور کدورت کے بجائے محبت، خلوص اور ہمدردی سے کام لیتا ہے اسی لئے یوسفی کی اعلیٰ ظرفی طنز میں اتنی لطافت اور حلاوت پیدا کرتی ہے کہ کدورت، تلخی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ طنز کو بالکلیہ مزاح بنا دینا بڑا مشکل فن ہے۔ بہت کم مزاح نگار اس کٹھن مرحلہ سے صحیح وسلامت گذر سکتے ہیں۔ یہ ایک پل صراط ہے جہاں ذراسی لغزش تحت الثریٰ پہنچا دیتی ہے۔ یوسفی نے ڈاکٹروں اور یونانی طبیبوں پر جس طرح طنز سے کام لیا ہے ملاحظہ فرمایئے:

''لیکن ہم کسی صورت خانساماں کو بالاقساط روح قبض کرنے کا اختیار نہیں
دینا چاہتے کہ یہ صرف حکیم ڈاکٹروں کا حق ہے۔''

''بغیر ڈاکٹر کی مدد کے آدمی مر بھی نہیں سکتا''

''فرضی بیماریوں کے لئے یونانی دوائیں تیر بہدف ہوتی ہیں۔''

ایک اور جگہ طنز ملاحظہ فرمایئے:

''مہذب دنیا پر امریکہ کے دو احسان ہیں۔ تمبا کو اور آلو سو تمبا کو کا بیڑا تو
سرطان نے غرق کر دیا۔ مگر آلو کا مستقبل نہایت شاندار ہے جو ملک جتنا غربت
زدہ ہوگا اتنا ہی اس میں آلو اور مذہب کا چلن زیادہ ہوگا۔''

امریکہ کی دریافت نے دنیا کو آلو، تمبا کو اور ٹماٹر کا تحفہ دیا۔ تمبا کو صحت کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔ لیکن آلو میں ابھی تک کوئی خرابی ثابت نہیں ہوئی۔ لیکن آخر میں ہلکا سا طنز ہے کہ غریب ممالک میں جب اور کچھ نہیں ملتا تو آلو پر اکتفاء کرتے ہیں۔ مذہب کا چلن، اس لئے زیادہ ہوتا ہے کہ غریب خدا پر تکیہ کرتا ہے اور ہر مصیبت کو بڑی خاموشی سے قسمت کے نام قبول کر لیتا ہے۔

اعلیٰ مزاح وہ ہوتا ہے جس میں مزاح نگار اپنے آپ کو مزاح کا نشانہ بناتا ہے۔ یوسفی کے پاس ہم کو یہ خوبی بھی ملتی ہے۔ وہ خود جس طرح ہدف مزاح بنے ہیں۔ اس کی تفصیل خود ان کی زبانی سنئے:

''چارپائی کی سب سے خطرناک قسم وہ ہے جس کے بچے کھچے اور ٹوٹے
بانوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے محض اپنی قوت ایمان کے زور سے اٹکے

رہتے ہیں۔ اس قسم کے جھلکنے کو بچے بطور جھولا اور بڑے بوڑھے تزکیہ نفس کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اونچے گھرانوں میں اب ایسی چارپائیوں کو غریب رشتہ داروں کی طرح کونوں کھدروں میں اڑے وقت کے لئے چھپا کر رکھا جاتا ہے خود مجھے مرزا عبدالودود بیگ کے ہاں ایک رات ایسی ہی چارپائی پر گذارنے کا تفاق ہوا۔ جس پر لیٹتے ہی اچھا بھلا آدمی نون غنہ بن جاتا ہے۔

اس میں داخل ہو کر میں اپنے اعمال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دوسری منزل پر کوئی اور سواری نہ آجائے میں نے سر سے دری پھینک کر اٹھنے کی کوشش کی تو گھٹنے بڑھ کر پیشانی کی بلائیں لینے لگے کھڑ بڑ کی آواز سن کر مرزا خود آئے اور چیخ کر پوچھنے لگے بھائی آپ ہیں کہاں میں نے مختصراً اپنے محل وقوع سے آگاہ کیا تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچا اور میرے ساتھ ہی بلکہ مجھ سے کچھ پہلے چارپائی بھی کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگے کیا بات ہے۔ آپ کچھ بے قرار سے ہیں۔ معدے کا فعل درست معلوم نہیں ہوتا۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ دوڑ کر اپنا تیار کردہ چورن لے آئے اور اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں ڈالا قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں انہوں نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔‘‘

مزاح کی ایک قسم تحریف نگاری بھی ہے۔ موجودہ دور میں اس کا چلن کچھ زیادہ ہی ہے۔ اور یوسفی نے اس کا استعمال بھی کیا ہے۔ تحریف نگاری کا مقصد تفریح پیدا کرنا یا پھر کسی سنجیدہ مقصد کو پورا کرنا یعنی بے اعتدالیوں کو روکنا اور اصلاح کرنا ہوتا ہے۔ اصل میں عمدہ تحریف نگاری میں یہ دونوں مقاصد پوشیدہ ہوتے ہیں۔ تحریف نگاری عموماً تین طریقوں سے کی جاتی ہے۔ ایک تو لفظی یعنی الفاظ کے ردوبدل سے اور دوسرے طرز ادا اور تیسری قسم موضوعاتی ہوتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے تینوں طریقوں سے تحریف نگاری کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی چاروں تصانیف میں تحریف نگاری ملتی ہے۔ اور یہ نفس مضمون کا حصہ ہے اور اسی سے عبارت میں رنگینی اور چمک پیدا ہوتی ہے۔

تحریف نگاری کا فن ذہانت وفراست کا فن ہے۔ یوسفی عبارت میں شامل اشعار و مصرعوں، محاوروں، ضرب الامثال، الفاظ کی ردوبدل یا الٹ پھیر سے مزاحیہ رنگ بھرتے ہیں۔ اور اس کا استعمال بے باکی اور برجستگی سے کرتے ہیں کہ مزاح کی صورت نکل آتی ہے۔ بعض الفاظ اپنی اصل شکل اور معنی میں جلوہ گر نہیں ہوتے بلکہ ذرا سی تبدیلی سے مضحک بن جاتے ہیں اور پھر کمال یہ کہ نفس مضمون سے اسقدر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔ جس سے جدت فکر، ندرت بیان اور مخصوص اسلوب خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ ان سے یوسفی کی زبان دانی اور زبان کے تخلیقی استعمال کا بھی

اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

☆ پھرتے ہیں سودخوار کوئی پوچھتا نہیں

☆ نہ کوئی خندہ رہا اور نہ کوئی خندہ نواز

☆ کیا فدوی کیا فدوی کا شوربہ۔ پہنچی وہیں پہ نان جہاں کا خمیر تھا۔

☆ یار زندہ فضیحت باقی۔

☆ ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام...... ایک عقد ناگہانی اور ہے۔

☆ ہزاروں خواہش ایسی کہ ہر خواہش پہ گھر بگڑے۔

☆ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لا چلے گا گھسیارہ

☆ اب کو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ گھر جائیں گے

اس طرح تحریفات سے مزاح پیدا کرنا یوسفی کی طرز خاص ہے۔

مزاح میں آسانی کے ساتھ عریانی جگہ پاتی ہے۔ بعض مزاح نگاروں کے ہاں عریانی، فحش کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اُردو میں مزاح پیدا کرنے کے لئے ان حربوں سے کام لیا جاتا ہے اور لیا گیا ہے۔ لیکن جو مزاح نگار حد درجہ شائستہ ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی مزاح نگاری کی اثر پذیری کو بڑھانے کے لیے عریانی کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ غالب ہوں یا رشید احمد صدیقی یا پطرس بخاری ان کے ہاں ایک جملہ بھی ایسا نہیں ملے گا۔ جس میں عریانی ہو۔ یوسفی بھی عام طور پر اس معیار کو قائم رکھتے ہیں لیکن بعض جگہ انہوں نے اس سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کبھی بھی عریانی کو فحش کے دائرہ میں داخل نہیں ہونے دیا۔ ان کی عریانی میں کبھی بھی سوقیانہ پن یا عامیانہ انداز نہیں ہوتا۔ بعض جگہ وہ ''مشتاق'' ہونے کے باوجود اپنی ''یوسفی'' کو قائم رکھتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''خدا جانے حکومت کو آلو بزور قانون غذا بنانے سے کیوں ڈراتی ہے۔ سستا اتنا کہ آج تک کسی سیٹھ کو اس میں ملاوٹ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ اسکینڈل کی طرح لذیذ اور زود ہضم! وٹامن سے بھرپور، خوش ذائقہ، صوفیانہ رنگ، چھلکا زنانہ لباس کی طرح یعنی برائے نام صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو''۔

یوسفی ہی کے الفاظ میں ان کی ''عریاں تصویروں سے فن کارانہ ضبط'' ملتا ہے۔ عنوان شباب کی ایک تصویر یوں کھینچی ہے:

> ''اب اس روغنی تصویر ہی کو لیجئے۔ جسم کے پیچ وخم واقعی ایسے ہیں کہ اگر یہ لڑکی موسلا دھار بارش میں کھڑی ہو جائے تو کیا مجال کے پیروں پر ایک چھینٹا بھی پڑ جائے''۔

ایسی باتوں کے ذکر میں بھی کوئی لفظ ایسا استعمال نہیں کرتے جو ثقہ نہ ہو۔اس کے باوجود اپنی بات خواہ وہ کتنی ہی کثیف کیوں نہ ہو بڑی لطافت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ چوکیداری کے لئے چنداں بری نہ تھی کہ اپنی عزت وابرو کے علاوہ ہر چیز کی بخوبی حفاظت کر سکتی تھی۔''

اسی طرح جہاں بھی انہوں نے ایسی کوئی بات کہی ہے اسے پر لطف اور لطیف انداز میں بیان کر دیا ہے۔ جیسا کہ

''مرزا ہی کے مشورے سے اتنی اصلاح کرنی پڑی کہ صرف انگریزوں کے جہازوں کو لوٹیں گے۔مگر ان کی میموں کے ساتھ بدسلوکی نہیں کریں گے' نکاح کریں گے۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں

''جواب ملا سنگل روم۔پچیس روپے یومیہ۔ڈبل روم میاں بیوی کیلئے پچھتر روپے۔سب سناٹے میں آ گئے۔ذرا اوسان درست ہوئے تو مرزا نے سوکھے منہ سے پوچھا''

کیا اپنی ذاتی بیوی کے ساتھ بھی پچھتر روپے ہوں گے۔

(چراغ تلے ۲۶۱)

غرض مشتاق احمد یوسفی کا نگارخانہ مزاح ایک ایسا شیش محل ہے جہاں اُردو مزاح کی قوس قزح اپنی ساری رنگینیوں اور نیرنگیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔رنگ و نور کے ایسے خوبصورت اور مزاحیہ پیکر مشکل ہی سے کہیں اور نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر میمونہ مسعود

☆☆☆

پہلا پتھر

مقدمہ نگاری کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی پڑھا لکھا ہو۔ اسی لیے بڑے بڑے مصنف بھاری رقمیں دے کر اپنی کتابوں پر پروفیسروں اور پولیس سے مقدمے لکھواتے اور چلواتے ہیں۔ اور حسب منشا بدنامی کے ساتھ بری ہوتے ہیں۔ فاضل مقدمہ نگار کا ایک پیغمبرانہ فرض یہ بھی ہے کہ وہ دلائل و نظائر سے ثابت کردے کہ اس کتاب مستطاب کے طلوع ہونے سے قبل' ادب کا نقشہ مسدسِ حالی کے عرب جیسا تھا:

"ادب" جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا

اس میں شک نہیں کہ کوئی کتاب بغیر مقدمہ کے شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل نہیں کرسکتی بلکہ بعض معرکتہ الآرا کتابیں تو سراسر مقدمے ہی کی چاٹ میں لکھی گئی ہیں۔ برنارڈ شا کے ڈرامے (جو درحقیقت اس کے مقدموں کے ضمیمے ہیں' اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اور دُور کیوں جائیں۔ خود ہمارے ہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جو محض آخر میں دُعا مانگنے کے لالچ میں نہ صرف یہ کہ پوری نماز پڑھ لیتے ہیں بلکہ عبادت میں خشوع و خضوع اور گلے میں رُندھی رُندھی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اپنی مالی مشکلات کو حاضر و ناظر جانتے ہیں۔ لیکن چند کتابیں ایسی بھی ہیں جو مقدمہ کو جنم دے کر خود دم توڑ دیتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنری' جس کا صرف مقدمہ باقی رہ گیا ہے۔ اور کچھ ایسے مصنف بھی گزرے ہیں جو مقدمہ لکھ کر قلم توڑ دیتے ہیں۔ اور اصل کتاب کی ہوا تک نہیں دیتے...... جیسے شعر و شاعری پر مولانا حالی کا بھرپور مقدمہ جس کے بعد کسی کو شعر و شاعری کی تاب و تمنا ہی نہ رہی۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ' اس کتاب میں سے مقدمہ نکال دیا جائے تو صرف سرورق باقی رہ جاتا ہے۔

تاہم اپنا مقدمہ بقلم خود لکھنا کارِ ثواب ہے کہ اِس طرح دوسرے جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ آدمی کتاب پڑھ کر قلم اٹھاتا ہے۔ ورنہ ہمارے نقاد عام طور سے کسی تحریر کو اس وقت تک غور سے نہیں پڑھتے جب تک انہیں اس پر سرقہ کا شبہ نہ ہو۔

پھر اس بہانے اپنے متعلق چند ایسے نجی سوالات کا دنداں شکن جواب دیا جاسکتا ہے جو ہمارے ہاں صرف چالان اور چہلم کے موقع پر پوچھے جاتے ہیں مثلاً:

کیا تاریخ پیدائش وہی ہے جو میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں درج ہے؟ حلیہ کیا ہے؟ مرحوم نے اپنے ''بینک بیلنس'' کے لیے کتنی بیویاں چھوڑی ہیں؟ بزرگ افغانستان کے راستے سے شجرۂ نسب میں کب داخل ہوئے؟ نیز موصوف اپنے خاندان سے شرماتے ہیں یا خاندان ان سے شرماتا ہے؟ راوی نے کہیں آزاد کی طرح جوشِ عقیدت میں ممدوح کے جدامجد کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اُسترا چھین کر تلوار تو نہیں تھمادی؟

چنانچہ اس موقع سے جائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنا مختصر سا خاکہ پیش کرتا ہوں:۔

نام: سرورق پر ملاحظہ فرمائیے۔

خاندان: سو پشت سے پیشہ آبا' سپہ گری کے علاوہ سب کچھ رہا ہے۔

تاریخ پیدائش: عمر کی اس منزل پر آپہنچا ہوں کہ اگر کوئی سن ولادت پوچھ بیٹھے تو اسے فون نمبر بتا کر باتوں میں لگا لیتا ہوں۔

اور یہ منزل بھی عجیب ہے۔ بقول صاحب ''کشکول'' ایک وقت تھا کہ ہمارا تعارف بہو بیٹی قسم کی خواتین سے اس طرح کرایا جاتا تھا کہ فلاں کے بیٹے ہیں۔ فلاں کے بھانجے ہیں۔ اور اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ فلاں کے باپ ہیں اور فلاں کے ماموں! اور ابھی کیا کیا ہے۔ عمر رسیدہ پیش روزبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ اس کے آگے مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں۔

پیشہ: گوکہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں اوّل آیا' لیکن اسکول میں حساب سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔

اور حساب میں فیل ہونے کو ایک عرصے تک اپنے مسلمان ہونے کی آسمانی دلیل سمجھتا رہا۔

اب وہی ذریعہ معاش ہے! حساب کتاب میں اصولاً دو اور دو چار کا قائل ہوں' مگر تاجروں کی دل سے عزت کرتا ہوں کہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے دو اور دو کو پانچ کر لیتے ہیں۔

پہچان: قد: پانچ فٹ ساڑھے چھ انچ (جوتے پہن کر)

وزن: اوور کوٹ پہن کر بھی دُبلا دکھائی دیتا ہوں۔ عرصے سے مثالی صحت رکھتا ہوں ...... اس لحاظ سے کہ جب لوگوں کو کراچی کی آب و ہوا کو برا ثابت کرنا مقصود ہو تو تمام حجت کے لیے میری مثال دیتے ہیں۔

جسامت: یوں سانس روک لوں تو ۳۸ انچ کا بنیان بھی پہن سکتا ہوں۔ بڑے لڑکے کے جوتے کا نمبر ۷ ہے جو میرے بھی فٹ آتا ہے۔

حلیہ: اپنے آپ پر پڑا ہوں۔

پیشانی اور سر کی حد فاصل اڑ چکی ہے۔ لہٰذا منہ دھوتے وقت یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ ناک میں بذاتہ قطعی کوئی نقص نہیں ہے۔ مگر بعض دوستوں کا خیال ہے کہ بہت چھوٹے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔

پسند: غالب، ہاکس بے، بھنڈی۔

پھولوں میں، رنگ کے لحاظ سے، سفید گلاب اور خوشبوؤں میں نئے کرنسی نوٹ کی خوشبو بہت مرغوب ہے۔ میرا خیال ہے کہ سبز سبز تازہ تازہ اور کرارے کرنسی نوٹوں کا عطر نکال کر ملازمت پیشہ حضرات اُن کی بیویوں کو مہینے کی آخری تاریخوں میں سنگھایا جائے تو گرہستی زندگی جنت کا نمونہ بن جائے۔

پالتو جانوروں میں کتوں سے پیار ہے۔ پہلا کتا چوکیداری کے لیے پالا تھا۔ اُسے کوئی چرا کر لے گیا۔ اب محض بر بنائے وضع داری پالتا ہوں کہ انسان کتے کا بہترین رفیق ہے۔

بعض تنگ نظر اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان کتوں سے بلاوجہ چڑتے ہیں حالانکہ اس کی ایک نہایت معقول اور منطقی وجہ موجود ہے...... مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہے ہیں۔ اور وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔

گانے سے بھی عشق ہے۔ اسی وجہ سے ریڈیو نہیں سنتا۔

چڑ: جذباتی مرد، غیر جذباتی عورتیں، مٹھاس، شطرنج۔

مشاغل: فوٹو گرافی، لکھنا پڑھنا۔

تصانیف: چند تصویر بتاں، چند مضامین و خطوط۔

کیوں لکھتا ہوں: ڈرزیلی نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ جب میرا جی عمدہ تحریر پڑھنے کو چاہتا ہے تو ایک کتاب لکھ ڈالتا ہوں۔ رہا یہ سوال کہ یہ کھٹِ مٹھے مضامین طنزیہ ہیں یا مزاحیہ یا اس سے بھی ایک قدم آگے...... یعنی صرف مضامین، تو یہاں صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ وار ذرا اوچھا پڑے، یا بس ایک روایتی آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ مزاح

ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

اور جہاں یہ صورت ہو تو خام فن کار کے لیے طنز ایک مقدس جھنجلاہٹ کا اظہار بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ لکھنے والا جو سماجی اور معاشی ناہمواریوں کو دیکھتے ہی دماغی باؤلے میں مبتلا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، خود کو طنز نگار کہنے اور کہلانے کا سزاوار سمجھتا ہے۔ لیکن سادہ و پرکار طنز ہے بڑی جان جوکھوں کا کام۔ بڑے بڑوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں۔ اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسے پر اترا اترا کر کرتب نہیں دکھاتے بلکہ

رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر

اور اگر ژاں پال سارتر کی مانند "دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک" ہو تو جنم جنم کی یہ جھنجلاہٹ آخر کار ہر بڑی چیز کو چھوٹی کر دکھانے کا ہنر بن جاتی ہے۔ لیکن یہی زہر غم جب رگ و پے میں سرایت کر کے لہو کو کچھ اور تیز و تند و توانا کر دے تو نس نس سے مزاح کے شرارے پھوٹنے لگتے ہیں۔ عمل مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔ لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ۔ لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا' ہیرا بن جاتا ہے۔

مجھے احساس ہے کہ اس ننھے سے چراغ سے نہ کوئی الاؤ بھڑک سکا اور نہ کوئی چتا دہکی۔

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اپنی چاک دامنی پر جب اور جہاں ہنسنے کو جی چاہا ہنس دیا۔ اور اب اگر آپ کو بھی اس ہنسی میں شامل کر لیا تو اس کو اپنی خوش قسمتی تصور کروں گا۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ہنسنے سے سفید بال کالے ہو جاتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ پھر وہ اتنے برے نہیں معلوم ہوتے۔ بالفعل' اس سے بھی غرض نہیں کہ اس خندۂ مکرر سے میرے سوا کسی اور کی اصلاح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ ہنسنے کی آزادی فی نفسہ تقریر کی آزادی سے کہیں زیادہ مقدم و مقدس ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو قوم اپنے آپ پر جی کھول کر ہنس سکتی ہے وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتی۔

یقین کیجئے' اس سے اپنے علاوہ کسی اور کی اصلاح و فہمائش مقصود ہو تو رُو سیاہ۔ کارلائل نے دوسروں کی اصلاح سے غلو رکھنے والوں کو بہت اچھی نصیحت کی تھی کہ "بڑا کام یہ ہے کہ آدمی اپنی ہی اصلاح کر لے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا سے کم از کم ایک بدمعاش تو کم ہوا۔" میری رائے میں (جو ضروری نہیں کہ ناقص ہی وہ) جس شخص کو پہلا پتھر پھینکتے وقت اپنا سر یاد نہیں رہتا' اسے دوسروں پر پتھر پھینکنے کا حق نہیں۔

مخدومی و مکرمی جناب شاہد احمد دہلوی کا تہہ دل سے سپاس گزار ہوں کو انہوں نے یہ مضامین' جو اس سے پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے تھے' پڑھوا کر بکمال توجہ سنے۔ اور نہ صرف اپنی گمبھیر چپ سے کمزور حصوں کی نشاندہی کی' بلکہ جو لطیفے بطورِ خاص پسند آئے اُن پر گھر جا کر بہ نظر حوصلہ افزائی ہنسے بھی۔ اگر اس کے باوجود وہ زبان و بیان کی لغزشوں سے پاک نہیں ہوئے (اشارہ مضامین کی طرف ہے) تو اس میں ان کا قصور نہیں۔ یوں بھی میں قبلہ شاہد احمد صاحب کی باوقار سنجیدگی کا اس درجہ احترام کرتا ہوں کہ جب وہ اپنا لطیفہ سنا چکتے ہیں تو احتراماً نہیں ہنستا۔ لیکن ایک دن یہ دیکھ کر کہ میرا ایک مضمون پڑھ کے "الٹی ہنسی" (جس میں' بقول اُن کے' آواز حلق سے باہر نکلنے کے بجائے اُلٹی اندر جاتی ہے) ہنس رہے ہیں' میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

پوچھا۔ "دلچسپ ہے؟"

فرمایا: "جی! تذکیر و تانیث پر ہنس رہا ہوں!"

پھر کہنے لگے: "حضرت! آپ پنگ پانگ کو مونث اور فٹ بال کو مذکر لکھتے ہیں!"

میں نے کھسیانے ہو کر جھٹ اپنی پنسل سے فٹ بال کو مونث اور پنگ پانگ کو مذکر بنادیا تو منہ پھیر پھیر کر "سیدھی" ہنسی ہنسنے لگے۔

دوستوں کا حساب گو دل میں ہوتا ہے، لیکن رسماً بھی اپنی اہلیہ ادریس فاطمہ کا شکریہ ضروری ہے کہ

"خطا" شناس من است و منم زباں دانش

ان مضامین میں جو غلطیاں آپ کو نظر نہیں آتیں۔ اور وہ جو اب بھی نظر آرہی ہیں، ان کا سہرا بالترتیب ان کے اور میرے سر ہے۔ اس سے پہلے وہ میرے مطبوعہ مضامین میں کتابت کی غلطیاں کچھ اس انداز سے نکالتی تھیں گویا لیتھو میں نے ہی ایجاد کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس کتاب کو آفسیٹ پر چھپوانے میں مکتبہ جدید کی ترغیب و تحریص سے زیادہ اُن کے طعن و تعریض کو دخل ہے۔

رخصت ہونے سے قبل مرزا عبدالودود بیگ کا تعارف کراتا جاؤں۔ یہ میرا ہمزاد ہے۔ دُعا ہے خدا اس کی عمر و اقبال میں ترقی دے۔

کراچی

مشتاق احمد یوسفی

☆☆☆

پیش لفظ: ان مضامین اور خاکوں کو پڑھ کر اگر کوئی صاحب نہ مسکرائیں تو ان کے حق میں یہ فال ٹھیک ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ وہ خود مزاح نگار ہیں۔

م۔ا۔ی

دستِ زلیخا

بابائے انگریزی ڈاکٹر سموئیل جانسن کا یہ قول دل کی سیاہی سے لکھنے کے لائق ہے کہ جو شخص روپے کے لالچ کے علاوہ کسی اور جذبے کے تحت کتاب لکھتا ہے' اُس سے بڑا احمق رُوئے زمین پر کوئی نہیں۔ ہمیں بھی اس کلیے سے حرف بہ حرف اتفاق ہے' بشرطیکہ کتاب سے مراد وہی ہے جو ہم سمجھے ہیں' یعنی چیک بک یا روکڑ بہی۔ دیباچے میں یہ وضاحت ازبس ضروری ہے کہ یہ کتاب کس مالی یا الہامی دباؤ سے نڈھال ہو کر لکھی گئی۔ چنانچہ جو اہلِ قلم ذہین ہیں' وہ مشک کی طرح خود بولتے ہیں۔ جو ذرا زیادہ ذہین ہیں' وہ اپنے کندھے پر دوسروں سے بندوق چلواتے ہیں۔ خود دیباچہ لکھنے میں وہی سہولت اور فائدے مضمر ہیں' جو خودکشی میں ہوتے ہیں۔ یعنی تاریخ وفات' آلۂ قتل اور موقع واردات کا انتخاب صاحب معاملہ خود کرتا ہے۔ اور تعزیراتِ پاکستان میں یہ واحد جرم ہے' جس کی سزا صرف اس صورت میں ملتی ہے کہ ملزم ارتکابِ جرم میں کامیاب نہ ہو۔ ۱۹۶۱ میں پہلی ناکام کوشش کے بعد بحمد اللہ ہمیں ایک بار پھر یہ سعادت بقلم خود نصیب ہو رہی ہے۔ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ۔

یہ کتاب ''چراغ تلے'' کے پورے آٹھ سال بعد شائع ہو رہی ہے۔ جن قدر دانوں کو ہماری پہلی کتاب میں تازگی' زندہ دلی اور جواں سالی کا عکس نظر آیا' ممکن ہے' ان کو دوسری میں کہولت کے آثار دکھلائی دیں۔ اس کی وجہ ہمیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی عمر میں آٹھ سال کا اضافہ ہو چکا ہے۔

انسان کو حیوان ظریف کہا گیا ہے۔ لیکن یہ حیوانوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ اس لیے کہ دیکھا جائے تو انسان واحد حیوان ہے جو مصیبت پڑنے سے پہلے مایوس ہو جاتا ہے۔ انسان واحد جاندار ہے جسے خلاقِ عالم نے اپنے حال پر رونے کے لیے غدود گریہ بخشے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے یہ بڑھ جائیں تو حساس طنز نگار دنیا سے یوں خفا ہو جاتے ہیں جسے اگلے وقتوں میں آقا نمک حرام لونڈیوں سے رُوٹھ جایا کرتے تھے۔ لغزشِ غیر پر انہیں ہنسی کے بجائے طیش آ جاتا ہے۔ ذہین لوگوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو احمقوں کا وجود سرے سے برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ لیکن جیسا کہ مارکوئس دی سید نے کہا تھا' وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بھی انسان احمق ہوتے ہیں۔ موصوف نے تو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ اگر تم واقعی کسی احمق کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے تو خود کو اپنے کمرے میں مقفل کر لو اور آئینہ توڑ کر پھینک دو۔

لیکن مزاح نگار کے لیے نصیحت‘ فصیحت اور فہمائش حرام ہے۔ وہ اپنے اور تلخ حقائق کے درمیان ایک قدم آدم دیوارِ قہقہہ کھڑی کر لیتا ہے۔ وہ اپنا روئے خنداں‘ سورج مکھی پھول کی مانند‘ ہمیشہ سرچشمہ نور کی جانب رکھتا ہے اور جب اس کا سورج ڈوب جاتا ہے تو اپنا رُخ اس سمت کر لیتا ہے‘ جدھر سے وہ پھر طلوع ہوگا:

همه آفتاب منیم‘ همه آفتاب گویم
نه شم‘ نه شب پرستم که حدیثِ خواب گویم

حس مزاح ہی دراصل انسان کی چھٹی حس ہے۔ یہ ہو تو انسان ہر مقام سے آسان گزر جاتا ہے۔

بے نشہ کس کو طاقتِ آشوبِ آگہی

یوں تو مزاح‘ مذہب اور الکحل ہر چیز میں بآسانی حل ہو جاتے ہیں‘ بالخصوص اُردو ادب میں۔ لیکن مزاح کے اپنے تقاضے‘ اپنے ادب آداب ہیں۔ شرط اول یہ کہ برہمی‘ بیزاری اور کدورت دل میں راہ نہ پائے۔ ورنہ یہ بومرنگ پلٹ کر خود شکاری کا کام تمام کر دیتا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ آگ بھی لگے اور کوئی اُنگلی نہ اُٹھا سکے کہ ”یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے؟“ مزاح نگار اُس وقت تک تبسم زیرلب کا سزاوار نہیں‘ جب تک اُس نے دنیا اور اہل دنیا سے رج کے☆ پیار نہ کیا ہو۔ اُن سے۔ اُن کی بے مہری و کم نگاہی سے۔ اُن کی سرخوشی و ہشیاری سے۔ اُن کی تردامنی اور تقدس سے۔ ایک پیمبر کے دامن پر پڑنے والا ہاتھ گستاخ ضرور ہے‘ مگر مشتاق و آرزومند بھی ہے۔ یہ زلیخا کا ہاتھ ہے۔ خواب کو چھو کر دیکھنے والا ہاتھ۔

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے اُن کے ہاتھوں کی

ایک صاحب طرز ادیب نے جو سخن فہم ہونے کے علاوہ ہمارے طرفدار بھی ہیں (تجھے ہم ولی سمجھتے نہ سود خوار ہوتا...... کی حد تک) ایک رسالے میں دبی زبان سے یہ شکوہ کیا کہ ہماری شوخی تحریر مسائل حاضرہ کے عکس اور سیاسی سوز و گداز سے عاری ہے۔ اپنی صفائی میں ہم مختصراً اتنا ہی عرض کریں گے کہ طعن و تشنیع سے اگر دوسروں کی اصلاح ہو جاتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مولنا رُومیؒ کہ رمز و کنایہ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں‘ ایک اندھیری رات کی بات سناتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جنگل بیابان میں ایک بچہ اپنی ماں سے چمٹ کر کہنے لگا کہ امی! اندھیرے میں مجھے ایک کالا دیو نظر آتا ہے اور مارے ڈر کے میری تو گھگی بندھ جاتی ہے۔ ماں نے جواب دیا‘ بیٹا! تو مرد بچہ ہے۔ خوف کو دل سے نکال دے۔ اب کی دفعہ جیسے ہی وہ دکھائی دے‘ آگے بڑھ کر حملہ کر دینا۔ وہیں پتا چل جائے گا کہ حقیقت ہے یا محض تیرا وہم۔ بچے نے پوچھا امی! اگر اس کالے دیو کی امی نے بھی اسے یہی نصیحت کر رکھی ہو تو......؟

☆ رَج کے (پنجابی): جی بھر کے۔

کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں؟

کچھ دن بعد وہ رسالہ کہ سرخیل دانشوراں تھا اور جس میں راقم الحروف کی سیاسی بے حسی و بے رغبتی کی تشخیص کی گئی تھی، نواب کالا باغ کے حکم سے بند کر دیا گیا۔ ہمارے قدر دان نے ایک پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ٹھیکیدار کے ہاں بحثیت پبلسٹی منیجر ملازمت کر لی۔ فقیر نے بھی یارانِ نامہرباں اور شہر بے اماں سے رخصت چاہی اور بوریا بدھنا سنبھال، داتا کی نگری کی راہ لی

اُو بصحرا رفت و مادر کوچہ ہا رُسوا شدیم

'پروفیسر' 'بارے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے' اور 'بائی فوکل کلب' اسی سفر شوق کی یادگار ہیں۔ پڑھنے والوں کو ان کا رنگ مختلف نظر آئے تو یہ زندہ دلان لاہور کا فیضان صحبت ہے۔

لوگ کیوں، کب اور کیسے ہنستے ہیں؟ جس دن ان سوالوں کا صحیح صحیح جواب معلوم ہو جائے گا انسان ہنسنا چھوڑ دے گا۔ رہا یہ سوال کہ کس پر ہنستے ہیں؟ تو اس کا انحصار حکومت کی تاب و رواداری پر ہے۔ انگریز صرف ان چیزوں پر ہنستے ہیں، جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں ...... پنچ کے لطیفے' موسم' عورت' تجریدی آرٹ۔ اس کے برعکس، ہم لوگ ان چیزوں پر ہنستے ہیں، جواب ہماری سمجھ میں آ گئی ہیں۔ مثلاً انگریز، عشقیہ شاعری' روپیہ کمانے کی ترکیبیں' بنیادی جمہوریت۔

فقیر کی گالی' عورت کے تھپڑ اور مسخرے کی بات سے آزردہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ قول فیصل ہمارا نہیں' مولنا عبید زاکانی کا ہے (از دشنام گدایاں و سیلی زنان و زبانِ شاعراں و مسخرگان مرنجید)۔ مزاح نگار اس لحاظ سے بھی فائدے میں رہتا ہے کہ اس کی فاش سے فاش غلطی کے بارے میں بھی پڑھنے والے کو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ممکن ہے' اس میں بھی تفنن کا کوئی لطیف پہلو پوشیدہ ہو' جو غالباً موسم کی خرابی کے سبب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس بنیادی حق سے دستبردار ہوئے بغیر یہ تسلیم کر لینے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ہم زبان اور قواعد کی پابندی کو تکلف زائد تصور نہیں کرتے۔ یہ اعتراف عجز اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ آج کل بعض اہل قلم بڑی کوشش اور کاوش سے غلط زبان لکھ رہے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار بے دھیانی یا محض آلکس میں صحیح زبان لکھ جائیں تو اور بات ہے بھول چوک کس سے نہیں ہوتی؟

محترم و مکرم جناب شان الحق صاحب حقی نے جس توجہ اور محبت سے اس مجموعے کے پانچ مضامین کا مطالعہ فرمایا اس کے لیے راقم الحروف ہمہ تن سپاس ہے۔ انہوں نے نہ صرف مفید مشوروں سے سرفراز فرمایا' بلکہ یہ کہہ کر مصنف کا دل بڑھایا کہ آپ کہیں کہیں گھسے پٹے محاورے استعمال کر جاتے ہیں' مگر آپ کا املا بے حد' اور 'ریجنل'' ہے۔ چنانچہ مبداء کو 'مبدء' پرواہ' کو 'پروا' اور 'وطیرہ' کو 'وتیرہ' لکھنا ہم نے انہیں سے سیکھا۔ اور یہ بھی انہیں سے معلوم ہوا کہ 'عطائی' اور 'طوطا' کا صحیح املا 'اتائی' اور 'توتا' ہے! جوش اصلاح میں ہم تو 'طوائف' کو بھی 'ت' سے لکھنے پر طیار تھے۔ مگر طوطے والی

بات دل کو نہیں لگی۔ اس لیے کہ 'توتے' کو اگر ط سے لکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ زیادہ ہرا معلوم ہوتا ہے بلکہ ط کا دائرہ ذرا ڈھنگ سے بنائیں تو چونچ بھی نظر آنے لگتی ہے۔

اور جھوٹ کیوں بولیں' طوائف الملوکی' کا صحیح مفہوم بھی حقی صاحب ہی نے بتایا' ورنہ ہم تو کچھ اور سمجھے بیٹھے تھے۔ عربی و فارسی میں بس اتنی شد بد ہے کہ میٹرک تک ہم 'ایضاً' کو کسی بسیار گو شاعر کا تخلص سمجھ کر ہر 'غزل ایضاً' پر اپنا خون کھولاتے رہے۔ یادش بخیر! راہ زن کے لغوی مرزا نے اُسی زمانے میں زن بازاری بتائے تھے! اور سچ تو یہ ہے کہ جب سے اس کے صحیح معنی معلوم ہوئے ہیں' غالب اور آتش کے مصرعوں ہو کر اسیر دا بتے ہیں راہ زن کے پانوں' اور ہزار رہ زن امیدوار راہ میں ہے' کا سارا لطف ہی جاتا رہا۔ اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے؟

از بسکہ حقی صاحب تحقیق کے مرد میداں ہیں' انہیں قدیم الفاظ و واقعات کے علاوہ کوئی اور بات مشکل سے یاد رہتی ہے۔ مثلاً وہ یہ فوراً بتا دیں گے کہ 'تئیں' کب متروک ہوا۔ 'اُستاذ' (غالب) کے کلام میں 'آئینہ' کتنی مرتبہ آیا ہے۔ 'ستم پیشہ ڈومنی' نے مغل بچہ کو کس سنہ میں داغ مفارقت دیا۔ 'اُستاذ' کے مکان کا پتا اور بقایا کرایہ کیا تھا۔ لیکن اپنے مکان کا نمبر بتانے کے لیے انہیں بیگم سے تبادلہ شکوک کرنا پڑتا ہے۔ وہ خود بھی اپنی غیر حاضر دماغی کے لطیفوں کو سکھوں کے سمجھ کر خوب محظوظ ہوتے ہیں۔ ایک دن THE ABSENT-MINDED PROFESSOR فلم کی پیشگی بکنگ کے 'کیو' میں ملاقات ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کیو' سے اس پر بحث کرتے ہوئے گتھم گتھا نکلے' بلکہ نکالے گئے کہ صحیح لفظ 'قمیض' ہے یا قمیص۔ مرزا سے رجوع کیا تو فرمایا' صحیح پہناوا بشرٹ ہے! باہر نکلے تو ہم نے اپنی کار کا دروازہ کھولا اور حقی صاحب شکریہ ادا کرتے ہوئے داخل ہوگئے۔ داخل ہی نہیں ہوئے بلکہ اسٹیرنگ وہیل سنبھال لیا۔ اپنے کوٹ کی اندرونی و بیرونی جیبوں کو کھنگالنے کے بعد ہاتھ کی اتفاقی رگڑ سے ہماری پتلون کی جیب کو بھی ٹٹول لیا۔ بالآخر اپنے/اپنی x قمیص/قمیض کی جیب سے ایک چابی برآمد کی۔ پورا زور لگانے کے باوجود یہ چابی نہ لگی تو فرمایا کہ اس ناہنجار ڈرائیور کو ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ کسی اور ورکشاپ میں سروس کرائے۔ جب بھی سروس ہوتی ہے ایک نئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم نے ہمت کر کے عرض کیا' قصور دراصل ہماری کار کے سوراخ کا ہے جو آپ کی چابی میں فٹ نہیں ہو رہا۔ چمک کر بولے' ہاں! قصور پر خوب یاد آیا۔ آپ نے ایک جگہ فوتیدگی لکھا ہے۔ یہ مارواڑیوں کی سی اُردو آپ نے کہاں سے سیکھی؟ عرض کیا' مارواڑ میں جہاں ہم پیدا ہوئے۔ ہمیں کار سے اُتار کر فٹ پاتھ پر گلے لگاتے ہوئے بولے' تو گویا اُردو آپ کی مادری زبان نہیں ہے! حالانکہ آپ کی اہلیہ تو اہل زبان ہیں!

خدا انہیں خوش رکھے کہ انہوں نے ہماری اُردو کی نوک پلک سنوارنے میں ہماری بیگم کا

ہاتھ بٹایا ہے۔

۲۶سی ۳۔ گلبرگ ۳۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء

مشتاق احمد یوسفی

مکرر آنکہ 'رسم دنیا' موقع اور دستور تو نہیں' لیکن مقطع میں کچھ ایسی سخن گسترانہ بات آپڑی ہے کہ جناب جمیل احمد قریشی خوشنویس کا قرض اُتارنا لازم ہوگیا۔ چار سال پہلے اس کتاب کی کتابت کے دوران انہوں نے حاشیہ پر پنسل سے جابجا اپنے ذاتی تاثرات سے خط شکستہ میں آگاہی بخشی (آخر میں تو اوچھے نشانوں پر اُتر آئے تھے :! ✓ X?!!) اور نقل کے ساتھ ساتھ کفر کی نشان دہی بھی کرتے رہتے مثلاً ایک مضمون میں ہم نے اپنے شکار کے سلسلے میں موضع ڈھلم بلگن کا خاکہ اڑایا تھا۔ انہوں نے مسودہ پر قلم پھیرتے ہوئے حاشیہ پر ارقام فرمایا "مگر یہ تو میرا آبائی گاؤں ہے"۔ اور اس کی جگہ ازخود ٹوبہ ٹیک سنگھ جڑدیا' جہاں غالباً اُن کا سسرال ہے۔ صفحہ ۲۰۷ پر ہم نے لکھا تھا کہ ایک کھیل (FARCE) میں شہنشاہ اکبر نے انارکلی کے رُخ زیبا پر اس انداز سے طمانچہ مارا کہ ہمیں تو دور سے یہی لگا کہ مہابلی پانچ منٹ تک انارکلی کا گال سہلاتے رہے جمیل صاحب نے طوعاً وکرہاً کتابت تو کردی لیکن "پانچ منٹ" کے گرد پنسل سے دائرہ کھینچ کر حاشیہ پر اسے نازیبا قرار دیا۔ اس اعتراض کے پیش نظر ہم نے پانچ منٹ کے بجائے دو منٹ کر دیا ہے۔

۱۹۶۵ کی کتابت میں کچھ حصے' کتابت کے لحاظ سے خاصے کمزور تھے۔ انہیں ہم نے نکال دیا۔ پھر جمیل صاحب نے چن چن کر وہ اوراق علاحدہ کیے جو اُن کے نزدیک' بلحاظ انشاپردازی' خاصے کمزور تھے۔ جب دونوں مرحلے بخیر وخوبی اختتام کو پہنچے تو پتا چلا کہ کتاب میں کچھ باقی نہیں رہا' سوائے دیباچہ کے او وہ بھی اس لیے کہ ابھی لکھا نہیں گیا تھا۔

چنانچہ جگر لخت لخت کو پھر جمع کیا۔ جون ۱۹۶۹ میں ساری کتاب کی دوسری مرتبہ بصرف کثیر کتابت شروع ہوئی ☆ جس کا عکس جمیل پیش خدمت ہے۔

جمیل صاحب نے حسب وعدہ چشم پوشی فرمائی۔ لیکن ہم نے بھی اس دفعہ مسودے اور آفسٹ سطر پر حاشیہ بالکل نہیں چھوڑا تھا۔

یوسفی

☆☆☆

عرض جمیل: مصنف کو اب بھی حواشی سے اختلاف ہے
تو بندہ تیسری دفعہ کتابت کرنے کے لیے تیار ہے۔

تزکِ یوسفی

ایک زمانے میں دستور تھا کہ امرا و رؤسا عمارت تعمیر کراتے تو اس کی نیو میں اپنی حیثیت و مرتبے کے مطابق کوئی قیمتی چیز رکھ دیا کرتے تھے۔ نواب واجد علی شاہ اپنی ایک منھ چڑھی بیگم، معشوق محل سے آزردہ ہوئے تو اس کی حویلی ڈھا کر ایک نئی عمارت تعمیر کرائی۔ معشوق محل ذات کی ڈومنی تھی۔ اس نسبت سے اس کی تذلیل وتضحیک کے لیے نیو میں طبلہ سارنگی رکھوا دیئے۔

میں نے اس کتاب کی بنیاد اپنی ذات پر رکھی ہے۔ جس سے ایک مدت سے آزردہ خاطر ہوں کہ

ع ''پیشہ سمجھے تھے جسے ہوگئی وہ ذات اپنی''

کم وبیش بیس سال پرانی یادوں اور باتوں کی یہ پہلی قسط ۱۹۷۲ میں مکمل ہوگئی تھی۔ یاد پڑتا ہے کہ اس کے دو باب دسمبر ۱۹۷۱ میں موم بتی کی روشنی میں ان راتوں میں لکھے گئے جب کراچی پر مسلسل بمباری ہورہی تھی اور راکٹوں اور اک اک گنز کے گولوں نے آسمان پر آتشیں جال سا بن رکھا تھا۔ ہماری تاریخ کا ایک خونچکاں باب رقم ہورہا تھا۔ ہجوم کار اور طبیعت کی بے لطفی نے تین سال تک نظر ثانی کی اجازت نہ دی۔ ستمبر ۱۹۷۵ میں جب معدے سے خون آنے لگا اور ڈیڑھ مہینے تک نقل و حرکت بستر کے حدود اربعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تو بارہ یکسو ہو کر زندگی کی نعمتوں کا شمار وشکر ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مسودے پر نظر ثانی کا مرحلہ بھی لیٹے لیٹے طے ہوگیا۔ اپنی تحریر میں کاٹ چھانٹ کرنے اور حشو وزوائد نکالنے کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی عمل ہے جیسے کوئی سرجن اپنا اپنڈکس آپ نکالنے کی کوشش کرے۔ چند سال ادھر کی بات ہے۔ راولپنڈی میں مخدومی کرنل محمد خاں سے ملاقات ہوئی۔ خلاف معمول کچھ نڈھال، تھکے تھکے سے نظر آئے۔ پوچھا ''نصیب دشمناں، طبیعت ناساز ہے؟'' فرمایا ''دن بھر دھڑتے نکالتا رہا ہوں۔'' پوچھا ''کیا مطلب؟'' فرمایا ''کتاب پر نظر ثانی کررہا ہوں۔ ایک کرم فرمانے دھڑلے شماری کرکے بتایا ہے کہ آپ نے یہ لفظ ۳۷ مرتبہ استعمال کیا ہے۔ صبح سے ۲۵ دھڑتے تو نکال چکا ہوں۔ بقیہ کو کان پکڑ کے نکالنے لگا تو رونے مچلنے لگے۔'' اس واقعہ کا ذکر اس لیے ضروری ہوگیا ہے کہ میں نے بھی انواع واقسام کے دھڑتے خود نکالے ہیں۔ لاکھ جی کڑا کیا۔ تاہم کچھ جڑیں، چند شاخیں، چند شگوفے کہ مرجھا چلے تھے اُمید بہار میں شجر انا سے پیوستہ رہ گئے۔

یہ سرگزشت ایک عام آدمی کی کہانی ہے، جس پر بحمد اللہ کسی بڑے آدمی کی پرچھائیں تک نہیں پڑی ...... ایک ایسے آدمی کے شب و روز کا احوال جو ہیرو تو کجا ANTI-HERO ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا۔ عام آدمی تو بیچارہ اتنی بھی سکت اور استطاعت نہیں رکھتا کہ اپنی زندگی کو مردم آزادی کے تین مسلمہ ادوار میں تقسیم کر سکے۔ یعنی جوانی میں فضیحت، ڈھلتی عمر میں نصیحت اور بڑھاپے میں وصیت۔ یہ طغیانِ شباب، لاف ہائے شاد کامی، معاصرانہ چشمکوں اور سیاست کی شوراشوری کی داستان نہیں۔ نہ کسی کی مہم جوئی اور کشور کشائی کا ''ساگا'' ہے۔ بایں ہمہ میں خود کو سکندرِ اعظم سے زیادہ خوش نصیب و کامراں سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ میں زندہ ہوں۔ میری ایک سانس کی بادشاہت ابھی باقی ہے۔ نہاں خانۂ دل کی ہیرو گیلری پر نگاہ کی تو کسی کی رمق تک اپنی ذات میں نظر نہ آئی ...... ہنری ہشتم، سیمول جانسن، گوتم بدھ، فالسٹاف، بابر، غالب، پک دک، بچے، امیر خسرو ...... ہاں ذہن پر ذرا زور ڈالا تو بعض مشاہیر کے جن چیدہ چیدہ اوصاف اور شباہتوں کا اپنی ذات میں جمگھٹا نظر آیا، کاش وہ نہ ہوتیں تو زندگی سنور جاتی۔ مثلاً نپولین کا قد، جولیس سیزر کا چٹیل سر، جینا لولو بریجنڈا کا وزن، سیمول جانسن کی بینائی، ناک بالکل قلوپطرہ کی مانند کہ اگر 1/12 انچ بھی چھوٹی ہوتی تو اُس دکھیا کا شمار بدصورتوں میں اور اپنا خوبصورتوں میں ہوتا۔ عمر وہی جو شیکسپیئر کی انتقال کے وقت تھی۔ غالب نے خود کو اس بناء پر آدھا مسلمان کہا تھا کہ شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا ہے فقیر سود کھاتا ہے۔ حرام شے نہیں پیتا کہ وہ وسیلہ معاش نہیں۔ حضرت موسیٰ کی اُمت نے آ سونے کے بچھڑے کی صرف پرستش ہی کی تھی۔ ہم تو اس سے افزائش نسل کا کام بھی لینے لگے ہیں۔ سود پر روپیہ چلانا انسان کا دوسرا قدیم ترین پیشہ ہے۔ اس کے بارے میں کم از کم اُردو میں ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ پہلے قدیم ترین پیشے کا حق تو مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا میں اور بعد ازاں سعادت حسن منٹو نے بکمال حسن و خوبی و خوباں ادا کر دیا بلکہ کہنا چاہیے کہ منٹو تو ساری عمر قلم برداشتہ ہی رہے۔

ان واقعات، مشاہدات اور تاثرات کا تعلق میرے بینکنگ کیریر کے ان ابتدائی چھ سات برسوں سے ہے جب اس پیشے کا بھرم قائم تھا۔ البتہ انشورنس ایجنٹوں سے لوگ چھپے پھرتے تھے۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا کہ انشورنس ایجنٹ تک بینکروں سے منھ چھپانے لگے:

پھرتے ہیں سود خوار کوئی پوچھتا نہیں

نامہ اعمال میں چند تبدیلیاں بوجوہ ناگزیر تھیں۔ اس میں پردہ نشینوں کے علاوہ کچھ کرسی نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ چنانچہ باستثنائے مسٹر اینڈرسن، نام و مقام بدل دیئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں واقعات و ابوب میں تقدیم و تاخیر نظر آئے گی۔ چند کردار بھی عمداً گڈ مڈ کر دیئے ہیں۔ اور خوفِ فسادِ خلق سے سیاہ سفید کو سفید و سیاہ کر دیا ہے۔ اس کے باوجود اگر کہیں کسی شخصیت یا حقیقت سے مماثلت

پائی جائے تو اسے ''فکشن'' کا سقم تصور کیا جائے۔ یہ ایک نوآموز بینکار کی آشفتہ بیانی ہے' کسی مقتول کا بیان نزعی نہیں جس کے اختتام پر اسے مرنے کی اجازت اور ملزم کو پھانسی دے دی جائے۔

کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرز ادا ہے

کچھ رواروی میں بنائے ہوئے چارکول اسکیچ ہیں' کچھ کیری کچر ☆ اور تین چار جی لگا کر بنائی ہوئی کیمیو تصویریں ● آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی بڑائی آپ کرے تو خودستائی کہلائے اور از راہ کسر نفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی خود کرنے بیٹھ جائے تو یہ احتمال کہ لوگ جھٹ یقین کرلیں گے۔ ممکن ہے بعض پڑھنے والوں کو اس خودنوشت سوانح عمری میں لکھنے والا خود کہیں نظر نہ آئے۔ اگر ایسا تاثر ہے تو یہ عین قرین حقیقت ہوگا۔ اس لیے کہ اپنی زندگی میں بھی ہر قدم پر دوسرے ہی دخیل نظر آتے ہیں۔ عام آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی زندگی میں صرف تین موقعے ایسے آتے ہیں جب وہ تناسب کی نگاہوں کو مرکز ہوتا ہے: عقیقہ' نکاح اور تدفین۔ اس کتاب کا مرکزی کردار کون ہے؟ راقم الحروف؟ مسٹر اینڈرسن؟ وہ فرزانے جن کے دم سے کوچہ سود خوراں شاد و آباد ہے؟ یا زمانے کی روح جو ALICE IN WONDERLAND کی بلی کی طرح خود تو ''فیڈ آوٹ'' ہوجاتی ہے لیکن اپنی امر مسکراہٹ پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔

امریکہ کے مقبول شاعر رابرٹ فراسٹ سے کسی نے دریافت کیا ''وہ کون سا واقعہ ہے جو آپ کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا؟'' فراسٹ نے جواب دیا ''جب میں بارہ سال کا تھا تو ایک موچی کے ہاں کام کرتا تھا۔ اور دن بھر منھ میں کیلیں دبائے پھرتا تھا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں' اور جس مقام پر بھی ہوں' اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ سانس لیتے وقت میں نے وہ کیلیں اور کوکے نہیں نگلے''۔ اگر آپ کو بھی انکشاف احوال واقعی پر اصرار ہے تو مجھے اعتراف کرنا پڑے گا کہ ۱۹۷۴ میں میرے یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ کا پریزیڈنٹ ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ جس انگریز جنرل منیجر نے ۱۹۵۰ میں انٹرویو کرکے مجھے بینک میں ملازم رکھا وہ اس وقت نشے میں دُھت تھا۔ اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ شراب نوشی کے نتائج کتنے دُوررس ہوتے ہیں۔

مشہور و مقبول مزاح نگار جارج میکش کا خیال ہے کہ مغرب میں مزاح مرچکا ہے۔ اب زندہ نہ ہوگا لیکن مغرب ہی پر موقوف نہیں' ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب انسان میں اپنے آپ پر ہنسنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ اور دوسروں پر ہنسنے سے اسے ڈر لگتا ہے۔

نہ کوئی خندہ رہا اور نہ کوئی خندہ نواز

☆CARICATURE: مضحک خاکے

●CAMEO PROTRAITS: دو رنگے پتھر کی ایک پرت پر کندہ۔ تصویر۔

انگلینڈ میں لارڈ راچسٹر نام کا ایک بانکا گزرا ہے۔ کسی گھر بند نہیں تھا۔ رند شاہد باز' شاعر' شرابی' جملے باز' پھکیت' ہزل گو' بدنام ہی نہیں' سچ مچ بدفحاشی میں بے مثال۔ اس کی ظرافت سے لوگ خائف رہتے تھے۔ مرنے لگا تو بیٹے کو بلا کر کہا ''بیٹا! میری واحد وصیت یہ ہے کہ ظرافت سے پرہیز کرنا۔'' معلوم ہوتا ہے اس کی ظرافت میں ایک نہیں' کئی آنچ کی کسر رہ گئی' ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔ جہاں سچ بول کر سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑتا ہے' وہاں چاتر مزاح نگار الف لیلہ کی شہزاد ایک ہزار ایک کہانیاں سنا کر اپنی جان اور آبرو صاف بچا لے جاتا ہے۔ میں نے گمبھیر بین الاقوامی' سماجی' سیاسی اور اقتصادی سوالوں سے جان چھڑانے کے لیے بیس سال پہلے ایک جملہ گھڑا تھا: ''دنیا میں جہاں کہیں' جو کچھ ہو رہا ہے' وہ ہماری اجازت کے بغیر ہو رہا ہے۔'' مزاح نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں اس طرح کہہ جاتا ہے کہ سننے والے کو بھی بہت بعد میں خبر ہوتی ہے۔ میں نے کبھی کسی پختہ کار مولوی یا مزاح نگار کو محض تقریر و تحریر کی پاداش میں جیل جاتے نہیں دیکھا۔ مزاح کو میٹھی مار بھی شوخ آنکھ' پرکار عورت اور دلیر کے وار کی طرح کبھی خالی نہیں جاتی:

نین چھپائے' نا چھپیں' پٹ گھونگھٹ کی اوٹ
چتر نار اور سورما کریں لاکھ میں چوٹ

ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار ابن انشا کے بارے میں کہیں عرض کر چکا ہوں کہ بچھو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشا جی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا بھی ہے۔ جس شگفتہ نگار کی تحریر اس معیار پر پوری نہ اُترے اسے یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کر دینا چاہیے۔

یہاں ایک چھوٹی سی دنیا کی جھلک دکھانی مقصود ہے جس کا ہر خانہ' ہر کا ہک' بھانت بھانت کے فرماں روایان ناوقت کا حجلہ پندار ہے۔ بقول مولانا حالی:

جانور' آدمی' فرشتہ' خدا
آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں

منشا سبق آموزی جہاں نہیں۔ نہ اپنے سینے میں کوئی ایسی امانت یا آگ کہ امیر خسرو کی طرح یہ کہہ سکیں کہ اس صندوق استخوانی میں بے شمار تحفہ ہائے آسمانی ایسے تھے جو میں نے اس دن کے لیے بچا رکھے تھے۔ اپنے وسیلہ اظہار......مزاح...... کے باب میں میں کسی خوش گمانی میں مبتلا نہیں۔ قہقہوں سے قلعوں کی دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں۔ چٹنی اور اچار لاکھ چٹخارے دار سہی' لیکن ان سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔ نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے۔ ہاں ریگستان کے شدائد کم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز' اندوہ و انبساط' کرب و لذت کی منزلوں سے بے نیاز نہ گزر جانا بڑے حوصلے کی بات ہے۔

بار الم اٹھایا' رنگ نشاط دیکھا

آ ئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

مگر یہ نہ بھولنا چاہیے کہ خوش دلی کی ایک منزل بے حسی سے پہلے پڑتی ہے اور ایک اس کے بعد آتی ہے۔

سبھی کی مسکراہٹیں اور ہنسی ایک جیسی نہیں ہوا کرتی۔ فالسٹاف قہقہہ لگاتا ہے تو روم روم مسکرا اُٹھتا ہے۔ کوئی بڑا گرتا ہے تو چھوٹے ٹھٹھے لگاتے ہیں۔ قومیں جب اللہ کی زمین پر اترا اترا کر چلنے لگتی ہیں تو زمین اپنے ہی زہر خند سے شق ہوجاتی ہے اور تہذیبیں اس میں سماجاتی ہیں۔ شیر خوار بچے خوش ہوتے ہیں تو کلکاریاں مارتے، ہمک کر ماں کی گود میں چلے جاتے ہیں۔ ادھر مونالزا ہے کہ صدیوں سے مسکرائے چلی جارہی ہے۔ اور ایک مسکراہٹ وہ بھی ہے جو نروان کے بعد گوتم بدھ کے لبوں کو ہلکا سا خمیدہ کرکے اس کی نظریں جھکا دیتی ہے۔ یہ سب سہی، لیکن ماورائے تبسم، وہ اہتزاز اور مزاح جو سوچ، سچائی اور دانائی سے عاری ہے دریدہ دہنی، پھکڑپن اور ٹھٹھول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ زر، زن، زمین اور زبان کی دُنیا یک رخوں، یک چشموں کی دنیا ہے۔ مگر تتلی کی سینکڑوں آنکھیں ہوتی ہیں۔ اور وہ ان سب کی مجموعی مدد سے دیکھتی ہے۔ شگفتہ نگار بھی اپنے پورے وجود سے سب کچھ دیکھتا، سنتا، سہتا اور سہارتا چلا جاتا ہے۔ اور فضا میں اپنے سارے رنگ بکھیرے کے کسی نئے افق، کسی اور شفق کی تلاش میں گم ہوجاتا ہے۔

پہلی کتاب ''چراغ تلے'' پر نظر ثالث جناب شاہد احمد دہلوی مرحوم نے کی تھی۔ (نظر ثانی گھر کے سنسر نے کی تھی۔ چنانچہ کتاب بھی سوکھ کے آدھی رہ گئی) دوسری کتاب ''خاکم بدہن'' پر جناب شان الحق حقی نے نظر ثانی فرمائی۔ شاہد احمد دہلوی کی طرح وہ بھی واں کے نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ خیال آیا کہ تیسری کتاب کا ذائقہ بدلنے کی خاطر اس دفعہ کیوں نہ کسی لکھنوی اہل زبان سے اصلاح کے بہانے چھیڑ چھاڑ کا آغاز کیا جائے۔ (یوں تو میں بھی ٹھیٹ اہل زبان ہوں، بشرطیکہ زبان سے مراد مارواڑی زبان ہو) چنانچہ محبِ گرامی جناب محمد عبدالجمیل صاحب سے رجوع کیا جن کے جداعلیٰ مولانا فضیل حق خیر آبادی، غالب کا دیوان مرتب کرتے وقت بیسیوں اشعار حذف کرکے پروفیسروں اور ریسرچ اسکالروں کے مستقل روزگار کا بندوبست فرما گئے۔ جمیل صاحب نے میری زبان کے ساتھ لگے ہاتھوں جوانی کا بھی جائزہ لے ڈالا۔ اور انہیں بالترتیب داغدار اور بے داغ پاکر اپنی مایوسی کا اظہار کیا۔ فرمایا کہ ترتیب اگر اُلٹی ہوتی تو کیا بات تھی۔

مسودے کے کچھ حصے پڑھ کر فرمایا ''ایسا لگتا ہے کہ کچھ کوائف آپ نے صیغہ راز میں رکھے ہیں۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہی کہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟''

’’یکم محرم کو۔ ستوانسا۔ ’’ٹونک (راجستھان) میں‘ جہاں کے خربوزے اور ’’چکو باز‘‘ مشہور ہیں۔ خاندان‘ تاریخ اور جائے ولادت کے انتخاب میں میرا ووٹ نہیں لیا گیا تھا۔ پکڑے جاتے ہیں بزرگوں کے کیے پر ناحق۔ آبائی مسکن جے پور۔ تعلیم جے پور‘ آگرے اور علی گڑھ میں ہوئی۔ اور عمر عزیز کا بیشتر حصہ کراچی میں گزرا۔ شہروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے۔‘‘

’’زندگی میں وہ کون سی پہلی ایکٹرس تھی جس پر آپ جی جان سے فریفتہ ہوئے؟‘‘

’’آپ اس بہانے میرا سن پیدائش معلوم کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’نشئے سوانح حیات مین بھی جو نہ کھلے اُس سے ڈرنا چاہیے۔ کچھ تو کھلئے۔ پسندیدہ رنگ؟ پسندیدہ خوشبو؟ پسندیدہ حسن وغیرہ وغیرہ......؟‘‘

’’1۔ کبھی رنگ پسند ہیں۔ سو کے نوٹوں کے رنگ بدلتے رہے ہیں۔

2۔ تیز مہکار چہکار نہیں بھاتی۔ رات کی رانیاں ...... دونوں قسم کی ...... دور کسی اور کے آنگن ہی سے مہک دیتی اچھی لگتی ہیں۔

3۔ جہاں تک حسن کا تعلق ہے‘ وغیرہ وغیرہ پسند ہے۔‘‘

’’اپنا تازہ ترین فوٹو شامل کتاب کرنے میں تامل تھا تو کم از کم حلیہ ہی بیان کر دیتے۔‘‘

’’آئینہ دیکھتا ہوں تو قادر مطلق کی صناعی پر جو ایمان ہے وہ کبھی کبھی متزلزل ہو جاتا ہے۔‘‘

’’خاندان اور بچپن کے حالات پر بھی آپ نے روشنی نہیں ڈالی۔ حد یہ کہ بینک کا نام تک نہیں بتایا؟‘‘

’’ایک چشم دید واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں ایک خاتون نے جو اُردو میں معمولی شدبد رکھتی تھی اس زمانے کا مقبول عالم ناول شوکت آرا بیگم پڑھا‘ جس کی ہیروئن کا نام شوکت آرا اور معاون کردار کا نام فردوس تھا۔ ان کے جب بیٹیاں ہوئیں تو دونوں کے یہی نام رکھے گئے۔ ایک کردار کا نام ادریس اور دوسرے خدائی خوار اچھن تھا۔ یہ دونوں انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بطور نام اور عرفیت بخش دیئے۔ بچے کل چار دستیاب تھے جب کہ ناول میں ہیرو کو چھوڑ کر ابھی ایک اور اہم کردار پیارے میاں نامی ولن باقی رہ گیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں ناموں اور دہرے رول کا بوجھ بڑے بیٹے ہی کو اٹھانا پڑا جس کا نام ہیرو کے نام پر مشتاق احمد رکھا گیا تھا۔ یہ سادہ لوح خاتون میری ماں تھی۔ بحمد اللہ! ناول کی پوری کاسٹ‘ باستثنائے شوکت آرا جس کا طفولیت ہی میں انتقال ہو گیا تھا‘ زندگی و سلامت ہے۔ والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور عرب جا کر بدوؤں کا مفت علاج کروں‘ اس لیے کہ ناول کے ہیرو نے یہی کیا تھا۔ مولا کا بڑا کرم ہے کہ ڈاکٹر نہ بن سکا۔ ورنہ اتنی خراب صحت رکھنے والے ڈاکٹر کے پاس کون پھٹکتا۔ ساری عمر کان میں اسٹیتھس کوپ لگائے

اپنے ہی دل کی دھڑکنیں سنتے گزرتی۔ البتہ ادھر دو سال سے مجھے بھی سعودی عرب، بحرین، قطر، عمان اور عرب امارات کی خاک نہیں، تیل چھاننے اور شیوخ کی خدمت کی سعادت نصیب ہوتی رہی ہے۔ ناول کے بقیہ پلاٹ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اُردو ادب کبھی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوا وہ ذرا دیدۂ عبرت نگاہ سے اس عاجز کو دیکھیں۔ یہ سب کچا چٹھا۔ کہئے جمیل صاحب! اب تو ٹھنڈک پڑی؟''

جس توجہ اور دقت نظر سے جمیل صاحب نے مسودہ ملاحظہ فرمایا وہ ان کے التفات خاص اور زباندانی کا ہنستا مسکراتا ثبوت ہے۔ مثلاً پہلے باب میں میں نے لکھا ہے کہ سردی سے بچے اپنی بتیسی بجاتے ہیں۔ بتیسی کو قلمزد...... کرتے ہوئے فرمایا ''یہ آپ نے کیا لکھ دیا؟'' ڈرتے ڈرتے پوچھا ''کیا لکھنو میں کچھ اور بجاتے ہیں'' ارشاد ہوا ''بچے کے تو اٹھائیس دانت ہوتے ہیں۔ بتیسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' گزارش کی ''اگر یہ لکھ دوں کہ بچے اپنی اٹھائیسی بجاتے ہیں تو لوگ نہ جانے کیا سمجھ بیٹھیں گے۔ اور اگر کسی بچے کی آدھی داڑھ نکل آئی ہو تو کیا ساڑھے اٹھائیسی بجانا لکھوں؟'' عینک اُتار کے مسکراتی ہوئی آنکھیں دکھاتے ہوئے بولے ''اور یہاں (علم دریاؤ میں) آپ نے 'حرامزدگی' لکھا ہے۔ حرمزدگی ہونا چاہیے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک پیدائشی مفت ہے۔ دوسری اپنے زور بازو سے پیدا ہوتی ہے؟''

ایک دن بکراہت استفسار فرمایا ''روکن سے آپ کی مراد کیا ہے۔ میں نے تو یہ کریہہ لفظ آج تک نہیں سنا۔ دلی کا ہوگا۔ یا مارواڑی ڈھیلا؟'' عرض کیا ''وہ چیز جو سودا خریدنے کے بعد دکاندار اوپر سے مفت دے دے۔'' فرمایا ''اسے تو لکھنو میں گھاتا کہتے ہیں۔ عرض کیا'' میں نے تو یہ کریہہ لفظ آج تک نہیں سنا''۔ حکم ہوا'' گھر جا کر اپنی اہل زبان اہلیہ سے پوچھ لیجئے۔ وہ جو بھی فیصلہ کریں گی مجھے منظور ہوگا''۔ میں حلف اٹھا کر کہہ سکتا ہوں جمیل صاحب نے انہیں ثالث محض اس بنا پر بنایا کہ انہیں سو فیصد یقین تھا کہ وہ فیصلہ بہر صورت میرے خلاف ہی کریں گی۔ ورنہ وہ اپنی بیگم کو بھی حکم بنا سکتے تھے۔ خیر میں نے شام کو بیگم سے پوچھا ''تم نے لفظ روکن سنا ہے؟'' بولیں ''ہاں! ہاں! ہزار بار!'' جی خوش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد سند کو مزید معتبر بنانے کے لیے پوچھا ''تم نے یہ لفظ کہاں سنا؟'' بولیں ''تمہی کو بولتے سنا ہے۔''

بیرون خانہ ریسرچ سے بھی معلوم ہوا کہ دلی میں بھی بکثرت بولا جاتا ہے۔ جمیل صاحب کو اس تحقیق سے آگاہ کیا اور سند میں اپنے آپ کو پیش کیا۔ انہیں مزید مشتعل کرنے کے لیے جناب تابش دہلوی اور حضرت ذوالفقار علی بخاری مرحوم کا چٹاخ پٹاخ مکالمہ مجوان دنوں کہیں چھپا تھا دہرا دیا۔ تابش صاحب کے منھ سے کہیں نکل گیا ''لکھنو والوں نے پوری ادبی تاریخ میں شعر اچھا نہیں کہا۔

ایک لے دے کے آتش ہیں۔ ان پر بھی دہلویت کی چھاپ ہے۔ اور ویسے بھی لکھنوی شاعری میں سوائے چونچلے اور نخرے کے ہوتا کیا ہے؟'' بخاری صاحب تنک کر بولے ''اور داغ دہلوی کے یہاں کیا ہے؟'' تابش صاحب نے تشریح فرمائی ''جی ہاں! داغ کے یہاں بھی چونچلے اور نخرے ہیں لیکن رنڈی باز کے ہیں، رنڈی کے نہیں!''

چہرہ پہلے تو وفور تکدر سے تمتمایا۔ پھر شگفتہ ہوکر بولے ''تابش دہلوی کی باتیں ہی باتیں ہیں۔ انتہائی شریف النفس اور پاکباز آدمی ہیں۔ انہوں نے تو رنڈی کا فوٹو بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ رہے آپ تو آپ نے تو رنڈی باز بھی نہیں دیکھے۔ یوں بھی میرا خیال ہے کہ آپ کو ڈھنگ کی صحبت کبھی نصیب نہیں ہوئی''۔ عرض کیا ''مرشدی! اگر ہم میں گمراہ ہونے کی عظیم صلاحیتیں نہ ہوتیں تو آپ تک کیسے پہنچتے؟''

دونوں اپنے اپنے لسانی مورچوں میں ڈٹے ہوئے بلکہ دھنسے ہوئے تھے۔ بالآخر سمجھوتا اس پر ہوا کہ آئندہ ٹکسالی پنجابی لفظ ''جھونگا'' استعمال ہوگا جو عظیم مزاح نگار اور یار طرحدار کرنل محمد خاں کے عطایا میں سے ہے۔

اور تو اور انتساب بھی ان کی نگاہ مردم شناس سے نہ بچ سکا۔ فرمایا ''سچ سچ بتایئے۔ ان دونوں میں سے مرزا عبدالودود بیگ کون ہے؟ اور ہاں! یہ تو آپ کی سوانح نوعمری ہے۔ ہر چند کہ آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ نے عزت سادات بغیر عاشقی کیے کھوئی لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا۔ بقول شاعر، یوسفی گر نہیں ممکن تو زلیخائی کر۔ نئی نسل کے پڑھنے والے اپنے بزرگوں کی نالائقی اور بے راہ روی کے قصے پڑھ کر فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ آپ بھی پھڑکتے ہوئے انتساب کے پردۂ زنگاری میں کسی معشوق کو بٹھا دیتے تو نقادوں کے ہاتھوں چتھاڑ ہونے سے پہلے کتاب تکیوں کے نیچے پہنچ جاتی اور دس دن کے اندر اندر دوسرا ایڈیشن باِضافہ حکایات لذیذ و شوق انگیز نکالنا پڑتا۔ مثلاً

...... کے نام
جس نے بشری کمزوری
کے ایک لمحے کو
ہمیشگی بخش دی۔''

عرض کیا ''صاحب! اول تو نقطوں (......) کے نام صرف جیومیٹری کی کتاب معنون کی جاسکتی ہے۔ دوسرے، ایک لمحہ تو انسانی کمزوری کے لیے بھی بہت ہی کم ہے۔ ایک گھنٹہ نہیں تو کم از کم ایک منٹ تو کر دیجیے، پلیز!'' اپنے مخصوص انداز میں سنی ان سنی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''گاہ بگاہ' آپ کی انشائے ارغوانی کے پیش نظر سونے کے دانت والی لڑکی کے نام!' (صفحہ ۲۶۱) کیسا رہے گا؟ چہ گنہ

اگر تراشم صنمے زسنگ خارا۔ آپ کے ہیرو غالبؔ نے بھی تو بڑے اترونے پن سے اقبال جرم کیا تھا کہ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں' اس کو مار ارکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔'' عذر کیا'' مگر میں تو مغل نہیں ہوں۔'' بولے'' کوئی مضائقہ نہیں ۔ بچے تو ابھی تک ہیں ۔'' اس کے بعد بچہ اور بچے' سرگودھا اور سرگودھے' وضع اور وضعے کے املا / املے پر ایسی گھمسان کی بحثا بحثی ہوئی کہ منھ لگائی ڈومنی کوئے ملامت سے تال بے تال گاتی' ڈھولک بجاتی نکل گئی۔

کتابت کا مرحلہ آیا تو پہلے لاہور کے ایک صاحب طرز' نفاست پسند' درویش منش خطاط سے رجوع کیا۔ دو تین دفعہ درخواست کی تو سکوت فرمایا۔ چوتھی مرتبہ ارشاد فرمایا'' شکریہ! پندرہ روپے فی صفحہ اُجرت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فقیر صرف مفید و مذہبی تصانیف کی کتابت کرتا ہے۔'' ان کے ایما پر میں نے نمونتہً'' چراغ تلے'' کا نسخہ ایک صاحب کے توسط سے ان کی خدمت میں پیش کر دیا اور جواب کے انتظار میں رہا۔ ڈر ڈر کے کی گئی مگر امید کی گئی۔ دو دن بعد اسے جہاں تہاں سے سونگھ کر ان ہی صاحب کی زبان کہلا بھیجا کہ'' روزانہ تہجد کے بعد کلام پاک کی خطاطی کرتا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ سارا ثواب ان کی کتاب کی بھینٹ چڑھ جائے۔ میں نے بے مصرف کتابت ترک کر دی ہے۔ ہاں! کبھی کبھار کسی فرمائش پر لوح مزار کی عبارت لکھ دیتا ہوں؟'' اب لے دے کے اپنی لوح مزارہ گئی تھی۔ سووہ تاریخ وفات کے بغیر ادھوری معلوم ہوتی۔ نے چراغے نے گلے۔ نے صاحب مزارے! ان صاحب سے جو ایلچی کے فرائض انجام دے رہے تھے میں نے کہا یہ تو ہوا سو ہوا۔ ذرا ان سے اتنا پوچھئے گا کہ جب قدغن کا یہ عالم ہے تو انہوں نے دیوان غالبؔ کی کتابت کیا سمجھ کے کی۔ انہوں نے کھڑے کھڑے وہیں قضیہ نمٹا دیا۔ فرمایا کہ شاعری کی اور بات ہے۔ شعر میں جس بات پر ہزاروں آدمی مشاعروں میں اُچھل اُچھل کے داد دیتے ہیں وہی بات اگر نثر میں کہہ دی جائے تو پولیس تو بعد کی بات ہے، گھر والے ہی سر پھاڑ ڈالیں۔

پاپ کی جس گھڑی نے اس بزرگ پر گرانی کی اسے ایک نوجوان عزیزی محمد شفیق نے بصد شوق اُٹھالیا۔ لاہور ہی میں دو سطر یومیہ کی رفتار سے کتابت شروع ہوئی۔ پندرہ بیس صفحے مکمل ہو پائے ہوں گے کہ میرا لاہور جانا ہوا۔ میں نے کہا'' اگر آپ اسی رفتار سے کتابت کرتے رہے تو یہ کتاب تو پانچ چھ سال میں ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد آپ کیا کریں گے؟ خط البتہ اچھا ہے لیکن جا بجا ناہمواری اور کجی پائی جاتی ہے۔ الفاظ اُکھڑے اُکھرے لگتے ہیں۔'' بولے'' لکھنے میں ہنسی آجائے تو قلم میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ جو حصے غیر دلچسپ ہیں وہ نہایت عمدہ لکھے گئے ہیں۔ بہت کافی ہیں۔ بے شک کسی کو دکھالیں۔'' میں نے کہا'' برخوردار! اگر ایسا ہی ہے تو پہلے مسودہ پڑھ کر ہنس لیا

کرو۔ پھر یکسوئی کے ساتھ ہاتھ جما کر کتابت کرو۔'' کہنے لگے'' جناب! محنتانہ صرف لکھنے کا طے ہوا ہے۔ عدیم الفرصت آدمی ہوں۔ میری شادی ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا۔'' ☆ اندریں صورت التماس ہے کہ قارئین کو جہاں جہاں ان کے خط میں لرزش خفی وجلی نظر آئے اُسے اس عاجز کا کمال فن سمجھ کرانہیں معاف فرمائیں۔

پاکستان کے جانے پہچانے کارٹونسٹ برادرم عزیز بھی عرصہ دراز سے مزاح اور معدے کے انہی امراض میں مبتلا ہیں اور میرے دوا شریک بھائی بنے ہوئے ہیں۔ ممنون ہوں کہ انہوں نے ''فینی ڈرائنگ'' کو بغور چڑھ کر دو کارٹونوں سے مزین کیا۔ ملاقات ہوئی تو دیر تک اپنا پیٹ پکڑ کے' بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنی اچکن پکڑ کے اس میں ہارمونیم کی دھونکنی کی طرح ہوا بھرتے اور نکالتے ہوئے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ انہیں یوں مائل بہ ستائش دیکھا تو میں بھی جھوٹی کسرنفسی کو بالائے دادرکھ کر خوب ہنستا۔ عرض کیا'' چلئے محنت ٹھکانے لگی۔ آپ نے پسند کیا۔'' دوبارہ اچکن دھونکتے ہوئے فرمایا'' بھائی جانؒ بڑا مزا آیا۔ کارٹون غضب کے ہیں!'' اب کی بار دونوں نے اپنے اپنے کمال فن پر منھ موڑ کر اپنی اپنی دھونکنی دھونکی۔

مشتاق احمد یوسفی

۶۸ سی' کے۔ڈی۔اے،ا۔ کراچی

۲۷/جنوری ۱۹۷۶ء

☆☆☆

☆ عذر شرعی

یہ بات پرانی ہوئی۔ سدرہ بیٹی اب ماشاءاللہ دو مہینے کی ہوگئی ہے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

محمد شفیق، شفیق رقم لاہور

۲۰/مارچ ۱۹۷۶ء

غنودیم، غنودیم

(پس و پیش لفظ)

''احسان بھائی! منور حسین بھی رخصت ہو گئے۔ انتقال سے پہلے.....''

''کس کے انتقال سے پہلے؟'' میاں احسان الٰہی نے اپنی بے نور آنکھوں سے چھت کے پنکھے کو تکتے اور اپنے فالج زدہ ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے اٹھا کر اپنے دل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ انہیں رہ رہ کر این جائنا کے درد کا شبہ ہو رہا تھا۔

یہ جنوری ۱۹۸۷ کا ذکر ہے۔ مجھے اپنا مدعا بیان کرنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ میاں احسان الٰہی پانچ سال سے صاحب فراش تھے۔ فالج کے حملے کے بعد وہ امراض قلب کے اسپتال میں دس بارہ دن ''کوما'' میں رہے۔ جب ہوش آیا تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کا آدھا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ بینائی جاتی رہی۔ قوت گویائی بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ حافظہ آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ صرف تکلیف دہ باتیں یاد رہ گئیں۔

اگر اب انہیں کوئی پہلی بار دیکھتا تو یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی سوا چھ فٹ، دو سو دس پونڈ اور پہلوانی ڈیل ڈول والا شخص ہے جو بہتر سال کی عمر میں صبح چار بجے ڈیڑھ گھنٹے ڈنڑ بیٹھک لگاتا، پھر ایک گھنٹے ٹینس کھیلتا اور دن میں چار پانچ میل پیدل چلتا تھا۔ ۱۹۶۰ میں دل کے پہلے شدید دورے کے بعد انہوں نے بدپرہیزی، بیٹھکوں اور بزم آرائیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ لندن گئے تو ابن الحسن برنی کی طرح انہیں بھی کہیں کوئی زینہ نظر آ جاتا تو اس پر چڑھتے ضرور تھے۔ کہتے تھے ''اس سے دل قوی اور بڑھاپا پسپا ہوتا ہے۔ ساٹھ پینسٹھ برس پہلے چنیوٹ کے نواح میں کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس پر میں نہ چڑھا ہوں''۔ ڈاکٹروں نے غذا میں سخت پرہیز کی تاکید کی۔ انہوں نے چنیوٹ سے اصلی گھی اور آم کا اچار منگوانا تو چھوڑ دیا، لیکن چنیوٹی کُنا، + سندھی بریانی، برنس روڈ کی تر تراتی تافتان، کوئٹہ کے سجی کباب، بادام کی حیدر آبادی لوزات، ملتان کے انور رٹول ...... مختصر یہ کہ دل کے مریض کے لیے خودکشی کے نسخے کے جملہ اجزا...... نہیں چھوڑے۔ خود ہی نہیں، اپنے معالجوں کو بھی گھر بلا کر بڑے شوق اور اصرار سے کھلاتے۔ کہتے تھے لذیذ غذا سے مرض کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور

+ کُنا: گھڑے یا مٹی کے برتن میں پکا ہوا سوندھا سالن۔ چنیوٹ کی خاص ڈش۔

طاقت پیدا ہوتی ہے! وہ بدستور اپنے خلاف وضع طبی معمولات پر قائم رہے۔ روزے بھی نہیں چھوڑے کہ بچپن سے رکھتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح پنج وقتہ نماز اب بھی باقاعدگی سے قضا کرتے تھے۔ تاویل یہ پیش کرتے کہ اب شروع کروں تو لوگ کہیں گے، میاں صاحب ایک ہی ہارٹ اٹیک میں اٹھک بیٹھک کرنے لگے! ذیابطیس بھی ہوگئی۔ لیکن سونے سے پہلے ایک پاؤنڈ کریم والی آئس کریم ضرور کھاتے۔ جتنے ذہین تھے' اس سے زیادہ خود رائے۔ ہر مسئلہ پر...... خواہ طبی ہی کیوں نہ ہو ...... وہ الگ اپنی رائے رکھتے تھے۔ کہتے تھے، آئس کریم قلب کو ٹھنڈک پہنچاتی اور بلڈ پریشر کو قابو میں رکھتی ہے، بشرطیکہ مقدار قلیل نہ ہو۔ سرگودھا یا ساہیوال اپنے سمدھیانے جاتا ہوں تو تکلف میں رات کو آئس کریم کا ناغہ ہو جاتا ہے۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ جس رات آئس کریم نہ کھاؤں' اس رات مچھر بہت کاٹتے ہیں۔ ۱۹۷۰ میں آپ کو معلوم ہے، یورپ کی سیاحت پر گیا تھا۔ کئی دن تک بریانی نہیں ملی۔ چنانچہ ویانا میں ہرنیا کا آپریشن کرانا پڑا! آپ میرے چٹورپن اور بدپرہیزی کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ غالب کو دیکھیے۔ ساری عمر ناقدری اور عسرت و تنگ دستی کا رونا روتے رہے، خصوصاً آخری دنوں میں۔ لیکن ذرا مرض الموت میں ان کی آخری غذا تو ملاحظہ فرمایئے۔ صبح کو سات بادام کا شیرہ' قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کی یخنی۔ تین شامی کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر (+)۔ بھائی میرے! یہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، سوائے ستم پیشہ ڈومنی کے۔ لیکن مجھے تو مرض الموت کے بغیر بھی اتنی کیلوریز میسر نہیں۔ اور ہاں' شراب کے ضمن میں بادۂ پرتگالی کے بجائے خانہ ساز کی شرط توجہ طلب ہے۔ علاوہ ازیں' صرف پانچ روپے بھر شراب غالباً اس لیے پیتے تھے کہ اگر اس کی مقدار بڑھا دیتے تو پھر اتنا ہی عرقِ شیر بھی زہر مار کرنا پڑتا۔ بھائی میرے! میں تو دودھ کی آئس کریم صبر و شکر سے کھاتا ہوں۔ کبھی تولہ ماشہ کی قید نہیں لگائی''۔

ڈاکٹروں سے ایکس رے اور مرض کی تشخیص کرانے کے بعد اکثر بایو کیمسٹری سے خود اپنا علاج کرتے۔ ایسی قوت ارادی کے مالک اور ایسے بقراط مریض پر ڈاکٹر کو بھی غصہ نہیں آتا۔ ترس اور پیار آتا ہے۔ حلقہ یاراں میں جب وہ خوش گفتاری پر آتے تو ڈمپل ان کے رخسار ہی میں نہیں، فقروں میں بھی پڑتا تھا۔ بالآخر ان کی بدپرہیزی اور لاجواب کر دینے والی منطق کا نتیجہ شدید فالج کی شکل میں رونما ہوا۔

میں ڈرائینگ روم اور برآمدے سے ہوتا ہوا ان کے کمرے تک پہنچا تو دیکھا کہ ان کے میوزک روم میں (جس میں نو دس لاؤڈ اسپیکر اس خوبی سے لگائے گئے تھے کہ ایک بھی نظر نہیں آتا تھا) تالا پڑا ہے۔

(+) عرق شیر: پھاڑے ہوئے دودھ کا عرق جو ضعف معدہ کے مریضوں کو دیا جاتا تھا۔ غالب سے بعید نہیں کہ اسے شراب کے مُصلح یا بدرقہ کے طور پر پیتے ہوں۔

ان کی ذاتی لائبریری بھی، جس کی سیکڑوں کتابوں کی قیمتی جلدیں انہوں نے نظام دکن کے شاہی جلد ساز سے بطورِ خاص بنوائی تھیں، چار سال سے بند پڑی تھی۔ اسی لائبریری میں انہوں نے میرا تعارف نیاز فتح پوری، مولانا محمد ایوب دہلوی، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد سے کرایا تھا۔ اور یہیں سے انہوں نے ایک دفعہ آدھ گھنٹے تک مجھے فون پر استاد بندو خان کی سارنگی سنوائی تھی کہ وہ اپنے ہر شوق اور لطف میں دوستوں کو شریک کر کے اپنی خوشی دوبالا کرنے کے رمز سے واقف تھے۔

فون پر سارنگی سنوانے کا قصہ یہ ہے کہ ان کے والد مرحوم حاجی محمد یعقوب صاحب اپنے گھر میں تاش، پرائی عورتوں کے فوٹو (مراد ایکٹرسوں سے تھی) اور پاندان رکھنے کے تو خلاف تھے ہی، گانے کی محفل کے بھی روادار نہ تھے۔ فرماتے تھے "بیٹا جی! موسیقی حرام تو ہئی ہے۔ منحوس بھی ہوتی ہے۔ جس گھر میں ایک دفعہ طبلہ یا گھنگرو بج گئے، اس گھر کے سامنے ایک نہ ایک دن دوالے اور قرقی کا ڈھول بجنا لازمی ہے۔ وہ گھر اُجڑے ہی اُجڑے۔ اے میری وصیت جانو۔" وصیت کے احترام میں میاں احسان الٰہی اس مترنم نحوست کا اہتمام عاجز کے گھر کرواتے تھے۔ لیکن الحمد للہ! مرحوم کی پیش گوئی کے مطابق ہمارے گھر کے سامنے کبھی قرقی کا ڈھول نہیں بجا۔ کسی بھی گھر کے سامنے نہیں بجا، جب کہ اس عرصے میں ہم نے (کرائے کے) نو گھر تبدیل کیے۔ میاں احسان الٰہی اپنے گھر میں موسیقی صرف تین صورتوں میں جائز و مباح سمجھتے تھے۔ اول، گانے والی زندہ حالت میں نہ ہو۔ مطلب یہ کہ اس کہ گانے کا صرف ریکارڈ یا ٹیپ ہو۔ دوم، ان کے گھر میں گانے والا بالکل تنہا گائے۔ یعنی نہ طبلے کی سنگت ہو اور نہ ان کے علاوہ کوئی اور سننے والا موجود ہو۔ نیز یہ اندیشہ نہ ہو کہ گانے کے بول سمجھ میں آ جائیں گے۔ یعنی راگنی پکی ہو۔ سوم، گانے والے کو داد کے سوا کچھ اور نہ دینا پڑے۔ مطلب یہ کہ گانے والا فی سبیل اللہ گلوکاری کرے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان پاکیزہ شرائط و قیود کے ساتھ جو شے ظہور میں آئے گی، وہ والد مرحوم کی وصیت تو ہو سکتی ہے، موسیقی ہرگز نہیں۔

میاں احسان الٰہی اس وقت کمرے کے وسط میں ایک اونچے اسپتالی بیڈ پر نئی ریشمی دُلائی اوڑھے نیم غنودگی کے عالم میں لیٹے تھے۔ دائیں دیوار پر عالم جوانی کی دو تصویریں ٹنگی تھیں۔ ایک میں وہ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کھڑے تھے۔ دوسری میں وہ بندوق کا بٹ (کندہ) مردہ نیل گائے کی تھوتھنی پر رکھے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ دونوں تصویروں کے نیچے ان کی نئی ان ویلڈ چیئر (معذروں کی کرسی رواں) رکھی تھی۔ ان کے سرہانے ایک اونچے اسٹول پر وہ قیمتی دوائیں بجی تھیں جن کے ناکارہ و بے اثر ہونے کا وہ نیم زندہ اشتہار تھے۔ اس وقت تو ان کے حافظے کا قائل ہونا پڑا اس لیے کہ انہوں نے میری تواضع کے لیے فریسکو سے میری پسندیدہ گرم جلیبیاں اور ناظم آباد کے ملا حلوائی کے گلاب جامن منگوائے تھے۔ دائیں طرف دیوار سے لگے ساگوان کے کنگ سائز بیڈ پر تکیے نہیں

تھے۔ ان کی بیگم کے انتقال کو دو مہینے ہوئے تھے۔ دروازے کے سامنے والی کھڑکی کے کارنس پر ایک چھوٹا سا کیسٹ پلیئر اور ان مشاعروں کے ٹیپ رکھے تھے جو گزشتہ پینتیس برسوں میں اس لان پر ہوئے تھے جس کے لیے گھاس ڈھاکہ سے، گلاب اور پام کے درخت پنڈی اور سری لنکا سے منگوائے تھے۔ فالج کے پیش نظر پنکھا، ایئر کنڈیشنر، کھڑکیاں، بری خبروں کی اطلاع، بچوں کا داخلہ ...... سب بند تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ ان کی سماعت بھی متاثر ہو چکی ہے۔ میں نے ذرا اونچی آواز میں دہرایا:

''ہمارے یار جانی منور حسین مر گئے۔''

''ہاں، مجھے کسی نے بتایا تھا۔'' انہوں نے بڑی لکنت سے کچھ کہا جس کا مطلب میں نے یہی سمجھا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔

میری بات پر وہ اپنی توجہ بیس پچیس سیکنڈ سے زیادہ فوکس نہیں کر پا رہے تھے اور حاضر دماغی کے اس مختصر سے کوندے میں اپنا مدعا بیان کرنے میں مجھے خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بات یہ تھی کہ اٹھائیس سال کراچی میں رہنے کے بعد میں نے جنوری ۱۹۷۹ء میں لندن جانے کے لیے رخت سفر باندھا تو پہلے اپنے دونوں دوستوں (جن کے نام رسمی خانہ پری کی خاطر میاں احسان الٰہی اور منور حسین فرض کر لیجیے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ دوست کو کسی بھی نام سے پکاریں، گلوں ہی کی خوشبو آئے گی) کی باتیں اور یادیں انہیں کی زبانی ٹیپ پر محفوظ کیں۔ مفصل نوٹ بھی لیے۔ ان یادداشتوں پر مبنی و مشتمل دس خاکے اور مضامین لندن میں بری تیز قلمی سے لکھ ڈالے اور حسب عادت پال میں لگا دیے کہ ڈیڑھ دو سال بعد نکال کر دیکھیں گے کہ کچھ دم ہے بھی یا نرے سوختنی ہیں۔ میاں احسان الٰہی اور منور حسین سے دوبارہ ان کی اشاعت کی اجازت چاہی جو انہوں نے بخوشی اور غیر مشروط طور پر دے دی۔ میں نے صاف کرنے کے لیے مسودہ نکال کر دیکھا تو ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب کچھ کسی اور نے لکھا ہے۔ یہ بھی بالکل عیاں تھا کہ یہ دو کتابوں کا مواد ہے۔ میں ایک مسودے سے دو کتابیں برآمد کرنے کا جتن کر رہا تھا کہ منور حسین کا ایک مختصر ساخط موصول ہوا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے تو ذاتی طور پر کوئی تامل یا اعتراض نہیں، لیکن ممکن ہے اس کی اشاعت میرے اعزہ و اقربا کو اچھی نہ لگے۔ لہٰذا ان باتوں اور یادوں کو میرے نام سے منسوب نہ کیا جائے۔ قبل اس کے کہ میں کراچی جا کر ان سے اس موضوع پر مفصل گفتگو کروں، دو تین مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

میری روداد سن کر میاں احسان الٰہی نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ پھر کہنے لگے، بہت دن ہو گئے۔ اب پاکستان آ بھی جائیے۔ ہمارے

بعد آئے تو کیا آئے۔ بینائی بالکل جاتی رہی۔ کبھی کبھی مجھے آپ کا چہرہ یاد نہیں آتا۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ سینتیس سال میں میں نے انہیں دوسری بار روتے دیکھا۔

اب میں عجیب پس وپیش میں مبتلا ہوگیا۔ دونوں کی یادیں اور باتیں ایک دوسرے میں کچھ اس طرح گتھی اور گندھی ہوئی تھیں کہ ان جڑواں سیامی تحریروں کو بے ضرر عمل جراحی سے علاحدہ کرنا میرے بس کا کام نہ تھا۔ اور نہ یہ ممکن تھا کہ ایک کے نام' مقام اور شناختی کوائف کا تو انکشاف کردوں اور دوسرے کی تلبیس لباس کرکے افسانوی لبادہ پہنادوں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ سارے مسودے کو یک قلم مسترد کرکے نہ صرف نام اور مقام بدل دوں' بلکہ اول تا آخر سب کچھ fictionalise کردوں' جس کا ان دونوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اور میں نے یہی کیا۔

چنانچہ'' آب گم'' کے پانچ کہانی نما خاکوں میں آپ جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے، اس کا ان دوستوں کے واقعات زندگی یا ان کے احباب، بزرگوں اور لواحقین سے قطعاً کوئی تعلق یا مماثلت نہیں ہے۔ مودبانہ گزارش ہے کہ فکشن کو فکشن ہی سمجھ کر پڑھا جائے۔ اگر کوئی واقعہ سچ یا کردار ''اصلی'' نظر آئے تو اسے محض سوء اتفاق تصور فرمائیے۔ تمام تر واقعات وکردار فرضی ہیں۔ البتہ جن مشاہیر کا ذکر جہاں کہیں '' بہ بدی'' یا بر بنائے تنقیص آیا ہے، اسے جھوٹ نہ سمجھا جائے۔ اتنا ضرور ہے کہ میں نے حتی الامکان منور حسین اور میاں احسان الٰہی کے مخصوص پیرایہ بیان اور انداز گفتگو کی لٹک ...... اور کہیں کہیں آپس کی نوک جھونک کے دوران شرار جستہ وفقرہ برجستہ ...... کو جوں کی توں برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

یوں بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ فکشن ہے یا سچی واردات یا ان دونوں کا ملغوبہ جسے آج کل Faction(Fact+Fiction) کہا جاتا ہے۔ ایک چینی دانا کا قول ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بلی سیاہ ہے یا سفید۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ چوہے پکڑ سکتی ہے یا نہیں۔

اس پس منظر کا ذکر و وضاحت مجھ پر اس لیے بھی واجب ہے کہ اس کتاب کا اصل محور' محرک اور باعث تصنیف ہر دو یاران رفتہ کی صحبت اور مطائبات تھے جو میری زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ صحبت یاراں میں ہر لمحے کو ایک جشن سمجھ کر گزارتے تھے۔ اس قرض اور نعمت عظمیٰ کا اخفا بددیانتی ہوگی۔

جس اُکھڑی اُکھڑی گفتگو کا اُوپر ذکر آیا ہے، اس کے کچھ ہی دن بعد میاں احسان الٰہی بھی اپنے رب سے جاملے اور دیس سونا کرگئے۔ اور اب میں ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے زیر زیرستی گیارہ سال لندن میں گزارنے کے بعد وطن کو مراجعت کی تیاری کررہا ہوں۔ ان کا گلہ اور خدشہ صحیح ثابت ہوا۔

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ذاتی ' ادبی' پیشہ ورانہ' سیاسی اور قومی اعتبار سے اس عشرہ رائگاں میں

زیاں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہ پایا۔ البتہ ملکوں ملکوں گھومنے اور وطن سے دور رہنے کا ایک بین فائدہ یہ دیکھا کہ وطن اور اہل وطن سے محبت نہ صرف بڑھ جاتی ہے بلکہ بے طلب اور غیر مشروط بھی ہو جاتی ہے۔

سفر کردم بہر شہری دویدم
بہ لطف و حسن تو کس راندیم ☆

نقصان یہ کہ ہر خبر اور افواہ جو اُدھر سے آتی ہے، دل دہلانے اور خون جلانے والی ہوتی ہے۔ پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔ یہ عمل دس گیارہ سال تک جاری رہے تو حساس آدمی کی کیفیت سیسمو گراف کی سی ہو جاتی ہے، جس کا کام ہی زلزلوں کے جھٹکے ریکارڈ کرنا اور ہمہ وقت لرزتے رہنا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری سیاست کا قوام ہی آتش فشاں لاوے سے اٹھا ہے۔

ع دن رات ہے اک زلزلہ تعمیر میں میری

لیڈر خود غرض، علما مصلحت بین، عوام خوف زدہ اور راضی برضائے حاکم، دانش ور خوشامدی اور ادارے کھوکھلے ہو جائیں (رہے ہم جیسے لوگ جو تجارت سے وابستہ ہیں تو مصرعہ ہے۔

ع کامل اس فرقہ تجار سے نکلا نہ کوئی

تو جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کو راہ دیتی چلی جاتی ہے۔ پھر کوئی طالع آزما آمر ملک کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے حالات پر نظر ڈالیے۔ ڈکٹیٹر خود نہیں آتا۔ لایا اور بلایا جاتا ہے۔ اور جب آجاتا ہے تو قیامت اس کے ہم رکاب آتی ہے۔ پھر وہ روایتی اونٹ کی طرح بدوؤں کو خیمے سے نکال باہر کرتا ہے۔ باہر نکالے جانے کے بعد کھسیانے بدو ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں۔ پھر ایک نایاب بلکہ عنقا شے کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنے سے زیادہ غبی اور تابعدار اونٹ تلاش کر کے اسے دعوت دینے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں، تاکہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے خیمے میں رہ سکیں۔ اور آقائے سابق الانعام یعنی پچھلے اونٹ پر تبرا بھیج سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈکٹیٹر سے زیادہ مخلص اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس معنی میں کہ وہ خلوص دل سے یہ سمجھتا ہے کہ ملک وملت سے جس طرح ٹوٹ کر وہ محبت کرتا ہے اور جیسی اور جتنی خدمت وہ تن تنہا کر سکتا ہے، وہ پوری قوم کے بوتے کا کام نہیں۔ وہ سچ مچ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہی نہیں، درماں بھی ہے۔ نیز اسی کی ذات واحد خلاصہ کائنات اور بلاشرکت غیرے۔ سرچشمہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اس کا ہر فرمان بمنزلہ صحیفہ سماوی ہے۔

☆ مطلب یہ کہ میں ملکوں ملکوں، شہروں شہروں گھوما۔ لیکن یہ تیرے لطف اور حسن کا فیضان ہے کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔

ع آتے ہیں غیب سے یہ فرامیں خیال میں

اس میں شک نہیں کہ اس کے پاس ان لامسائل (Non-Issues) اور فرضی قضیوں کا نہایت اطمینان بخش حل ہوتا ہے جو وہ خود اپنی جودت طبع سے کھڑے کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اخباری معمے (کراس ورڈ) بنانے والوں کی طرح پہلے وہ بہت سے حل اکٹھے کر لیتا ہے اور پھر اپنے ذہن معما ساز کی مدد سے ان سے آڑے ترچھے مسائل گھڑتا چلا جاتا ہے۔

رائے کی قطعیت اور اقتدار کی مطلقیت کا لازمی شاخسانہ یہ کہ وہ بندگانِ خدا سے اس طرح خطاب کرتا ہے جیسے وہ سب پتھر کے عہد کے وحشی ہوں۔ اور وہ انہیں ظلمت سے نکال کر اپنے دورِ ناخدائی میں لانے اور بن مانس سے آدمی اور آدمی سے انسان بنانے پر مامور من اللہ ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنی شیشہ پلائی ہوئی دیوار سے مخاطب رہتا۔ مگر قد آدم حروف میں اس پر لکھا ہوا نوشتہ اسے نظر نہیں آتا۔ مطلق العنانیت کی جڑیں دراصل مطلق الانانیت سے پیوست ہوتی ہیں۔ چنانچہ اوامر و نواہی کا انحصار اس کی جنبشِ ابرو پر ہوتا ہے۔ انصاف کی خود ساختہ ترازو کے اوراونچے نیچے پلڑوں کو اپنی تلوار کا پاسنگ، کبھی اس پلڑے اور کبھی س پلڑے میں ڈال کر برابر کر دیتا ہے۔

ع ہر کہ آمد عدالت نو ساخت

ایسی سرکار دولت مدار کو مابدولت مدار کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نقل کفر، کفر نہ باشد، مرزا عبدالودود بیگ تو (جو ابتدا میں ہر حکومت کی زور شور سے حمایت اور آخر میں اتنی ہی شدومد سے مخالفت کرتے ہیں) ایک زمانے میں اپنے کان پکڑتے ہوئے یہاں تک کہتے تھے کہ اللہ معاف کرے، میں تو جب اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رجیم سے یہی regime مراد ہے! نعوذ باللہ۔ ثم نعوذ باللہ۔

پھر جیسے جیسے امور سلطنت پر وفور تمکنت اور ہوس حکمرانی غالب آتی ہے، آمر اپنے ذاتی مخالفین کو خدا کا منکر اور اپنے چاکر ٹولے کے نکتہ چینوں کو وطن کا غدار اور دین سے منحرف قرار دیتا ہے۔ اور جو اس کے دست آہن پش پر بیعت میں عجلت سے کام نہیں لیتے، ان پر اللہ کی زمین کا رزق، اُس کی چھاؤں اور چاندنی حرام کر دینے کی بشارت دیتا ہے۔ ادیبوں اور تلامیذ الرحمٰن کو شاہی مطبخ کی بریانی کھلا کر یہ بتلاتا ہے کہ لکھنے والے کے کیا فرائض ہیں اور نمک حرامی کسے کہتے ہیں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ادب اور صحافت میں ضمیر فروش سے بھی زیادہ مفید مطلب ایک اور قبیلہ ہوتا ہے جسے مافی الضمیر فروش کہنا چاہیے۔ اس سے وہ تصدیق کراتا ہے کہ میرے عہد میں اظہار و ابلاغ پر کوئی قدغن نہیں۔ مطلب یہ کہ جس کا جی چاہے، جس زمین اور جس بحر میں قصیدہ کہے۔ قطعاً کوئی روک ٹوک نہیں۔ بلکہ وزن، بحر اور عقل سے خارج ہو تب بھی ہم حارج نہیں ہوں گے۔ بامتثال امر، قصائد نو کے انبار لگ

جاتے ہیں۔

ع روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ

جیسے اور دور گزر جاتے ہیں، یہ دور بھی گزر گیا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے خوف زدہ اور چڑھتے سورج کی پرستش کے اتنے عادی ہوگئے تھے کہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی سجدے میں پڑے رہے کہ نہ جانے پھر کب اور کدھر سے نکل آئے۔ کبھی کسی نے کولی بھر کے زبردستی کھڑا کرنا چاہا بھی تو معلوم ہوا کہ کھڑے نہیں ہوسکتے۔ جوڑ بند سب اکڑ کر رہ گئے ہیں۔ اور اب وہ اپنے تمام معمولات اور فرائض منصبی وغیر منصبی حالت سجود ہی میں ادا کرنے کے عادی وخوگر ہوگئے ہیں۔ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا۔

ارجنٹائن ہو یا الجزائر، ترکی ہو یا بنگلہ دیش یا عراق ومصر وشام اس دور میں تیسری دنیا کے تقریباً ہر ملک میں یہی ڈراما کھیلا جارہا ہے...... سیٹ، مکالے اور ماسک کی وقتی اور مقامی تبدیلیوں کے ساتھ۔

متذکرہ صدر دس تحریریں، جو اپنی ساخت، ترکیب اور دانستہ وآراستہ بے ترتیبی کے اعتبار سے، مونتاژ اور پھیلاؤ کے لحاظ سے ناول سے زیادہ قریب ہیں، اسی دور ضیاع کا تلخاب ہیں۔ ان میں سے صرف پانچ اس کتاب میں شامل ہیں۔ کہتے ہیں کسی نے امینول جوزف سائیز سے پوچھا کہ آپ نے انقلاب فرانس میں کون سا شان دار کارنامہ انجام دیا تو اس نے جو سہ لفظی جواب دیا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا "J'ai Vecu" (I survived) یعنی میں اپنے آپ کو بچالے گیا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں میں خود کو اپنے آپ سے بھی بچا پایا یا نہیں۔ وطن اور احباب سے گیارہ سال دوری اور مجبوری کا جو اثر طبیعت پر مرتب ہوتا ہے، اس کی پرچھائیاں آپ کو جہاں تہاں ان تحریروں میں نظر آئیں گی۔ یوں لندن بہت دلچسپ جگہ ہے۔ اور اس کے علاوہ بظاہر اور کوئی خرابی نظر نہیں آتی کہ غلط جگہ واقع ہے۔ تھوڑی سی بے آرامی ضرور ہے۔ مثلاً مطلع ہم وقت ابرو کہر آلود رہتا ہے۔ صبح اور شام میں تمیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے لوگ A.M اور P.M. بتانے والی ڈائل کی گھڑیاں پہنتے ہیں۔ موسم ایسا جیسے کسی کے دل میں بغض بھرا ہو۔ گھر اتنے چھوٹے اور گرم کہ محسوس ہوتا ہے کمرہ اوڑھے پڑے ہیں۔ پھر بقول ملک الشعرا فلپ لارگن یہ کیسی مجبوری کہ

"Nowhere to go but indoors!"

روشن پہلو یہ کہ شائستگی، رواداری اور بردباری میں انگریزوں کا جواب نہیں۔ مذہب، سیاست اور سیکس پر کسی اور کیسی بھی محفل میں گفتگو کرنا خلاف تہذیب اور انتہائی معیوب سمجھتے ہیں...... سوائے پب (شراب خانہ) اور بار کے! گمبھیر اور نازک مسائل پر صرف نشے کی حالت میں اظہار خیال

کرتے ہیں۔ بے حد خوش اطوار اور ہمدرد۔ کار والے اتنے خوش اخلاق کہ اکلوتے پیدل چلنے والے کو راستہ دینے کے لیے اپنی اور دوسروں کی راہ کھوٹی کر کے سارا ٹریفک روک دیتے ہیں۔ مرزا عبدالودود بیگ کہ سدا کے جذباتی ٹھہرے' سراہے اپنی اس توقیر سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ بے تحاشا جی چاہتا ہے زیرالائن پر ہی کھڑے ہوکر پہلے سب کو جھک جھک کر فرداً فرداً کورنش بجالائیں' پھر سڑک کراس کریں۔ مختصر یہ کہ کنج قفس میں اچھی گزرتی ہے۔

قفس میں کوئی اذیت نہیں مجھے صیاد
بس ایک حشر بپا بال و پر میں رہتا ہے

کوئی لکھنے والا اپنے لوگوں' ہم عصر ادیبوں' ملکی ماحول و مسائل' لوک روایت اور کلچر سے کٹ کر کبھی کوئی زندہ اور تجربے کی دہکتی کٹھالی سے ہوا فن پارہ تخلیق نہیں کرسکتا۔ برطانیہ میں رہنے والے ایشیائیوں میں سو میں سے ننانوے ان خوبصورت درختوں کے نام نہیں بتاسکتے جو ان کے مکانوں کے سامنے نہ جانے کب سے کھڑے ہیں۔ (رہا سواں آدمی' سو اس نے درختوں کو کبھی نوٹس ہی نہیں کیا) نہ ان رنگ برنگے پرندوں کے نام جو منہ اندھیرے اور شام ڈھلے ان پر چہچہاتے ہیں۔ اور نہ اس گرل فرینڈ کے بالوں کا شیڈ بتاسکتے ہیں جس کے ساتھ رات بھر بڑی روانی سے غلط انگریزی بولی ...... گولڈن آبرن' کاپر آبرن' ایش بلانڈ' چیسٹ نٹ براؤن' ہیزل براؤن' برگنڈی براؤن؟ ...... کچھ معلوم نہیں۔ ان کی خیرہ نگاہیں تو، جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو کے فلمی مقام پر آکر ٹھہر جاتی ہیں۔ غیر ملک کی زندگی اور معاشرے کا مشاہدہ اور اس کے مسائل کی تفہیم اور گرفت اتنی سرسری اور سطحی ہوتی ہے کہ کبھی میوزیم' آرٹ گیلری' تھیٹر' نائٹ کلب' سوہو کی شب تاب گلیوں کے طواف' ایسٹ اینڈ میں ذلت آمیز ''ملنگ' یا چیئرنگ کراس پر گاہن کی منتظر شب زادیوں کی عنایات عاجلہ سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ بہت تیر مارا تو برطانوی شہریت حاصل کرکے وہ رہی سہی عزت بھی گنوادی جو ٹورسٹ یا مہمان مزدور کی حیثیت سے حاصل تھی' یا بیک وقت برٹش پاسپورٹ اور ''ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام'' لینے کی غرض سے کسی انگریز عورت سے شادی کرلی اور اپنے حسابوں سارے انگلستان کی ازار بندی رشتے سے مشکیں کس دیں۔ نک سک اور نسلی اعتبار سے انگریزوں کا ''اسٹاک'' بہت اچھا ہے۔ قد کاٹھ' رنگ روپ اور تیکھے ترشے نقوش کے لحاظ سے ان کا شمار خوبصورتوں میں ہوتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ بدصورت انگریز عورت rarity (نایاب) ہے۔ بڑی مشکل سے نظر آتی ہے۔ یعنی ہزار میں ایک۔ پاکستانی اور ہندوستانی اسی عورت سے شادی کرتا ہے! لیکن انگریز عورت کو حبالۂ نکاح میں لانے سے نہ تو انگلستان فتح ہوتا ہے، نہ سمجھ میں آتا ہے بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، خود عورت بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ چنانچہ جلا وطن ادیب (خواہ اس نے بہتر تنخواہ اور بدتر سلوک کی

خاطر خود کو ملک بدر کیا ہو یا ذاتی اور سیاسی مجبوری کے تحت آسودہ حال جلاوطنی اختیار کی ہو) ہر پھر کر اُسی چھوڑی ہوئی منزل اور گزری ہوئی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے جسے مرورِ ایام، غربت اور فاصلے نے اب آوٹ آف فوکس کر کے گلیمرائز بھی کر دیا ہے۔ جلاوطن وہائٹ روسی ادیب اس کی بہترین مثال ہیں۔ لندن میں مقیم یا آباد اردو ادیبوں کا بھی کچھ ایسا ہی احوال ہوا۔

ع کوئی ان کی بزم جمال سے کب اٹھا' خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا

لندن میں اس راندۂ زرگاہ پر کیا گزری اور کیسے کیسے باب ہائے خرد افروز وا ہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے جس میں کچھ ایسے پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں جو، صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ اسے انشا اللہ جلد ایک علاحدہ کتاب کی شکل میں پیش کروں گا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ''زرگزشت'' کی اشاعت کے بعد ارادہ تھا کہ کوچہ سود خواراں میں اپنی خواری کی داستان آخری باب میں جہاں ختم ہوئی ہے، وہیں سے دوسری جلد کا آغاز کروں گا لیکن درمیان میں لندن، ایک اور بینک، ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف اور ''آب گم'' آپڑے۔ کچھ اندیشہ ہائے دور و دراز بھی ستانے لگے۔ مثلاً یہی کہ میرے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز یہ نہ سمجھیں کے بینکنگ کیریئر تو محض کیموفلاژ اور بہانہ تھا۔ دراصل یکم جنوری ۱۹۵۰ یعنی ملازمت کے روز اول ہی سے میری نیت میں فتور تھا۔ محض مزاح نگاری اور خودنوشت کے لیے سوانح اکٹھے کرنے کی غرض سے فقیر اس حرام پیشے سے وابستہ ہوا (وہ بھی کیا زمانہ تھا جب حرام پیسے کی صرف ایک ہی شکل ہوا کرتی تھی ...... سود!) دوسری حوصلہ شکن الجھن جو 'زرگزشت' حصہ دوم کی تصنیف میں مانع ہوئی، یہ تھی کہ یہ اردو فکشن کا سنہری دور ہے۔ آج کل اردو میں بہترین فکشن لکھی جا رہی ہے ...... خودنوشت اور سفرناموں کی شکل میں! افسانے اور ناول ان کی گرد کو نہیں پہنچتے۔ افسوس' میرے یہاں سوانح کا اتنا فقدان ہے کہ تادمِ تحریر، زندگی کا سب سے اہم واقعہ میری پیدائش ہے (بچپن کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر واقعہ یہ تھا کہ بڑا ہو گیا) اور غالباً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس پر میں کوئی تین ایکٹ کا سنسنی خیز ڈراما نہیں لکھ سکتا۔ تیسرا سبب خامہ خودبین و خود آرا کو روکے رکھنے کا یہ کہ اس اثنا میں لارڈ کوئنٹن کے تاثرات نظر سے گزرے۔ وہ ٹرینٹی کالج، آکسفورڈ کالج پریسیڈنٹ اور بورڈ آف برٹش لائبریری کا چیرمین ہے۔ علمی وادبی حلقوں میں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ذاتی کتب خانے میں بیس ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں خودنوشت سوانح عمری کو سوانح عمری کے ساتھ کبھی نہیں رکھتا۔ مزاح کی الماری میں رکھتا ہوں! عاجز اس کی ذہانت پر ہفتوں عش عش کرتا رہا کہ اس کی خودنوشت سوانح نوعمری زرگزشت پڑھے بغیر وہ زیرک اس نتیجے پر کیسے پہنچ گیا۔ ابھی اگلی ظرافت کے نمونے

پائے جاتے ہیں۔

اس مجموعے کے بیشتر کردار ماضی پرست، ماضی زدہ اور مردم گزیدہ ہیں۔ ان کا اصل مرض ناسٹل جیا ہے ...... زمانی اور مکانی، انفرادی اور اجتماعی ۔ جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ پرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہوجائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہوگیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جوانی لیوا حملہ کسی بھی عمر میں ...... بالخصوص جوانی میں ...... ہوسکتا ہے۔ اگر افیم یا ہیروین دستیاب نہ ہوتو پھر اسے یاد ماضی اور فینٹسی میں، جو تھکے ہاروں کی آخری پناہ گاہ ہے، ایک گونہ سرخوشی محسوس ہوتی ہے جیسے کچھ حوصلہ منداور جفاکش لوگ اپنے زوروبازو سے اپنا مستقبل بناتے ہیں، اسی طرح وہ زور تخیل سے اپنا ماضی آپ بنالیتا ہے۔ یادوں کا سرشور دریا دشت امروز میں بہتے بہتے خواب سراب کے آب گم میں اتر جاتا ہے۔ پھر اندر ہی اندر کہیں ابھرتی، گم ہوتی سوت ندیوں اور کہیں کاریزوں کی صورت، خیال بگولوں میں بوئی ہوئی کھیتی کی سینچتا رہتا ہے۔ اور کہیں اچانک کسی چٹان سے چشمہ آب زندگانی بن کے پھوٹ نکلتا ہے۔

کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلط کرلیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے جو قوم جتنی پسماندہ، درماندہ اور پست حوصلہ ہو، اس کو اپنا ماضی، معکوس اقلیدس تناسب (Inverse geometrical ratio) میں، اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ ہر آزمائش اور ادبار و ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب راجع ہوتی ہے اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعتاً تھا بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سرنو گھڑ اکر آراستہ پیراستہ کیا ہے...... ماضی تمنائی اس پاستان طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤسی رقص دیدنی ہتا ہے کہ مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں، اپنا جنگل بھی خود ہی پیدا کرتا ہے۔ ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا ہے اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ناسٹل جیا اسی لمحے کی داستان ہے۔

شکست خوردہ انا اپنے لیے کہاں کہاں اور کیسی کیسی پناہیں تراشتی ہے، یہ اپنے اپنے ذوق، ظرف، تاب ہزیمت اور طاقت فرار پر منحصر ہے...... تصوف، تقشف، مراقبہ، شراب، مزاح، سیکس، ہیروئن، ولیم تمنائی، فینٹسی (خواب نیم روز) ......جس کو جونشہ راس آجائے۔ آرنلڈ نے ہار جانے والے مگر ہار نہ ماننے والے، دھیان دھول میں لت پت مشرق کی ہار سہار کے بارے میں لکھا تھا:

The East bow'd low before the blaset
In patient, deep disdain
She let the legions thunder past

اور اس مغرور مراقبے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ خواب آور اور گہرا نشہ جو انسان کو حاضر و موجود سے بے نیاز کر دیتا ہے، خود اپنے لہو میں کسی خواب یا خیال کے فشار و آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بے خودی میسر آ جائے تو پھر سب گوارا' سب کچھ پذیرا۔

ع ہزار آشفتگی مجموعہ یک خواب ہو جائے

صاحب مراۃ الخیال سے روایت ہے کہ جب کفر و برہنگی کے الزام میں سرمد کو پا بجولاں شہادت گاہ لے جایا گیا تو وہ تیغ بکف جلاد کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور گویا ہوا " فدائے تو شوم! بیا بیا کہ تو بہر صورتے می آئی من ترا خوب می شناسم" (۱) پھر یہ شعر پڑھا اور سر تلوار کے نیچے رکھ کر ابدی نیند سو گیا۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ، غنودیم (۲)

قدیم زمانے میں چین میں دستور تھا کہ جس شخص کا مذاق اڑانا مقصود ہوتا' اس کی ناک پر سفیدی پوت دیتے تھے۔ پھر وہ دکھیا کتنی بھی گمبھیر بات کہتا، کلاؤن ہی لگتا تھا۔ کم و بیش یہی حشر مزاح نگار کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی فولس کیپ (۳) اتار کر پھینک بھی دے تو لوگ اسے جھاڑ پونچھ کر دوبارہ پہنا دیتے ہیں۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ کوچہ سود خواراں میں سر پر دستار رہی یا نہیں، تاہم آپ اس کتاب کا موضوع، مزاج اور ذائقہ مختلف پائیں گے۔ موضوع اور تجربہ خود اپنا پیرایہ اور لہجہ متعین کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال خدا کے حضور مسلمانوں کا شکوہ اپنے استاد فصیح الملک داغ دہلوی کی نخرے چونچلے کرتی زبان میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ رسوا کی امراؤ جان ادا اور طوائفوں سے متعلق منٹو کے افسانوں کا ترجمہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کی جناتی زبان (۴) میں کر کے انہیں (طوائفوں کو) بالجبر سنایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ایک ہی صفحہ سن کر کان پکڑ لیں اور اپنے دھندے سے تائب ہو جائیں۔ وہ تو وہ، خود ہم اپنے طرز نگارش و معاش سے توبہ کر لیں کہ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ بہرکیف' اس بار موضوع' مواد اور مشاہدات سب قدرے مختلف تھے۔ سو وہی لکھا جو دیکھا۔ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔

قصہ گو قلندر کو اپنی عیاری یا راست گفتاری کا کتنا ہی زعم ہو' اور اس نے اپنا سر کتنا ہی باریک کیوں نہ ترشوا رکھا ہو' بافندگانِ حرف و حکایت کی پرانی عادت ہے کہ کہانی کا تانا بانا بُنتے بُنتے اچانک اس کا رنگ' رُخ اور ذائقہ بدل دیتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہانی کہتے کہتے خود کہانی کہنے والے کو کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ پھر یہ نہیں رہتا کہ جو تھا۔ سو کچھ ایسی ہی واردات اس نامہ سیاہ راقم سطور

---

(۱) مطلب یہ کہ میں تجھ پر قربان جاؤں۔ تو آ اور جلد آ کہ تو جس بھیس میں بھی آئے، میں تجھے خوب پہچانتا ہوں۔
(۲) ایک شور بپا ہوا اور ہم نے خواب عدم سے آنکھ کھولی۔ دیکھا کہ شب فتنہ ابھی باقی ہے تو ہم پھر سو گئے۔
(۳) فولس کیپ: کلاؤن یا مسخرے کی ٹوپی (۴) اس کا ایک نمونہ "حویلی" کے باب سوم میں ملاحظہ فرمائیے۔

کے ساتھ ہوئی۔ وانه هو اضحک و ابکی (۵)

چنگ راگیرید از دستم کہ کار از دست رفت

نغمہ ام خوں گشت و از رگہائے ساز آید بروں (۶)

یہ نہ ادعا ہے، نہ اعتذار، فقط گزارشِ احوالِ واقعی ہے۔

بحمد اللہ! میں اپنی طبعی اور ادبی عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں انسان تحسین اور تنقیص دونوں سے اس درجہ مستغنی ہو جاتا ہے کہ ناکردہ خطاؤں تک کا اعتراف کرنے میں حجاب محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ اب مجھے ''کسے کہ خنداں نہ شد از قبیلہ مانیست'' پر اصرار کے باوجود یہ اقرار کرنے میں خجالت محسوس نہیں ہوتی کہ میں طبعاً، اصولاً اور عادتاً یاس پسند اور بہت جلد شکست مان لینے والا آدمی ہوں۔ قنوطیت غالباً مزاح نگاروں کا مقدر ہے۔ مزاح نگاری کے باوا آدم ڈین سوفٹ پر دیوانگی کے دورے پڑتے تھے اور اس کی یاس پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنی پیدائش کو ایک المیہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اپنی سالگرہ کے دن بڑے التزام سے سیاہ ماتمی لباس پہنتا اور فاقہ کرتا تھا۔ مارک ٹوین پر بھی اخیر عمر میں کلبیت طاری ہو گئی تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان مشاہیر محتشم سے تمہاری مماثلت بس اسی حد تک ہے۔ بہر حال، قبل از وقت مایوس ہو جانے میں ایک فائدہ یہ دیکھا کہ ناکامی اور صدمے کا ڈنک اور ڈر پہلے ہی نکل جاتا ہے۔ بعض نامور پہلوانوں کے گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ ہونہار لڑکے کے بزرگ اس کے کان بچپن میں ہی توڑ دیتے ہیں، تاکہ آگے چل کر کوئی نابکار مخالف پہلوان توڑنے کی کوشش کرے تو ذرا تکلیف نہ ہو۔ مزاح کو میں دفاعی میکنزم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار نہیں، اُس شخص کا زرہ بکتر ہے جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے پہن لیتا ہے۔ زین بدھ ازم میں ہنسی کو گیان کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو اونچ نیچ کا سچا گیان اس سے پیدا ہوتا ہے جب کھمبے پر چڑھنے کے بعد کوئی نیچے سے سیڑھی ہٹا لے۔ مگر ایک کہاوت یہ بھی سنی کہ بندر پیڑ کی پھننگ پر سے زمین پر گر پڑے تب بھی بندر ہی رہتا ہے۔

''حویلی'' کی کہانی ایک متروکہ ڈھنڈار حویلی اور اس کے مغلوب الغضب مالک کے گرد گھومتی ہے۔ ''اسکول ماسٹر کا خواب'' ایک دُکھی گھوڑے، حجام اور منشی سے متعلق ہے۔ ''شہر دو قصہ'' ایک چھوٹے سے کمرے اور اس میں پچھتر سال گزار دینے والے سنکی آدمی کی کہانی ہے ''دھیرج گنج کا پہلا یادگار شاعر'' میں ایک قدیم قصباتی اسکول اور اس کے ایک ٹیچر اور بانی کے کیری کیچور ☆ پیش کئے

---

(۵) اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور وہی رُلاتا ہے۔ قرآن مجید۔ ۲۷ قال فما خطبکم۔ النجم ۵۳

(۶) میرے ہاتھ سے ساز لے لو کہ میرا کام تمام ہو چکا۔ میرا نغمہ خون ہو کر ساز کے تاروں سے بہہ نکلا ہے۔

☆ کیری کیچور: مسخاکے۔ (مسخ خاکے)

گئے ہیں۔ اور ''کار'' کابلی والا اور الہ دین بے چراغ'' ایک کھٹارا کار' ناخواندہ پٹھان آڑھتی اور شیخی خورے اور لپاڑی ڈرائیور کا حکایتی طرز میں ایک طویل خاکہ ہے۔ ان میں جو کردار مرکزی' ثانوی یا محض ضمنی حیثیت سے ابھرتے ہیں' وہ سب کے سب اصطلاحاً بہت ''عام'' اور سماجی رتبے کے لحاظ سے بالکل ''معمولی'' ہیں۔ اسی لیے خاص التفات اور تامل چاہتے ہیں۔ میں نے زندگی کو ایسے ہی لوگوں کے حوالے سے دیکھا' سمجھا' پرکھا اور چاہا ہے۔ اسے اپنی بدنصیبی ہی کہنا چاہیے کہ جن ''بڑے'' اور ''کامیاب'' لوگوں کے قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا' انہیں بحیثیت انسان بالکل ادھورا' گرہ دار اور یک رُخا پایا۔ کسی دانا کا قول ہے کہ جس کثیر تعداد میں قادرِ مطلق نے عام آدمی بنائے ہیں' اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں بنانے میں اسے خاص لطف آتا ہے' وگرنہ اتنے سارے کیوں بناتا۔ اور قرن باقرن سے کیوں بناتا چلا جاتا۔ جب ہمیں بھی یہ اتنے ہی اچھے اور پیارے لگنے لگیں تو جاننا چاہیے کہ ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ یہ ایسے ہی عام انسانوں کا تذکرہ ہے۔ ان کی الف لیلیٰ ایک ہزار ایک راتوں میں بھی ختم نہیں ہوسکتی کہ' ہے ہراک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ۔

ممکن ہے بعض طبائع پر جزئیات کی کثرت اور ''پلاٹ'' کا فقدان گراں گزرے۔ میں نے پہلے کسی اور ضمن میں عرض کیا ہے کہ پلاٹ تو فلموں' ڈراموں' ناولوں اور سازشوں میں ہوتا ہے۔ ہمیں تو روزمرہ کی زندگی میں دور دور اس کا نشان نہیں ملا۔ رہی جزئیات نگاری اور باریک بینی تو اس میں فی نفسہ کوئی عیب نہیں۔ اور نہ خوبی۔ جزئیات اگر محض خوردہ گیری پر مبنی نہیں' اور سچی اور جاندار ہیں تو اپنی کہانی اپنی زبانی کہتی چلی جاتی ہیں۔ انہیں توڑ مروڑ کر افسانوی سانچے میں ڈھالنے یا کسی آدرشی شکنجے میں کسنے کی ضرورت نہیں۔ گگول' چیخف اور کلاڈ سیمون زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اپنے کینوس پر بظاہر بڑی لاپروائی سے بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ پروست نے ایک پورا ناول ایک ڈنر پارٹی کی تفصیل بیان کرنے میں لکھ دیا جو یادوں کے total recall (مکمل بازآفرینی) کی بہترین مثال ہے (+) انگریزی کے عظیم ترین (بغیر پلاٹ کے) ناول Ulysses کی کہانی ۱۶؍جون ۱۹۱۶ کو صبح آٹھ بجے شروع ہو کر اسی دن ختم ہو جاتی ہے۔ یوجین اونیل کے ڈرامے Long Day's Journey Into Night کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ ان شاہکاروں کا حوالہ دینے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر میری کچھ بات نہیں بنی تو یہ تکنیک کا قصور نہیں' سراسر میری کم سوادی اور بے ہنری ہے کہ پیڑ گنتا رہ گیا' جنگل کا سماں نہ دکھلا سکا۔ آبشار نیاگرا کی ہیبت اور بلندی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھنا ضروری ہے۔ میں جتنی بار اوپر دیکھتا ہوں' کلاہ

(+) ہم نے ''یادوں کی برات'' کا قصداً ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس میں دولہا براتیوں کے کاندھے پر سوار' انہیں چھوہاروں سے مارتا' اپنی شہنائی آپ بجاتا جاتا ہے۔ آرسی مصحف کے دوران' آئینے میں اپنی ہی صورت دیکھ کر ہزار جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے۔ دُلہن کا چہرہ اُسے نظر ہی نہیں آتا۔ اس کے بعض کرداروں کے نام اور کارنامے آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔

پندار قدموں پر آن پڑتی ہے۔

یہاں ایک ادبی بدعت اور بدمذاقی کی وضاحت اور معذرت ضروری سمجھتا ہوں۔ فارسی مصرعوں اور اشعار کے معنی فٹ نوٹ یا قوسین میں دینے کی دو وجہیں ہیں۔ اولاً' نئی نسل کے پڑھنے والوں کو ان کے معنی معلوم نہیں۔ دوم، خود مجھے بھی معلوم نہیں تھے۔ تفصیل اس اجمال پر ملال کی یہ کہ عاجز نے باقاعدہ فارسی صرف چار دن چوتھی جماعت میں پڑھی تھی اور ''آمد نامہ'' کی گردان سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ ڈرائینگ لے لی۔ ہر چند کہ اس میں گردان نہیں تھی' لیکن مقاماتِ آہ و فغاں کہیں زیادہ نکلے۔ اس میں میٹرک تک میری مہارت صراحی اور طوطا بنانے سے آگے نہ بڑھ پائی۔ اور میں ہر دو اشیا ڈرائینگ میں اسپشلائز کرنے سے پہلے بھی بالکل ویسی ہی بنا سکتا تھا۔ ڈرائینگ ماسٹر کہتا تھا کہ تم اپنا نام اتنی محبت اور محنت سے لکھتے ہو اور تمہاری lettering (حرف کشی) اتنی خوبصورت ہے کہ تمہیں فیل کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر تم اسکیچ کے نیچے یہ لکھو کہ یہ انگور کی بیل ہے تو تمہیں گھڑونچی بنانے کے سو میں سے سو نمبر ملیں۔

تین کرم فرما ایسے ہیں جو بخوبی جانتے ہیں کہ میں فارسی سے نابلد ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے خطوط اور گفتگو میں صرف فارسی اشعار سے میری چاند ماری کرتے ہیں۔ دس بارہ برس تو میں ستائشی حیرت' دوستانہ درگزر اور مودّبانہ نافہمی کے عالم میں یہ سب کچھ جھیلتا رہا۔ پھر اوسان درست ہوئے تو یہ وتیرہ اختیار کیا کہ اپنے جن احباب کے بارے میں مجھے بخوبی علم تھا کہ فارسی میں ان کی دست گاہ میرے برابر (یعنی صفر) ہے' انہیں ان اشعار سے ڈھیر کرنے لگا۔ اس عمل سے میری توقیر اور رعبِ فارسی دانی میں دس گنا اضافہ اور لطف صحبت اور مراسلت میں رُسہ قدر کمی واقع ہوگئی۔ اس کتاب میں فارسی کے جو اشعار یا مصرعے جہاں تہاں نظر آئیں وہ ان ہی تین کرم فرماؤں کے بے طلب عطایا میں سے ہیں۔ یہ ہیں درویش بے ریا و ریش برادرم منظور الٰہی شیخ (مصنف در دلکشا اور سلسلۂ روز و شب) جو پرسش حال کے لیے بصرف کثیر لاہور کے لندن انٹرنیشنل کال بھی کریں تو پہلے علالت و عیادت سے متعلق فارسی اشعار سناتے ہیں۔ پھر میری فرمائش پر ان کا اردو ترجمہ و تشریح۔ اتنے میں وقت ختم ہو جاتا ہے اور آپریٹر لائن کاٹ دیتا ہے۔ دوسرے دن وہ مجھے معذرت اور فارسی اشعار سے لبریز خط لکھتے ہیں کہ معاف کیجئے' کل سارا وقت ترجمے میں ہی ضائع ہو گیا۔ میں نے ٹیلی فون دراصل یہ پوچھنے کے لیے کیا تھا کہ آپ کا آپریشن کس چیز کا ہوا تھا۔ اور اب طبیعت کیسی ہے۔ جب سے سنا ہے بہت تردد ہے۔ وقت ضائع کرنے پر سعدی نے کیا خوب کہا ہے ......مگر بیدل نے اسی مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا واہ وا!

دوسرے کرم فرما ہیں ڈاکٹر ضیا الدین شکیب کہ جب بھی برٹش لائبریری جاتے ہیں' بک اسٹال کے ایک خوبصورت اور سمجھ میں آنے والا تصویری پوسٹ کارڈ خریدتے ہیں۔ پھر اس پر فیضی' بیدل یا

طالب آملی کے شعر سے پانی پھیر کر مجھے پوسٹ کر دیتے ہیں۔ اور تیسرے ہیں حبیب لبیب و صاحب طرز ادیب محبی مختار مسعود جو عاجز کے وسیع و عمیق علمی خلا کو پُر کرنے میں رُبع صدی سے جتے ہوئے ہیں۔ اپنے دل پسند موضوعات پر گھنٹوں ہمارے آگے بین بجاتے اور مجبوراً خود ہی جھومتے رہتے ہیں۔ کئی بار ان سے پوچھا' حضور والا' آپ کو یہ کیسے پتا چل جاتا ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں؟ مگر وہ کسر نفسی سے کام لیتے ہیں۔ خود ذرا کریڈٹ نہیں لیتے۔ بس آسمان کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ اور اسی انگلی سے اپنا کان توبہ کے انداز میں پکڑ کر اگر بیٹھے ہوں تو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہوں تو بیٹھ جاتے ہیں۔ انکسار و استغفار کے مخلوط اظہار کے لیے یہ ان کی ادائے خاص ہے، جس کے دوست دشمن سب قتیل ہیں۔

فارسی اشعار کے جو معنی آپ حواشی میں ملاحظہ فرمائیں گے، وہ ان ہی کرم فرماؤں سے پوچھ کر لکھ دیے ہیں تا کہ سند رہے اور بھو جاؤں تو دوبارہ ان سے رجوع نہ کرنا پڑے۔ خصوصاً مختار مسعود صاحب سے کہ جب سے وہ آر۔ سی۔ ڈی کے سلسلے میں ترکی کے سرکاری پھیرے لگا آئے ہیں اور مزار پیر رومی کے نواح میں درویشوں کا والہانہ رقص بچشم حیراں دیکھ آئے ہیں' فارسی اشعار کا مطلب ہمیں ترکی کے حوالے سے سمجھانے لگے ہیں۔ یوں تو ہم اپنے ایک اور دیرینہ کرم فرما' پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے' بی ٹی سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ آسان شعر کو بھی اپنے علم کے زور اور وفور سے نا قابل فہم بنا دیتے ہیں۔

آساں ز توجہ تو مشکل
مشکل ز تجاہل تو آساں (+)

سچ تو یہ ہے کہ فارسی شعر کی مار آج کے قاری سے سہی نہیں جاتی۔ بالخصوص اس وقت جب وہ بے محل بھی ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو نثر کا آرائشی فریم صرف اپنے پسندیدہ فارسی اشعار ٹانگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اشعار بے محل نہیں ہوتے، ملحقہ نثر بے محل ہوتی ہے۔ وہ اپنی نثر کا تمام تر ریشمی کوکون (کویا) اپنے گاڑھے گاڑھے لعابِ ذہن سے فارسی شعر کے گرد بُنتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ریشم حاصل کرنے کا زمانۂ قدیم سے ایک ہی طریقہ چلا آتا ہے۔ کوئے کو ریشم کے زندہ کیڑے سمیت کھولتے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جب تک وہ مر نہ جائے، ریشم ہاتھ نہیں لگتا۔

مرزا کہتے ہیں کہ کلام غالب کی سب سے بڑی مشکل اس کی شرحیں ہیں۔ وہ نہ ہوں تو غالب کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں غالب واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو

(+) معذرت کے ساتھ۔ ''آسان'' اور ''مشکل'' کی ترتیب الٹی کر دی ہے۔
تحریف کے بعد مطلب یہ کہ تیری توجہ سے تو آسان بات بھی مشکل بن جاتی ہے۔ اور تجھ سے رجوع نہ کریں تو مشکل بات بھی آسان ہو جاتی ہے۔

دُگنا مزہ دیتا ہے۔

خدا ان تین عالموں کے درمیان اس فقیر پر تقصیر کو سلامت بے کرامت رکھے۔ جب سے میری صحت خراب ہوئی ہے، ان کی طرف سے متردد رہتا ہوں۔ کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد۔

ایک دفعہ میں نے منظور الٰہی صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے اپنی دونوں کتابوں میں فارسی کے نہایت خوبصورت اشعار نقل کیے ہیں۔ لیکن میری طرح' قارئین کی نئی نسل بھی فارسی سے نابلد ہے۔ یوں ہی شُد بُد اور انکل سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ اگر اگلے ایڈیشن میں بریکٹ میں ان کا مطلب اُردو میں بیان کر دیں تو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے' بند ہونٹوں سے اپنے دلآویز انداز میں مسکرائے۔ فرمایا' مگر بھائی صاحب' پھر مقصد فوت ہو جائے گا۔

اس پر مرزا کہنے لگے ''تم نے اس کتاب میں جو ڈھیر سارے انگریزی الفاظ بے دھڑنگ (مرزا بے درنگ کا یہی تلفظ کرتے ہیں جو ان کے منہ سے بھلا معلوم ہوتا ہے) استعمال کیے ہیں' ان پر بھی یہی فقرہ چست کیا جا سکتا ہے۔ انگریز تو دوسری زبانوں کے الفاظ خاص خاص موقعوں پر دانستہ اور مصلحتاً استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے کھانے پھیکے سیٹھے اور بدمزہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اعلیٰ ریستورانوں میں ان کے نام ہمیشہ فرنچ میں دیے جاتے ہیں۔ فرنچ آج بھی شائستگی اور سوفسٹی کیشن کی زبان تصور کی جاتی ہے۔ لہٰذا انگریزوں کو کوئی آرٹسٹک یا ناشائستہ بات کہنی ہو تو جھٹ فرنچ فقرے کا گھونگھٹ نکال لیتے ہیں۔ تمھیں تو معلوم ہوگا کہ سیمول پیپس (۱۷۰۳-۱۶۳۳) نے اپنی شہرہ آفاق ڈائری (جس میں اس نے اپنی آوارگیوں اور شبینہ فتوحات کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے) شارٹ ہینڈ میں لکھی تھی تاکہ اس کے ملازم نہ پڑھ سکیں۔ جہاں کوئی ایسا نازک مقام آتا جسے انگریز اپنی روایتی کسر بیانی (Understatement) سے کام لیتے ہوئے، naughty کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں تو وہ اس واردات کا اندراج فرنچ میں کرتا تھا۔ لیکن جہاں بات اتنی ناگفتنی ہو...... جو کہ اکثر ہوتی تھی ...... کہ فرنچ زبان بھی سلگ اٹھے تو وہ اس رات کی بات کو بلا کم و کاست ہسپانوی زبان میں قلم بند کرتا تھا۔ گویا یہ ہوئی لسانی درجہ بندی باعتبار مدارج بوالہوسی۔ اب ذرا علوم کی طرف نگاہ کیجیے۔ انگریزوں نے درختوں اور پودوں کے نام اور بیشتر قانونی اصطلاحیں جوں کی توں لاطینی سے مستعار لی ہیں۔ دانائی کی باتیں وہ بالعموم یونانی زبان میں الٹے واوین کے اندر نقل کرتے ہیں تاکہ کوئی انگریز نہ سمجھ پائے۔ اوپیرا کے پکے گانوں کے لیے اٹالین اور فلسفہ کی ادق اصطلاحات کے لیے جرمن زبان کو ترجیح دے کر نا قابلِ فہم کو نا قابلِ برداشت بنا دیتے ہیں۔''

اس طولانی تمہید کے بعد فرمایا ''لیکن ہم انگریزی کے الفاظ صرف ان موقعوں پر استعمال کرتے

ہیں جہاں ہمیں یقین ہو کہ اس مفہوم کو اُردو میں کہیں بہتر طریقے سے ادا کیا جاسکتا ہے۔''

اس بروقت تنبیہ کے باوجود آپ کو انگریزی الفاظ جا بجا نظر آئیں گے۔ سبب یہ کہ یا تو مجھے ان کے اُردو مترادفات معلوم نہیں۔ یا وہ کسی رواں دواں مکالمے کی بنت میں پیوست ہیں۔ بصورت دیگر بہت مانوس اور عام فہم ہونے کے علاوہ اتنے غلط تلفظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں کہ اب انہیں اُردو ہی سمجھنا چاہیے۔ کوئی انگریز انہیں پہچاننے یا اپنانے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

''اسکول ماسٹر کا خواب'' اور ''دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ'' پر محبّ و مشفق دیرینہ محمد عبدالجمیل صاحب نے بکمال لطف و توجہ نظر ثانی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ جیسے نفاست پسند اور منکسر مزاج وہ خود تھے ویسے ہی دھیمے ان کے اعتراضات تھے جو انہوں نے میرے مسودے کے حاشیے پر اتنی ہلکی پنسل سے نوٹ کیے تھے کہ انگلی بھی پھیر دیں تو مٹ جائیں۔ کچھ ایسی غلطیوں کی نشاں دہی بھی کی جن کی اصلاح پر خامہ ہذیاں رقم کسی طور آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مثلاً میں نے ایک ترش مکالمے کے دوران گجراتی سیٹھ سے کہلوایا تھا ''ہم اس سالے لنگڑے گھوڑے کو لے کے کیا کریں گا؟'' جمیل بھائی کی لکھنوی شائستگی اس کی متحمل نہ ہوئی۔ تادیباً پورا جملہ تو نہیں کاٹا' صرف سالے کو قلم زد کر کے اس کے اوپر برادر نسبتی لکھ دیا! پھر فرمایا کہ ''حضرت' یہ ہک دک کیا ہوتا ہے؟ ہکا بکا لکھیے۔ ہمارے یہاں ہک دک نہیں بولا جاتا۔'' عرض کیا ''ہکا بکا میں صرف پھٹی پھٹی آنکھیں اور کھلا ہوا منہ نظر آتا ہے' جب کہ ہک دک میں ایسا لگتا ہے جیسے دل بھی دھک سے رہ گیا ہو''۔ فرمایا ''تو پھر سیدھے سبھاؤ دھک کرنے لگا کیوں نہیں لکھتے؟ اور ہاں! مجھے حیرت ہے کہ ایک جگہ آپ نے لوطی لکھا ہے! زلّتِ قلم ہی کہوں گا۔ معاف کیجیے۔ یہ لفظ آپ کے قلم کو زیب نہیں دیتا''۔

پوچھا ''تو پھر آپ کے ہاں لوطی کو کیا کہتے ہیں؟''

فرمایا ''کچھ نہیں کہتے''۔

میں زور سے ہنس دیا تو چونکے۔ دوسرے پہلو پر خیال گیا تو خود بھی دیر تک ہنستے رہے۔ رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے ''ایسا ہی ہے تو اس کی جگہ 'بدتمیز' لکھ دیجیے۔ تہذیب کا تقاضا یہی ہے''۔ یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس لیے کہ میں نے یہ لفظ (بدتمیز) دوسرے ابواب میں تین چار جگہ ایسے لوگوں کے بارے میں استعمال کیا تھا جو صرف لغوی معنی میں بدتمیزی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس نئے مہذب مفہوم کے ساتھ تو وہ مجھ پر بہتان طرازی اور ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلا سکتے تھے۔

کچھ دیر بعد کلف لگے ململ کے کرتے کی آستین اُلٹ کر مسودّے کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے ''دواب خانہ' سنگوٹیاں' آر اور جوجھنا شرفائے لکھنو نہیں بولتے'' عرض کیا ''میں نے اسی لیے

لکھے ہیں''۔ پھڑک اٹھے۔ کہنے لگے''بہت دیر بعد آپ نے ایک سمجھ داری کی بات کہی۔'' پھر اس خوشی میں سگرٹ سے سگرٹ سلگاتے ہوئے بولے''مگر مشتاق صاحب، یہ بوک کیا ہوتا ہے؟ ہم نے نہیں سنا۔'' عرض کیا''جوان اور مست بکرا جس سے نسل کشی کے سلسلے میں رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کے داڑھی ہوتی ہے اور جسم سے سخت بدبو آتی ہے۔ گوشت بھی بساندہ اور ریشے دار۔'' فرمایا'' واللہ! ہم نے یہ لفظ ہی نہیں، ایسا بکرا بھی نہیں دیکھا۔ لفظ، مفہوم اور اس کے گوشت تینوں سے کراہت آتی ہے۔ متلی ہے۔ آپ اس کی جگہ کوئی اور کم بدبو دار جانور استعمال نہیں کر سکتے؟ کراچی میں اس لفظ کو کون سمجھے گا۔'' عرض کیا''وہی جو مقئی (قے آور) کو سمجھے گا۔ آپ تو غالب کے حافظ ہیں۔ آپ کو تو یہ لفظ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ضد کا غالب نے عجیب سیاق وسباق میں ذکر کیا ہے۔ علائی کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ تم خصی بکروں کے گوشت کے قلیے اڑا رہے ہوگے۔ لیکن بخدا میں تمہارے پلاؤ قلیے پر رشک نہیں کرتا۔ خدا کرے تمہیں بیکانیر کی مصری کا ٹکڑا میسر نہ آیا ہو۔ جب یہ تصور کرتا ہوں کہ میرجان صاحب اس مصری کے ٹکڑے کو چبا رہے ہوں گے تو رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔ تحقیق طلب امر یہ کہ اس مصری کی ڈلی سے دراصل غالب کی کیا مراد تھی۔ محض مصری؟ سو وہ تو اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی، دلی میں منوں دستیاب تھی۔ حیرت ہے محققین وشارحین کی طبع بدگماں ادھر نہیں گئی، حالاں کہ غالب نے مصری کے تلازمے کو عشق عاشقی کے ضمن میں ایک دوسرے خط میں بھی استعمال کیا ہے''

فرمایا''جا چھوڑ دیا حافظ دیوان سمجھ کر۔ لیکن حضرت، یہ روہڑ کس زبان کا لفظ ہے؟ کریہہ الصوت۔ بالکل گنوارو لگتا ہے۔ کیا راجستھانی ہے؟'' عرض کیا''خود ہمیں بھی یہی شبہ ہوا تھا۔ لہٰذا ہم نے ماجد بھائی سے پوچھا......''

''کون ماجد بھائی؟''

''ماجد علی صاحب۔ سابق سی ایس پی۔ لندن منتقل ہوگئے ہیں۔ چھوٹے بڑے، اپنے بیگانے، باس اور ماتحت ...... سب انہیں ماجد بھائی کہتے ہیں، سوائے ان کی بیگم زہرا نگار کے۔ وہ انہیں ماجد چچا کہتی ہیں۔ ان سے رجوع کیا تو انہوں نے تصدیق کردی کہ لحاف کی پرانی روئی کو، جسے غریب غربا ہاتھوں سے توم کے دوبارہ استعمال کرتے ہیں، روہڑ کہتے ہیں۔

یوں تو وہ عاجز کے لیے پیر ومرشد کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا فرمایا ہوا ہمیشہ مستند ہی ہوتا ہے، تاہم میں نے مزید تشفی کے لیے پوچھا''کیا بداؤں میں بھی بولا جاتا ہے؟'' چہرے پر ایک بناوٹی خشونت اور لہجے میں خفیف سے مصنوعی لکنت پیدا کرتے ہوئے جو بحثا بحثی میں عصائے موسوی کا کام کرتی ہے، بولے''دیکھیے، ذاتی بے تکلفی اپنی جگہ۔ علمی مباحث اپنی جگہ، بدایوں کو بداؤں کہنے کا حق

صرف بدایوں والوں کو پہنچتا ہے۔ مثلاً یوں سمجھیے کہ کل کلاں کو آپ مجھے ماجد بھائی کی بجائے ماجد چچا کہنے لگیں تو لندن پولیس مجھے پولی گیمی (تعدد ازواج) میں دھر لے گی۔ آپ کا تو مزید کچھ نہیں بگڑے گا۔ بہر کیف، روہڑ صحیح ہے۔ بداؤں میں تو پھیری والے گھر گھر صدا لگا کے روہڑ خریدتے تھے اور اس کے دبلے ریوڑیاں دیتے تھے جنہیں اندھے آپس میں بانٹ لیتے تھے۔'' علمی تحقیق و تدقیق کا جذبہ اب مجھے اس مقام پر لے آیا تھا جہاں مزید سوال کرنا گویا اپنی دستارِ فضیلت سے خود فٹ بال کھیلنے کے مترادف تھا۔ ماجد بھائی کی بذلہ سنجی کے سامنے اچھے اچھے نہیں ٹھہر پاتے۔ راویِ غیبت بیان کہتا ہے کہ ایک دفعہ ان کے باس (وزیر) کے دفتر کے سامنے' کچھ دُور پر لوگ عزت مآب کے خلاف ''ایوب خاں کا چمچہ! ایوب خاں کا چمچہ!'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ وزیر موصوف نے ماجد بھائی سے پوچھا ''یہ لوگ کیوں شور مچا رہے ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا ''سر' کٹلری کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں''۔

جمیل صاحب اس طویل تشریح اور معتبر سند سے کچھ پسیجے۔ ناک سے سگرٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے بولے ''اگر آپ کو صاف روئی سے الرجی ہے تو روہڑ بھی چلے گا۔ لیکن ایک بات ہے۔ متروکات آپ کو بہت 'فیسی نیٹ' کرتے ہیں۔ خیر، مجھے تو اچھے لگتے ہیں۔ کس واسطے کہ مجھے انٹیک جمع کرنے کا شوق ہے۔ لیکن ممکن ہے پڑھنے والوں کو اتنے اچھے نہ لگیں۔ بریکٹ میں معنی لکھ دیجیے گا''۔

عرض کیا ''مرزا اکثر طعنہ دیتے ہیں کہ 'تم ان معدودے چند لوگوں میں سے ہو جنہوں نے متروکہ جائیداد کا کوئی کلیم داخل نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ چلتے وقت تم اپنے ساتھ متروکات کا دفینہ کھود کر' سمو چا ڈھو کر پاکستان لے آئے!' تفنن برطرف' اگر ان میں سے ایک لفظ' جی ہاں' صرف ایک لفظ بھی دوبارہ رائج ہو گیا تو سمجھوں گا عمر بھر کی محنت سوارت ہوئی''۔

بولے ''پھر وہی!''

افسوس' جمیل صاحب صرف دو ابواب دیکھ پائے تھے کہ ان کا بلاوا آ گیا۔ اب ایسا نکتہ داں' نکتہ سنج' نکتہ شناس کہاں سے لاؤں جس کا اعتراض بھی نکتہ پروری' استعداد آفرینی اور دل آسائی سے خالی نہ تھا۔

آخر میں اپنی شریک (سوانح) حیات ادریس فاطمہ کا شکریہ بھی لازم ہے کہ انہوں نے اپنے تبسم سقم شناس سے بہت سی خامیوں کی نشان دہی کی۔ تاہم بے شمار سخن ہائے سوختنی اور غلطی ہائے مضامین بوجوہ باقی رہ گئی ہوں گی۔ وہ سارا مسودہ دیکھ چکیں تو میں نے کہا ''راجستھانی لہجہ اور محاورہ کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بہت دھوتا ہوں پر چنری کے رنگ چھٹائے نہیں چھوٹتے۔

Out, damned spot! Out I say! ☆

حیرت ہے اس دفعہ تم نے زبان کی ایک بھی غلطی نہیں نکالی!‘‘

کہنے لگیں ’’پڑھائی ختم ہوتے ہی علی گڑھ سے اس گھر .... گڑھی میں آ گئی۔ تینتالیس برس ہو گئے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں کہ میری زبان کیا تھی اور تمہاری بولی کیا۔ اب تو جو سنتی ہوں سبھی درست معلوم ہوتا ہے‘‘۔

ایک دوسرے کی چھاپ‘ تلک سب چھین کر اپنا لینے اور دریائے سندھ اور راوی کا ٹھنڈا میٹھا پانی پینے کے بعد تو یہی کچھ ہونا تھا اور جو کچھ ہوا بہت خوب ہوا۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

لندن

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۹

مشتاق احمد یوسفی

☆☆☆

☆ شیکسپیئر‘ لیڈی میکبتھ‘ عالم خواب میں اپنے ہاتھ پر خون کا دھبا دیکھ کر اسے چھٹانے کی کوشش کرتی ہے، مگر وہ ہے کہ کسی طرح چھوٹ کر نہیں دیتا۔

پڑیے گر بیمار

تو کوئی نہ ہو تیمار دار؟ جی نہیں! بھلا کوئی تیمار دار نہ ہو تو بیمار پڑنے سے فائدہ؟ اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو؟ توبہ کیجیے! مرنے کا یہ اکل کھرا و قیانوسی انداز مجھے کبھی پسند نہ آیا۔ ہوسکتا ہے غالب کے طرفدار یہ کہیں کہ مغرب کو محض جینے کا قرینہ آتا ہے مرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ اور سچ پوچھئے تو مرنے کا سلیقہ کچھ مشرق ہی کا حصہ ہے۔ اسی بناء پر غالبؔ کی نفاست پسند طبیعت نے ۱۲۷۷ھ میں وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا کہ اس میں ان کی کسر شان تھی۔ حالانکہ اپنی پیشین گوئی کو صحیح ثابت کرنے کی غرض سے وہ اسی سال مرنے کے آرزو مند تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں باعزت طریقے سے مرنا ایک حادثہ نہیں، ہُنر ہے جس کے لیے عمر بھر ریاض کرنا پڑتا ہے۔ اور اللہ اگر توفیق نہ دے تو یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ بالخصوص پیشہ ور سیاستدان اس کے فنی آداب سے واقف نہیں ہوتے۔ بہت کم لیڈر ایسے گزرے ہیں جنہیں صحیح وقت پر مرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ہر لیڈر کی زندگی میں، خواہ وہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ ذرا جی کڑا کر کے مر جائے یا اپنے سیاسی دشمنوں کو رشوت دے کر اپنے آپ کو شہید کرالے تو وہ لوگ سال کے سال نہ سہی، ہر الیکشن پر ضرور دھوم دھام سے اس کا عرس منایا کریں۔ البتہ دقت یہ ہے کہ اس قسم کی سعادت دوسرے کے زور بازو پر منحصر ہے۔ اور سعدیؔ کہہ گئے ہیں کہ دوسرے کے بل بوتے پر جنت میں جانا عقوبت دوزخ کے برابر ہے۔ پھر اس کا کیا علاج کہ انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ورنہ سر دست مجھے اُن خوش نصیب جواں مرگوں سے سروکار نہیں جو جینے کے قرینے اور مرنے کے آداب سے واقف ہیں۔ میرا تعلق تو اُس مظلوم اکثریت سے ہے جس کو بقول شاعر

جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

چنانچہ اس وقت میں اُس بے زبان طبقہ کی ترجمانی کرنا چاہتا ہوں جو اس درمیانی کیفیت سے گزر رہا ہے جو موت اور زندگی دونوں سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما ہے ...... یعنی بیماری! میرا اشارہ اس طبقہ کی طرف ہے جسے

”سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے صحت کے سوا“
میں اس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازمہ علالت ہے۔ اسپرین کی صرف ایک گولی یا مارفیا کا ایک انجکشن اس سے نجات دلانے کے لیے کافی ہے لیکن اس روحانی اذیت کا کوئی علاج نہیں جو عیادت کرنے والوں سے مسلسل پہنچتی رہتی ہے۔ ایک دائم المرض کی حیثیت سے جو اس دردِ لادوا کی لذت سے آشنا ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مارفیا کے انجکشن مریض کے بجائے مزاج پرسی کرنے والوں کے لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آجائے۔

اُردو شاعروں کے بیان کو باور کیا جائے تو پچھلے زمانے میں علالت کی غایت ”تقریب بہر ملاقات“ کے سوا کچھ نہ تھی۔ محبوب عیادت کے بہانے غیر کے گھر جاتا تھا اور ہر سمجھ دار آدمی اسی امید میں بیمار پڑتا تھا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مزاج پرسی کو آنکلے۔

ع علالت بے عیادت جلوہ پیدا کرنہیں سکتی

اس زمانے کے اندازِ عیادت میں کوئی دل نوازی ہوتو ہو، میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو محض عیادت کے خوف سے تندرست رہنا چاہتے ہیں۔ ایک حساس دائم المرض کے لیے ”مزاج اچھا ہے؟“ ایک رسمی یا دعائیہ جملہ نہیں بلکہ ذاتی حملہ ہے جو ہر بار اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کردیتا ہے۔ میں تو آئے دن کی پرسش حال سے اس قدر بے زار ہو چکا ہوں کہ احباب کو آگاہ کردیا ہے کہ جب تک میں بقلم خود یہ اطلاع نہ دوں کہ آج اچھا ہوں۔ مجھے حسبِ معمول بیمار ہی سمجھیں اور مزاج پرسی کرکے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دیں۔

سنا ہے کہ شائستہ آدمی کی یہ پہچان ہے کہ اگر آپ اس سے کہیں کہ مجھے فلاں بیماری ہے تو وہ کوئی آزمودہ دوا نہ بتائے۔ شائستگی کا یہ سخت معیار صحیح تسلیم کرلیا جائے تو ہمارے ملک میں سوائے ڈاکٹروں کے کوئی اللہ کا بندہ شائستہ کہلانے کا مستحق نہ نکلے۔ یقین نہ آئے تو جھوٹ موٹ کسی سے کہہ دیجیے کہ مجھے زکام ہوگیا ہے۔ پھر دیکھیے، کیسے کیسے مجرب نسخے خاندانی چٹکلے اور فقیری ٹوٹکے آپ کو بتائے جاتے ہیں۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ اس کی اصل وجہ طبی معلومات کی زیادتی ہے یا مذاقِ سلیم کی کمی۔ بہرحال بیمار کو مشورہ دینا ہر تندرست آدمی اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فی صد لوگ ایک دوسرے کو مشورے کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں؟

بعض اوقات احباب اس بات سے بہت آزردہ ہوتے ہیں کہ میں ان کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا۔ حالانکہ ان پر عمل پیرا نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون کسی عزیز دوست کی گردن پر ہو۔ اس وقت میرا منشا صلاح و مشورہ کے نقصانات گنوانا نہیں (اس لیے کہ میں دماغی صحت کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے۔ اسی سے ذہنی

توازن قائم رہتا ہے) نہ یہاں ستم ہائے عزیزاں کا شکوہ مقصود ہے۔ مدعا صرف اپنے ان بہی خواہوں کو متعارف کرانا ہے جو میرے مزمن امراض کے اسباب و علل پر غور کرتے اور اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً مجھے مستفید فرماتے رہتے ہیں۔ اگر اس غول میں آپ کو کچھ جانی پہچانی صورتیں نظر آئیں تو میری خستگی کی داد دینے کی کوشش نہ کیجیے، آپ خود لائق ہمدردی ہیں۔

سرفہرست ان مزاج پرسی کرنے والوں کے نام ہیں جو مرض تشخیص کرتے ہیں نہ دوا تجویز کرتے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ منکسر مزاج ہیں۔ دراصل ان کا تعلق اس مدرسۂ فکر سے ہے جس کے نزدیک پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ یہ اس شکم آزار عقیدے کے مبلغ و موید ہیں کہ کھانا جتنا پھیکا سیٹھا ہوگا' صحت کے لیے اتنا ہی مفید ہوگا۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں دواؤں کے خواص دریافت کرنے کا بھی یہی معیار ہے۔ جس طرح بعض خوش اعتقاد لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ ہر بدصورت عورت نیک چلن ہوتی ہے' اسی طرح طب قدیم میں ہر کڑوی چیز کو مصفی خون تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں انگریزی کھانے اور کڑوے قدمے اسی امید میں نوش جان کیے جاتے ہیں۔

اس قبیل کے ہمدردان صحت دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک وہ غذا رسیدہ بزرگ جو کھانے سے علاج کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو علاج اور کھانے دونوں سے پرہیز تجویز فرماتے ہیں۔ پچھلی گرمیوں کا واقعہ ہے کہ میری بائیں آنکھ میں گوہانجنی نکلی تو ایک نیم جان جو خود کو پورا حکیم سمجھتے ہیں' چھوٹتے ہی بولے:

''فم معدہ پر ورم معلوم ہوتا ہے۔ دونوں وقت مونگ کی دال کھائیے۔ دافع نفخ و محلل ورم ہے۔''

میں نے پوچھا آخر آپ کو میری ذات سے کون سی تکلیف پہنچی جو یہ مشورہ دے رہے ہیں؟

فرمایا'' کیا مطلب؟''

عرض کیا'' دو چار دن مونگ کی دال کھالیتا ہوں تو اُردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشا تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس صورت میں خدانخواستہ تندرست ہو بھی گیا تو جی کے کیا کروں گا؟''

بولے'' آپ تجارت کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟ انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اُس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ترازو تھی۔''

گزارش کی'' اور جب وہ گیا تو ایک ہاتھ میں یونین جیک تھا اور دوسری آستین خالی لٹک رہی تھی!''

بات انہیں بہت بُری لگی۔ اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ سچ تھی۔ اس کے بعد تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ ہم نے ایک دوسرے کے لطیفوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔ استعارہ و کنایہ برطرف میرا اپنا عقیدہ تو

یہ ہے کہ جب تک آدمی کو خواص کی غذا ملتی رہے، اُسے غذا کے خواص کے بکھیڑے میں پڑنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ سچ پوچھیے تو عمدہ غذا کے بعد کم از کم مجھے تو بڑا انشراح محسوس ہوتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ بڑھ کے ہر راہ گیر کو سینے سے لگاؤں۔

دوسرا گروہ قوت اداری سے دوا اور غذا کا کام لینا چاہتا ہے اور جسمانی عوارض کے علاج معالجہ سے پہلے دماغ کی اصلاح کرنا ضرورتی سمجھتا ہے۔ یہ حضرات ابتدائے مرض ہی سے دوا کے بجائے دُعا کے قائل ہیں اور ان میں بھاری اکثریت اُن سترے بہترے بزرگوں کی ہے جو گھگیا گھگیا کر اپنی درازیٔ عمر کی دعا مانگتے ہیں اور اسی کو عین عبادت سمجھتے ہیں۔ اس روحانی غذا کے لیے میں فی الحال اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ مجھے اس پر قطعاً تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج گنڈے تعویذوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہو جاتے ہیں۔

کچھ ایسے عیادت کرنے والے بھی ہیں جن کے انداز پرسش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے اور وہ کسی آسمانی ہدایت کے بموجب اس کی تفتیش پر مامور کیے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی اور میں بھی صاحبِ فراش ہو گیا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے، کمرہ علالت میں بہ نفس نفیس تشریف لائے اور خوب کرید کرید کر جرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر رازدارانہ انداز میں کچھ ایسے نجی سوالات کیے جن کے پوچھنے کا حق میری ناچیز رائے میں بیوی اور منکر نکیر کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا۔

ایک بزرگوار ہیں جن سے صرف دورانِ علالت میں ملاقات ہوتی ہے۔ اس لیے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ موصوف آتے ہی برس پڑتے ہیں اور گرجتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتے کا ذکر ہے۔ بلبلا کر بخار چڑھ رہا تھا کہ وہ آدھمکے۔ کپکپا کر کہنے لگے:

”بیماری آزاری میں بھی بڑی غیریت برتتے ہو برخوردار! دو گھنٹے سے ملیریا میں چپ چاپ مبتلا ہو اور مجھے خبر تک نہ کی۔“

اطلاع کرا دیتا تو آپ میرے ملیریا کا کیا بگاڑ لیتے؟“

ان کی زبان اس قینچی کی طرح ہے جو چلتی زیادہ ہے اور کاٹتی کم۔ ڈانٹنے کا انداز ایسا ہے جیسے کوئی کودن لڑکا زور زور سے پہاڑے یاد کر رہا ہو۔ مجھے اُن کی ڈانٹ پر ذرا غصہ نہیں آتا۔ کیونکہ اب اس کا مضمون ازبر ہو گیا ہے۔ یوں بھی اس کینڈے کے بزرگوں کی نصیحت میں سے ڈانٹ اور ڈاڑھی کو علیحدہ کر دیا جائے، یا بصورت نقص امن، ڈانٹ میں سے ڈنک نکال دیا جائے تو بقیہ بات (اگر کوئی چیز باقی رہتی ہے۔ نہایتی لغو معلوم ہو گی۔

ان کا آنا فرشتہ موت کا آنا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام روح قبض کرتے وقت اتنی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔ زکام انہیں نمونیہ کا پیش خیمہ دکھائی دیتا ہے اور خسرہ میں ٹائیفائڈ کے آثار نظر آتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ جہاں محض سیٹی سے کام چل سکتا ہے۔ وہاں بے دھڑک بگل بجادیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک ہی سانس میں خدانخواستہ سے اناللہ تک کی تمام منزلیں طے کرلیتے ہیں۔ ان کی منظوم ڈانٹ کی تمہید کچھ اس قسم کی ہوتی ہے:

''میاں! یہ بھی کوئی انداز ہے کہ گھر کے رئیسوں کی طرح

نبض پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

بیکاری بیماری کا گھر ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

بیمار مباش کچھ کیا کر۔''

مصرع کا جواب شعر سے دیتا ہوں:

ع کمزور میری صحت بھی، کمزور مری بیماری بھی

اچھا جو ہوا کچھ کر نہ سکا، بیمار ہوا تو مر نہ سکا

یہ سن کر وہ بپھر جاتے ہیں اور اپنے سن و سال کی آڑ لے کر کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان میں وہ بے نقط سناتے ہیں کہ زندہ تو در کنا، مردہ بھی ایک دفعہ کفن پھاڑ کر سوال و جواب کے لیے اُٹھ بیٹھے۔ تقریر کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ راقم الحروف جان بوجھ کر اپنی تندرستی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر خودکشی میرا منشا ہوتا تو یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں جیتا بلکہ آنکھ بند کرکے ان کی تجویز کردہ دوائیں کھالیتا۔

آیئے ایک اور مہربان سے آپ کو ملاؤں۔ ان کی تکنیک قدرے مختلف ہے۔ میری صورت دیکھتے ہی ایسے ہراساں ہوتے ہیں کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کا معمول ہے کہ کمرے میں بغیر کھٹکھٹائے داخل ہوتے ہیں اور میرے سلام کا جواب دیئے بغیر تیمارداروں کے پاس پنجوں کے بل جاتے ہیں۔ پھر کھسر پھسر ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی کوئی اُچٹتا ہوا فقرہ مجھے بھی سنائی دے جاتا ہے۔ مثلاً:

''صدقہ دیجئے۔ جمعرات کی رات بھاری ہوتی ہے۔''

''پانی حلق سے اُتر جاتا ہے؟''

''آدمی پہچان لیتے ہیں؟''

یقین جانئے۔ یہ سن کر پانی سر سے گزر جاتا ہے اور میں تو رہا ایک طرف، خود تیماردار میری صورت نہیں پہچان سکتے۔

سرگوشیوں کے دوران ایک دو دفعہ میں نے خود دخل دے کر بقائمی ہوش و حواس عرض کرنا چاہا کہ

میں بفضل تعالیٰ چاق چوبند ہوں۔ صرف پیچیدہ دواؤں میں مبتلا ہوں۔ مگر وہ اس مسئلہ کو قابل دستاندازی مریض نہیں سمجھتے اور اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خموش رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ میرے اعلان صحت اور ان کی پرزور تردید سے تیمارداروں کو میری دماغی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یوں بھی اگر بخار سوڈگری سے اوپر ہو جائے تو میں ہذیان بکنے لگتا ہوں جسے بیگم' اقبال گناہ اور رشتے دار وصیت سمجھ کر ڈانٹتے ہیں اور بچے ڈانٹ سمجھ کر سہم جاتے ہیں۔ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کرسکا کہ یہ حضرت مزاج پرسی کرنے آتے ہیں یا پرسا دینے۔ ان کے جانے کے بعد میں واقعی محسوس کرتا ہوں کہ بس اب چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ سانس لیتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ روایتی ہچکی نہ آجائے۔ ذرا گرمی لگتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ شاید آخری پسینہ ہے اور طبیعت تھوڑی بحال ہوتی ہے تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں کہ کہیں سنبھالا نہ ہو۔

لیکن مرزا عبدالودود بیگ کا انداز سب سے نرالا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انہیں میری دلجوئی مقصود ہوتی ہے یا اس میں ان کے فلسفہ حیات و ممات کا دخل ہے۔ بیماری کے فضائل ایسے دل نشین پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ صحت یاب ہونے کو دل نہیں چاہتا۔ تندرستی وبال معلوم ہوتی ہے اور غسل صحت میں وہ تمام قباحتیں نظر آتی ہیں' جن سے غالب کو فکر وصال میں دوچار ہونا پڑا

ع کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں' ہو تو کیوں کر ہو

اکثر فرماتے ہیں کہ بیماری جان کا صدقہ ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ میرے حق میں تو یہ صدقہ جاریہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے خالی بیمار پڑ جانے سے کام نہیں چلتا۔ اس لیے کہ پسماندہ ممالک

ع میں فیضانِ علالت عام سہی' عرفانِ علالت عام نہیں

ایک دن میں کان کے درد میں تڑپ رہا تھا کہ وہ آنکلے۔ اس افراتفری کے زمانے میں زندہ رہنے کے شدائد اور موت کے فیوض و برکات پر ایسی مؤثر تقریر کی کہ بے اختیار جی چاہا کہ انہی کے قدموں پر پھڑ پھڑا کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردوں اور انشورنس کمپنی والوں کو روتا دھوتا چھوڑ جاؤں۔ ان کے دیکھے سے میرے تیمارداروں کے منہ کی رہی سہی رونق جاتی رہتی ہے۔ مگر میں سچے دل سے ان کی عزت کرتا ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ محض جینے کے لیے کسی فلسفہ کی ضرورت نہیں لیکن اپنے فلسفہ کی خاطر دوسروں کو جانے دینے پر آمادہ کرنے کے لیے سلیقہ چاہیے۔

چونکہ یہ موقع ذاتی تاثرات کے اظہار کا نہیں۔ اس لیے میں مرزا کے انداز عیادت کی طرف لوٹتا ہوں۔ وہ جب تندرستی کو امّ الخبائث اور تمام جرائم کی جڑ قرار دیتے ہیں تو مجھے رہ رہ کر اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل ضرور پیش کرتے ہیں کہ جن ترقی یافتہ ممالک میں تندرستی کی وبا عام ہے وہاں جنسی جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ میں کان کے درد سے

نڈھال ہونے لگا تو انہوں نے مسئلہ مسائل بیان کر کے میری ڈھارس بندھائی:

"میاں ہمت سے کام لو۔ بڑے بڑے نبیوں پر یہ وقت پڑا ہے۔"

میں درد سے ہلکان ہو چکا تھا۔ ورنہ ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ خدا مارے یا چھوڑے، میں بغیر دعویٰ نبوت یہ عذاب جھیلنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ علاوہ ازیں، قصص الانبیاء میں نے بچپن میں پڑھی تھی اور یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ کون سے پیغمبر کان کے درد کے باوجود فرائض نبوی انجام دیتے رہے۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد میں نے ازراہِ تفنن مرزا سے کہا "فرینک ہیرس کے زمانے میں کوئی صاحب استطاعت مرد اس وقت تک 'جنٹلمین' ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ وہ کم از کم ایک مرتبہ ناگفتہ بہ جنسی امراض میں مبتلا نہ ہوا ہو۔ یہ خیال عام تھا کہ اس سے شخصیت میں لوچ اور چاؤ پیدا ہوتا ہے۔"

تمباکو کے پان کا پہلا گھونٹ پی کر کہنے لگے "خیر! یہ تو ایک اخلاقی کمزوری کی فلسفیانہ تاویل ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ درد اخلاق کو سنوارتا ہے۔"

وہ ٹھیرے ایک جھکی۔ اس لیے میں نے فوراً اقرار کر کے اپنا پنڈ چھڑایا کہ "مجھے اس کلیہ سے اتفاق ہے۔ بشرطیکہ درد شدید ہو اور کسی دوسرے کے اٹھ رہا ہو۔"

پچھلے جاڑوں کا ذکر ہے۔ میں گرم پانی کی بوتل سے سینک کر رہا تھا کہ ایک بزرگ جو اسی سال کے پیٹے میں ہیں خیر و عافیت پوچھنے آئے اور دیر تک قبر و عاقبت کی باتیں کرتے رہے جو میرے تیمارداروں کو ذرا قبل از وقت معلوم ہوئیں۔ آتے ہی بہت سی دعائیں دیں، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ خدا مجھے ہزاری عمر دے تاکہ میں اپنے اور ان کے فرضی دشمنوں کی چھاتی پر روایتی مونگ دلنے کے لیے زندہ ہوں۔ اس کے بعد جانکنی اور فشار گور کا اس قدر مفصل حال بیان کیا کہ مجھے غریب خانے پر گورغریباں کا گمان ہونے لگا۔ عیادت میں عبادت کا ثواب لوٹ چکے تو میری جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا جس میں شفقت کم اور رعشہ زیادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی کو (جن کا انتقال تین ماہ قبل اسی مرض میں ہوا تھا جس میں مبتلا تھا) یاد کر کے کچھ اس طرح آب دیدہ ہوئے کہ میری بھی ہچکی بندھ گئی۔ میرے لیے جو تین عدد سیب لائے تھے وہ کھا چکنے کے بعد جب انہیں کچھ قرار آیا تو وہ مشہور تعزیتی شعر پڑھا جس میں ان غنچوں پر حسرت کا اظہار کیا گیا ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

میں فطرتاً رقیق القلب واقع ہوا ہوں اور طبیعت میں ایسی باتوں کا سہار بالکل نہیں ہے۔ ان کے جانے کے بعد "جب لاد چلے گا بنجارا" والا موڈ طاری ہو جاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ ہر پرچھائیں بھوت اور ہر سفید چیز فرشتہ دکھائی دیتی ہے ذرا آنکھ لگتی ہے تو بے ربط خواب دیکھنے لگتا ہوں۔ گویا کوئی "کامک" یا باتصویر نفسیاتی افسانہ سامنے کھلا ہوا ہے:

کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر میری لاش پر انجکشن کی پچکاریوں سے لڑ رہے ہیں، اور لہولہان ہو رہے ہیں۔ ادھر کچھ مریض اپنی اپنی نرس کو کلوروفام سنگھا رہے ہیں۔ ذرا دور ایک لاعلاج مریض اپنے ڈاکٹر کو یاسین حفظ کرا رہا ہے۔ ہر طرف ساگو دانے اور مونگ کی دال کی کھچڑی کے ڈھیر لگے ہیں۔ آسمان بنفشی ہو رہا ہے اور عناب کے درختوں کی چھاؤں میں، سنائی جھاڑیوں کی اوٹ لے کر بہت سے غلمان ایک مولوی کو غذا بالجبر کے طور پر معجونیں کھلا رہے ہیں۔ تاحد نظر کافور میں بسے ہوئے کفن ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ جا بجا لوبان سلگ رہا ہے اور میرا سر سنگ مرمر کی لوح مزار کے نیچے دبا ہوا ہے اور اس کی ٹھنڈک نس نس میں گھسی جا رہی ہے۔ میرے منہ میں سگرٹ اور ڈاکٹر کے منہ میں تھرمامیٹر ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ سر پر برف کی تھیلی رکھی ہے۔ میرے منہ میں تھرمامیٹر ٹھنسا ہوا ہے اور ڈاکٹر کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہے۔

لگے ہاتھوں، عیادت کرنے والوں کی ایک اور قسم کا تعارف کرادوں۔ یہ حضرات جدید طریق کار برتتے اور نفسیات کا ہر اصول داؤں پر لگا دیتے ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد پوچھتے ہیں کہ افاقہ ہوا یا نہیں؟ گویا مریض سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ عالم نزع میں بھی ان کی معلومات عامہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے RUNNING COMMENTARY کرتا رہے گا۔ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح مریض پر ثابت کر دیں کہ وہ محض انتظاماً بیمار ہے یا وہم میں مبتلا ہے اور کسی سنگین غلط فہمی کی بنا پر اپنا اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ ان کی مثال اس روزہ خور کی سی ہے جو انتہائی نیک نیتی سے کسی روزہ دار کا روزہ لطیفوں سے بہلانا چاہتا ہو۔ مکالمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ملاقاتی: ماشاء اللہ! آج منہ پر بڑی رونق ہے۔

مریض: جی ہاں! آج شیو نہیں کیا ہے۔

ملاقاتی: آواز میں بھی کرارا پن ہے۔

مریض کی بیوی: ڈاکٹر نے صبح سے ساگو دانہ بھی بند کر دیا ہے۔

ملاقاتی: (اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر) بیگما! یہ صحت یاب ہو جائیں تو ذرا انہیں میری پتھری دکھانا جو تم نے چار سال سے اسپرٹ کی بوتل میں رکھ چھوڑی ہے۔

(مریض سے مخاطب ہو کر) صاحب! یوں تو ہر مریض کو اپنی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر معلوم ہوتا ہے، مگر یقین جانیے آپ کا شگاف تو بس دو تین اُنگل لمبا ہوگا، میرا تو پورا ایک بالشت ہے۔ بالکل کنکھجورا معلوم ہوتا ہے۔

مریض: (کراہتے ہوئے) مگر میں ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوں۔

ملاقاتی: (ایکاایکی پینترا بدل کر) یہ سب آپ کا وہم ہے۔ آپ کو صرف ملیریا ہے۔

مریض: یہ پاس والی چارپائی۔ جواب خالی پڑی ہے، اس کا مریض بھی اسی وہم میں مبتلا تھا

ملاقاتی: ارے صاحب! مانئے تو! آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھوئیے۔

مریض کی بیوی: (روہانسی ہوکر) دو دفعہ دھو چکے ہیں۔ صورت ہی ایسی ہے۔

اس وقت ایک دیرینہ کرم فرما یاد آرہے ہیں، جن کا طرز عیادت ہی اور ہے۔

ایسا حلیہ بنا کر آتے ہیں کہ خود ان کی عیادت فرض ہو جاتی ہے۔ ''مزاج شریف!'' کو وہ رسمی فقرہ نہیں بلکہ سالانہ امتحان کا سوال سمجھتے ہیں اور سچ مچ اپنے مزاج کی جملہ تفصیلات بتانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دن منہ کا مزہ بدلنے کی خاطر میں نے ''مزاج شریف!'' کے بجائے ''سب خیریت ہے؟'' سے پرسش احوال کی۔ پلٹ کر بولے ''اس جہان شریت میں خیریت کہاں؟'' اس مابعد الطبیعاتی تمہید کے بعد کراچی کے موسم کی خرابی کا ذکر آنکھوں میں آنسو بھر کر ایسے انداز سے کیا گویا ان پر سراسر ذاتی ظلم ہو رہا ہے، اور اس کی تمام تر ذمہ داری میونسل کارپوریشن پر عائد ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض عورتیں شاعر کی نصیحت کے مطابق وقت کو پیمانہ امروز و فردا سے نہیں ناپتیں بلکہ تاریخ و سنہ اور واقعات کی ترتیب کا حساب اپنی یادگار زچگیوں سے لگاتی ہیں۔ مذکور الصدر دوست بھی اپنی بیماریوں سے کیلنڈر کا کام لیتے ہیں۔ مثلاً شہزادی مارگیٹ کی عمر وہ اپنے دمے کے برابر بتاتے ہیں۔ سوئز سے انگریزوں کے نہر بدر کیے جانے کی تاریخ وہی ہے جو ان کا پتا نکالے جانے کی! میرا قاعدہ ہے کہ جب وہ اپنی اور جملہ متعلقین کی عدم خیریت کی تفصیلات بتا کر اٹھنے لگتے ہیں تو اطلاعاً اپنی خیریت سے آگاہ کر دیتا ہوں۔

بیمار پڑنے کے صدہا نقصانات ہیں۔ مگر ایک فائدہ بھی ہے، وہ یہ کہ اس بہانے اپنے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم ہو جاتی ہے۔ بہت سی کڑوی کسیلی باتیں جو عام طور سے ہونٹوں پر لرز کر رہ جاتی ہیں، بے شمار دل آزار فقرے جو ''خوف فساد خلق'' سے حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اس زمانے میں یار لوگ نصیحت کی آڑ میں ''ہوالشافی'' کہہ کر بڑی بے تکلفی سے داغ دیتے ہیں۔ پچھلے سنیچر کی بات ہے۔ میری عقل ڈاڑھ میں شدید درد تھا کہ ایک رُوٹھے ہوئے عزیز جن کے مکان پر حال ہی میں قرض کے روپیہ سے چھت پڑی تھی، لقا کبوتر کی مانند سینہ تانے آئے اور فرمانے لگے:

''ہیں آپ بھی ضدی آدمی! لاکھ سمجھایا کہ اپنا ذاتی مکان بنوا لیجیے مگر آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔''

طعنے کی کاٹ درد کی شدت پر غالب آئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''بھائی! میری عقل تو اس وقت کام نہیں کرتی۔ خدارا! آپ ہی بتائیے، کیا یہ تکلیف صرف کرایہ داروں کو ہوتی ہے؟''

ہنس کر فرمایا ''بھلا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کرائے کے مکان میں تندرستی کیوں کر ٹھیک

رہ سکتی ہے۔''

کچھ دن بعد جب انہی حضرت نے میرے گھٹنے کے درد کو بے دودھ کی چائے پینے اور رمی کھیلنے کا شاخسانہ قرار دیا تو بے اختیار ان کا سر پیٹنے کو جی چاہا۔

اب کچھ جگ بیتی بھی سن لیجیے۔ جھوٹ سچ کا حال خدا جانے۔ لیکن ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو ماہ قبل ان کے گلے میں خراش ہوگئی' جو ان کے نزدیک بدمزہ کھانے اور گھر والوں کے خیال میں سگرٹ کی زیادتی کا نتیجہ تھی۔ شروع میں تو انہیں اپنی بیٹھی ہوئی آواز بہت بھی معلوم ہوئی اور کیوں نہ ہوتی؟ سنتے چلے آئے ہیں کہ بیٹھی ہوئی (HUSKY) آواز میں بے پناہ جنسی کشش ہوتی ہے۔ خدا کے دین تھی کہ گھر بیٹھے آواز بیٹھ گئی۔ ورنہ امریکہ میں تو لوگ کوکا کولا کی طرح ڈالر بہاتے ہیں جب کہیں آواز میں یہ مستقل زکام کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ذرا افاقہ محسوس ہوا تو انہوں نے راتوں کو گڑگڑا گڑگڑا کر، بلکہ خنخنا خنخنا کر دعائیں مانگیں:

''بار الہا! تیری شان کریمی کے صدقے یہ سوزش بھلے ہی کم ہو جائے' مگر بھراہٹ لیکن چند دن بعد جب ان کا گلا خالی نل کی طرح بھق بھق کرنے لگا تو انہیں بھی تشویش ہوئی۔ کسی نے کہا ''لقمان کا قول ہے کہ پانی پیتے وقت ایک ہاتھ سے ناک بند کرلینے سے گلا کبھی خراب نہیں ہوتا۔''

ایک صاحب نے ارشاد فرمایا ''سارا فتور پھل نہ کھانے کے سبب ہے۔ میں تو روزانہ نہار منہ پندرہ فٹ گنا کھاتا ہوں۔ معدہ اور دانت دونوں صاف رہتے ہیں۔'' اور ثبوت میں انہوں نے اپنے مصنوعی دانت دکھائے جو واقعی بہت صاف تھے۔

ایک اور خیر خواہ نے اطلاع دی کہ زکام ایک زہریلے وائرس VIRUS سے ہوتا ہے جو کسی دوا سے نہیں مرتا۔ لہٰذا جو شاندہ پیجئے کہ انسان کے علاوہ کوئی جاندار اس کا ذائقہ چکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔

بقیہ روداد انہی کی زبان سے سنئے:

''اور جن کرم فرماؤں نے ازراہِ کسر نفسی دوائیں تجویز نہیں کیں۔ وہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے نام اور پتے بتا کر اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوگئے۔ کسی نے اصرار کیا کہ آیورویدک علاج کراؤ' بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ میں طبعی موت مرنا چاہتا ہوں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ حکیم نباض ملت سے رجوع کیجئے۔ نبض پر انگلی رکھتے ہی مریض کا شجرۂ نسب بتا دیتے ہیں (اسی وجہ سے کراچی میں ان کی طبابت ٹھپ ہے) قارورے پر نظر ڈالتے ہی مریض کی آمدنی کا اندازہ کرلیتے ہیں۔ آواز اگر ساتھ دیتی تو میں ضرور عرض کرتا کہ ایسے کام کے آدمی کو تو انکم ٹیکس کے محکمہ میں ہونا چاہئے۔

''غرضیکہ جتنے منہ ان سے کہیں زیادہ باتیں! اور تو اور سامنے کے فلیٹ میں رہنے والی اسٹینو گرافر (جو چست سویٹر اور جینز پہن کر، بقول مرزا عبدالودود بیگ' انگریزی کا S معلوم ہوتی ہے) بھی

مزاج پرسی کو آئی اور کہنے لگی 'حکیموں کے چکر میں نہ پڑیئے۔ آنکھ بند کر کے ڈاکٹر دلاور کے پاس جائیے۔ تین مہینے ہوئے، آواز بنانے کی خاطر میں نے املی کھا کھا کر گلے کا ناس مار لیا تھا۔ میری خوش نصیبی کہیئے کہ ایک سہیلی نے ان کا پتہ بتا دیا۔ اب بہت افاقہ ہے۔

''اس کے بیان کی تائید کچھ دن بعد مرزا عبدالودود بیگ نے بھی کی۔ انہوں نے تصدیق کی کہ ڈاکٹر صاحب امریکی طریقہ سے علاج کرتے ہیں اور ہر کیس کو بڑی توجہ سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ سینڈل کے علاوہ ہر چیز اتروا کر انہوں نے اسٹینوگرافر کے حلق کا بغور معائنہ کیا۔ علاج سے واقعی کافی افاقہ ہوا اور اس سلسلے میں ابھی تک پیٹھ پر بنفشی شعاعوں سے سینک کرانے جاتی ہے۔''

مجھے یقین ہے کہ اس طریقہ علاج سے ڈاکٹر موصوف کو کافی افاقہ ہوا ہوگا!

☆☆☆

کافی

میں نے سوال کیا ''آپ کافی کیوں پیتے ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا ''آپ کیوں نہیں پیتے؟''

''مجھے اس میں سگار کی سی بو آتی ہے۔''

''اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی سوندھی خوشبو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوتِ شامہ کی کوتاہی ہے۔''

گو کہ ان کا اشارہ صریحاً میری ناک کی طرف تھا' تاہم رفعِ شر کی خاطر میں نے کہا ''تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے واقعی بھینی بھینی مہک آتی ہے۔ مگر یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کافی کا عطر کیوں نہ کشید کیا جائے تا کہ ادبی محفلوں میں ایک دوسرے کے لگایا کریں۔''

تڑپ کر بولے ''صاحب! میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا' تاوقتیکہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو...... کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔ یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دھنگارے رائتہ میں ہوتا ہے۔''

میں نے معذرت کی ''کھرچن اور دُھنگار دونوں سے مجھے متلی ہوتی ہے۔''

فرمایا ''تعجب ہے! یوپی میں تو شرفا بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔''

''میں نے اسی بنا پر ہندوستان چھوڑا۔''

چراندے ہو کر کہنے لگے ''آپ قائل ہو جاتے ہیں تو کج بحثی کرنے لگتے ہیں۔''

جواباً عرض کیا ''گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ دانستہ دل آزاری ہمارے مشرب میں گناہ ہے۔ لہٰذا ہم اپنی اصل رائے کا اظہار صرف نشہ اور غصہ کے عالم میں کرتے ہیں۔ خیر' یہ تو جملہ معترضہ تھا' لیکن اگر یہ سچ ہے کہ کافی خوش ذائقہ ہوتی ہے تو کسی بچے کو پلا کر اُس کی صورت دیکھ لیجیے۔''

جھلا کر بولے ''آپ معصوم بچوں کو بحث میں کیوں گھسیٹتے ہیں؟''

میں بھی الجھ گیا ''آپ لوگ ہمیشہ 'بچوں' سے پہلے لفظ 'معصوم' کیوں لگاتے ہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کچھ بچے گنہگار بھی ہوتے ہیں؟ خیر' آپ کو بچوں پر اعتراض ہے تو بلی کو لیجیے۔''

''بلی ہی کیوں؟ بکری کیوں نہیں؟'' وہ سچ مچ مچلنے لگے۔
میں نے سمجھایا''بلی اس لیے کہ جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، بچے اور بلیاں بُرے بھلے کی کہیں بہتر تمیز رکھتے ہیں۔''
ارشاد ہوا'' کل کو آپ یہ کہیں گے کہ چونکہ بچوں اور بلیوں کو پکّے گانے پسند نہیں آسکتے اس لیے وہ بھی لغو ہیں۔''
میں نے انہیں یقین دلایا'' میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا۔ پکّے راگ انہیں کی ایجاد ہیں۔ آپ نے بچوں کا رونا اور بلیوں کا لڑنا......''
بات کاٹ کر بولے'' بہرحال ثقافتی مسائل کا فیصلہ ہم بچوں اور بلیوں پر نہیں چھوڑ سکتے۔''
آپ کو یقین آئے یا نہ آئے، مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصواب رائے عامہ کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا۔ شائقین میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اُلٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسار رائے عامہ کرنا بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بدمذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا (اس کا یہ مطلب نہیں کہ نیک مرد کی عمر اور خوب صورت عورت کی آمدنی دریافت کرنا خطرے سے خالی ہے) زندگی میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو واقعی کافی سے بیزار تھا۔ لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابلِ التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا ملک نکلا۔

ایک صاحب اپنی پسند کے جواز میں صرف یہ کہہ کر چپ ہوگئے کہ

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافی لگی ہوئی

میں نے وضاحت چاہی تو کہنے لگے'' دراصل یہ عادت کی بات ہے۔ یہ کم بخت کافی بھی روایتی چنے اور ڈومنی کی طرح ایک دفعہ منہ لگنے کے بعد چھڑائے نہیں چھوٹتی۔ ہے نا؟'' اس مقام پر مجھے اپنی معذوری کا اعتراف کرنا پڑا کہ بچپن ہی سے میری صحت خراب اور صحبت اچھی رہی۔ اس لیے ان دونوں خوب صورت بلاؤں سے محفوظ رہا۔
بعض احباب تو اس سوال سے چراغ پا ہو کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جھوٹے الزام کو سمجھ دار آدمی نہایت اعتماد سے ہنس کر ٹال دیتا ہے مگر سچے الزام سے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس ضمن میں جو متضاد باتیں سننا پڑتی ہیں' ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔
ایک کرم فرما نے میری بیزاری کو محرومی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا:

اُن کی خدمت میں حلفیہ عرض کیا کہ دراصل بیسیوں گیلن کافی پینے کے بعد ہی یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے صاحب نے ذرا کھل کر پوچھا کہ کہیں کافی سے چڑ کی اصل وجہ معدے کے وہ داغ (ULCERS) تو نہیں جن کو میں دو سال سے لیے پھر رہا ہوں اور جو کافی کی تیزابیت سے جل اُٹھے ہیں۔

اور اس کے بعد وہ مجھے نہایت تشخیص ناک نظروں سے گھورنے لگے۔

استصواب رائے عامہ کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب مجھے اپنے تاثرات پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ میرا ایمان ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان غور وفکر کی عادت ڈالے (یا محض عادت ہی ڈال لے) تو ہر بری چیز میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر حقہ ہی کو لیجئے۔ معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ حقہ پینے سے تفکرات پاس نہیں پھٹکتے۔ بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ اگر تمبا کو خراب ہو تو تفکرات ہی پر کیا موقوف ہے، کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا۔ اب دیگر ملکی اشیائے خورونوش پر نظر ڈالیے۔ مرچیں کھانے کا ایک آسانی سے سمجھ میں آنے والا فائدہ یہ ہے کہ ان سے ہمارے مشرقی کھانوں کا اصل رنگ اور مزہ دب جاتا ہے۔ خمیرہ گاؤزبان اس لیے کھاتے ہیں کہ بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کرنے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ جوشاندہ اس لیے گوارا ہے کہ اس سے نہ صرف ایک ملکی صنعت کو فروغ ہوتا ہے بلکہ نفس امارہ کو مارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شلغم اس لیے زہر مار کرتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے۔ لیکن جدید طبی ریسرچ نے ثابت کردیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اہل ذوق کے نزدیک یہی اس کی خوبی ہے۔

معلوم نہیں کافی کیوں، کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی۔ لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اگر انہیں ذرا بھی علم ہوتا تو چرائتہ کی طرح یہ بھی یونانی طب کا جزو اعظم ہوتی۔ اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت ہوتی ہے کہ قصبوں میں کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عطائیوں نے ''اللہ شافی اللہ کافی'' کہہ کر مؤخر الذکر کا سفوف اپنے نسخوں میں لکھنا شروع کردیا ہے۔ زمانہ قدیم میں اس قسم کی جڑی بوٹیوں کا استعمال عداوت اور عقد ثانی کے لیے مخصوص تھا۔ چونکہ آج کل ان دونوں باتوں کو معیوب خیال کیا جاتا ہے، اس لیے صرف اظہار خلوص باہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سنا ہے کہ چائے کے بڑے خوب صورت باغ ہوتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں میں پیدا ہوتی تو ایشائی ممالک میں اتنی افراط سے نہیں ملتی بلکہ غلہ کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔ میری معلومات عامہ محدود ہیں مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی

سے اُگتی ہوگی۔ کیونکہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آسمان سے براہِ راست نازل کرتا ہے۔ تاہم میری چشم تخئیل کو کسی طور یہ باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی پیداوار ہوسکتی ہے۔ اور اگر کسی ملک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اُگتا ہوگا؟ ایسے اربابِ ذوق کی کمی نہیں جنھیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھیئے تو مجھے اپنا ملک اس لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

میں مشروبات کا پارکھ نہیں ہوں۔ لہٰذا مشروب کے اچھے یا بُرے ہونے کا اندازہ ان اثرات سے لگاتا ہوں جو اسے پینے کے بعد رونما ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے میں نے کافی کو شراب سے بدر جہا بدتر پایا۔ میں نے دیکھا ہے کہ شراب پی کر سنجیدہ حضرات بے حد غیر سنجیدہ گفتگو کرنے لگتے ہیں جو بہت جاندار ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے کافی پی کر غیر سنجیدہ لوگ انتہائی سنجیدہ گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے سنجیدگی سے چڑ نہیں بلکہ عشق ہے۔ اسی لیے میں سنجیدہ آدمی کی مسخرگی برداشت کرلیتا ہوں، مگر مسخرے کی سنجیدگی کا روادار نہیں۔ شراب کے نشے میں لوگ بلاوجہ جھوٹ نہیں بولتے۔ کافی پی کر لوگ بلاوجہ سچ نہیں بولتے۔ شراب پی کر آدمی اپنا غم اوروں کو دیتا ہے مگر کافی پینے والے اوروں کے فرضی غم اپنا لیتے ہیں۔ مدہوش ہونے کے بعد مے خوار ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دیتے ہیں۔ کافی پی کر حلیف بھی حریف بن جاتے ہیں۔

یہاں مجھے کافی سے اپنی بیزاری کا اظہار مقصود ہے لیکن اگر کسی صاحب کو یہ سطور شراب کا اشتہار معلوم ہوں تو اسے زبان و بیان کا عجز تصور فرمائیں۔ کافی کے طرفدار اکثر یہ کہتے ہیں کہ یہ بے نشے کی پیالی ہے۔ بالفرض محال یہ گزارش احوال واقعی یا دعویٰ درست ہے تو مجھے ان سے دلی ہمدردی ہے۔ مگر اتنے کم داموں میں آخر وہ اور کیا چاہتے ہیں؟

کافی ہاؤس کی شام کا کیا کہنا! فضا میں ہر طرف ذہنی کہرا چھایا ہوا ہے۔ جس کو سرمایہ دار طبقہ اور طلبا سرخ سویرا سمجھ کر ڈرتے اور ڈراتے ہیں۔ شوروشغب کا یہ عالم کہ اپنی آواز سنائی نہیں دیتی اور بار بار دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میں نے کیا کہا۔ ہر میز پر تشنگانِ علم کافی پی رہے ہیں۔ اور غروب آفتاب سے غرارے تک، یا عوام اور آم کے خواص پر بقراطی لہجے میں بحث کررہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کافی اپنا رنگ دکھاتی ہے اور تمام بنی نوع انسان کو ایک برادری سمجھنے والے تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کی ولدیت کے بارے میں اپنے شکوک کا سلیس اُردو میں اظہار کرنے لگتے ہیں، جس سے بیروں کو کلیتہً اتفاق ہوتا ہے۔ لوگ روٹھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر پھر بیٹھ جاتے ہیں کہ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ گھر جائیں گے

گھر میں بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک انٹلکچوئیل نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔ میں بھی اس رائے سے متفق ہوں۔ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں معلوم ہوتا کہ کافی پینے سے بدن میں چستی آتی ہے۔ جبھی تو لوگ دوڑ دوڑ کر کافی ہاؤس جاتے ہیں اور گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

بہت دیر تک وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ کافی نہایت مفرح ہے اور دماغ کو روشن کرتی ہے۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے اپنی مثال دی کہ ''ابھی کل کا واقعہ ہے۔ میں دفتر سے گھر بے حد نڈھال پہنچا۔ بیگم بڑی مزاج داں ہیں۔ فوراً کافی کا TEA POT لاکر سامنے رکھ دیا۔''

میں ذرا چکرایا ''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں نے دودھ دان میں سے کریم نکالی'' انہوں نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''شکردان میں سے کیا نکلا؟''

فرمایا ''شکر نکلی' اور کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے؟''

مجھے غصہ تو بہت آیا' مگر کافی کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

عمدہ کافی بنانا بھی کیمیا گری سے کم نہیں۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق یہی سننے میں آیا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ ہر ایک کافی ہاؤس اور خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ' حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا ہے۔ مشرقی افریقہ کے اس انگریز افسر کا نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے جس کی مزے دار کافی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پر تکلف دعوت کی جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظر حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب پوچھی

حبشی نے جواب دیا ''بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں۔ پھر اس میں کافی ملا کر دم کرتا ہوں۔''

''لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو۔ بہت مہین چھنی ہوتی ہے۔''

''حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی ریشمی موزے استعمال کرتے ہو؟'' آقا نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

خانساماں سہم گیا ''نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔''

سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کافی کی تندی اور تلخی سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بچپن ہی سے یونانی دواؤں کا

عادی رہا ہوں اور قوت برداشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کڑوی سے کڑوی

گولیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا!

لیکن کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو معتدل قوام بنتا ہے وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میری انتہا پسند طبیعت اس میٹھے زہر کی تاب نہیں لا سکتی۔ لیکن وقت یہ آن پڑتی ہے کہ میں میزبان کے اصرار کو عداوت اور وہ میرے انکار کو تکلف پر محمول کرتے ہیں۔

لہٰذا جب وہ میرے کپ میں شکر ڈالتے وقت اخلاقاً پوچھتے ہیں:

''ایک چمچہ یا دو؟''

تو مجبوراً یہی گزارش کرتا ہوں کہ میرے لیے شکردان میں کافی کے دو چمچے ڈال دیجئے۔

صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خورونوش کا تعلق ہے' میں تہذیب حواس کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کے بجائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ پہلی نظر میں جو محبت ہو جاتی ہے' اس میں بالعموم نیت کا فتور کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ بد ذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لیے بڑا اپنا مارنا پڑتا ہے۔ مگر میں اس سلسلہ میں برسوں تلخی کام و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں' تاوقتیکہ اس میں بیوی کا اصرار یا گرہستی مجبوریاں شامل نہ ہوں۔ بنابریں' میں ہر کافی پینے والے کو جنتی سمجھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو لوگ عمر بھر ہنسی خوشی یہ عذاب جھیلتے رہے' ان پر دوزخ اور حمیم حرام ہیں۔

کافی امریکہ کا قومی مشروب ہے۔ میں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلا' یا کافی کلچر کے زور سے رائج ہوئی۔ یہ بعینہ ایسا سوال ہے جیسے کوئی بے ادب یہ پوچھ بیٹھے کہ ''غبار خاطر'' چائے کی وجہ سے مقبول ہوئی یا چائے ''غبارِ خاطر'' کے باعث؟ ایک صاحب نے مجھے لاجواب کرنے کی خاطر یہ دلیل پیش کی امریکہ میں تو کافی اس قدر عام ہے کہ جیل میں بھی پلائی جاتی ہے۔ عرض کیا کہ جب خود قیدی اس پر احتجاج نہیں کرتے تو ہمیں کیا پڑی کہ وکالت کریں۔ پاکستانی جیلوں میں بھی قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جائے تو انسداد جرائم میں کافی مدد ملے گی۔ پھر انہوں نے بتلایا کہ وہاں لا علاج مریضوں کو بشاش رکھنے کی غرض سے کافی پلائی جاتی ہے۔ کافی کے سریع التاثیر ہونے میں کیا کلام ہے۔ میرا خیال ہے کہ دم نزع حلق میں پانی چوانے کے بجائے کافی کے دو چار قطرے ٹپکا دیے جائیں تو مریض کا دم آسانی سے نکل جائے۔ بخدا' مجھے تو اس تجویز پر بھی اعتراض نہ ہوگا کہ گناہ گاروں کی فاتحہ کافی پر دلائی جائے۔

سنا ہے بعض روادار افریقی قبائل کھانے کے معاملہ میں جانور اور انسان کے گوشت کو مساوی درجہ دیتے تھے۔ لیکن جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے' ہم نے ان کے بارے میں کوئی بری بات نہیں

سی۔ مگر ہم تو چینیوں کی رچی ہوئی حس شامہ کی داد دیتے ہیں کہ نہ منگول حکمرانوں کا جبر وتشدد انہیں پنیر کھانے پر مجبور کر سکا اور نہ امریکہ انہیں کافی پینے پر آمادہ کر سکا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان کی نفاست نے سخت قحط کے زمانے میں بھی فاقے اور اپنے فلسفے کو پنیر اور کافی پر ترجیح دی۔

ہمارا منشا امریکی یا چینی عادات پر نکتہ چینی نہیں۔ ہر آزاد قوم کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنے منہ اور معدے کے ساتھ جیسا سلوک کرنا چاہے' بے روک ٹوک کرے۔ اس کے علاوہ جب دوسری قومیں ہماری رساول' نہاری اور فالودے کا مذاق نہیں اڑاتیں تو ہم دخل در ما کولات کرنے والے کون؟ بات دراصل یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں پیاس بجھانے کے لیے پانی کے علاوہ ہر رقیق شئے استعمال ہوتی ہے۔ سنا ہے جرمنی میں (جہاں قومی مشروب بیئر ہے) ڈاکٹر بدرجہ مجبوری بہت ہی تندرست و توانا افراد کو خالص پانی پینے کی اجازت دیتے ہیں' لیکن جن کو آب نوشی کا چسکا لگ جاتا ہے' وہ راتوں کو چھپ چھپ کر پانی پیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ پیرس کے کیفوں میں رنگین مزاج فنکار بورژوا طبقہ کو چڑانے کی غرض سے کھلم کھلا پانی پیا کرتے تھے۔

مشرقی اور مغربی مشروبات کا موازنہ کرنے سے پہلے یہ بنیادی اصول ذہن نشین کر لینا از بس ضروری ہے کہ ہمارے یہاں پینے کی چیزوں میں کھانے کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اپنے قدیم مشروبات مثلاً یخنی' ستو اور فالودے پر نظر ڈالیے تو یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ستو اور فالودے کو خالصتاً لغوی معنوں میں نہ آپ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں بلکہ دنیا میں اگر کوئی ایسی شے ہے جسے آپ با محاورہ اُردو میں بیک وقت کھا پی سکتے ہیں تو یہی ستو اور فالودہ ہے جو ٹھوس غذا اور ٹھنڈے شربت کے درمیان ایک ناقابل بیان سمجھوتہ ہے، لیکن آج کل ان مشروبات کا استعمال خاص خاص تقریبوں میں ہی کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اب ہم نے عداوت نکالنے کا ایک اور مہذب طریقہ اختیار کیا ہے۔

آپ کے ذہن میں خدانخواستہ یہ شبہ نہ پیدا ہو گیا ہو کہ راقم السطور کافی کے مقابلے میں چائے کا طرف دار ہے تو مضمون ختم کرنے سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کافی سے اس لئے بیزار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے پھونک کر پیتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چائے کے ارماں ہوں گے

☆☆☆

چارپائی اور کلچر

ایک فرانسیسی مفکر کہتا ہے کہ موسیقی میں مجھے جو بات پسند ہے وہ دراصل وہ حسین خواتین ہیں جو اپنی ننھی ننھی ہتھیلیوں پر ٹھوڑیاں رکھ کر اسے سنتی ہیں۔ یہ قول میں نے اپنی بریت میں اس لیے نقل نہیں کیا کہ میں جو قوالی سے بیزار ہوں تو اس کی اصل وجہ وہ بزرگ ہیں جو محفل سماع کو رونق بخشتے ہیں۔ اور نہ میرا یہ دعویٰ کہ میں نے پیانو اور پلنگ کے درمیان کوئی ثقافتی رشتہ دریافت کرلیا ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ پہلی بار بان کی کھری چارپائی کی چرچراہٹ اور ادوان کا تناؤ دیکھ کر بعض نووارد سیاح اسے سارنگی کے قبیل کا ایشیائی ساز سمجھتے ہیں۔ کہنا یہ تھا کہ میرے نزدیک چارپائی کی دلکشی کا سبب وہ خوش باش لوگ ہیں جو اس پر اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے شخصی اور قومی مزاج کے پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے کہ کسی شخص کی شائستگی و شرافت کا اندازہ آپ صرف اس سے لگا سکتے ہیں کہ وہ فرصت کے لمحات میں کیا کرتا ہے اور رات کو کس قسم کے خواب دیکھتا ہے۔

چارپائی ایک ایسی خود کفیل تہذیب کی آخری نشانی ہے جو نئے تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نت نئی چیزیں ایجاد کرنے کی قائل نہ تھی بلکہ ایسے نازک مواقع پر پرانی چیزوں میں نئی خوبیاں دریافت کرکے مسکرا دیتی تھی۔ اس عہد کی رنگا رنگ مجلسی زندگی کا تصور چارپائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا خیال آتے ہی ذہن کے افق پر بہت سے سہانے منظر اُبھر آتے ہیں ...... اُجلی اُجلی ٹھنڈی چادریں، خس کے پنکھے، کچی مٹی کی سن سن کرتی کوری صراحیاں، چھڑکاؤ سے بھیگی زمین کی سوندھی سوندھی لپٹ اور آم کے لدے پھندے درخت جن میں آموں کے بجائے لڑکے لٹکے رہتے ہیں...... اور ان کی چھاؤں میں جوان جسم کی طرح کسی کسائی ایک چارپائی جس پر دن بھر شطرنج کی بساط یا رمی کی پھڑ جمی اور جو شام کو دسترخوان بچھا کر کھانے کی میز بنائی گئی۔ ذرا غور سے دیکھیے تو یہ وہی چارپائی ہے جس کی سیڑھی بنا کر سگھڑ بیویاں مکڑی کے جالے اور چلبلے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے اتارتے ہیں۔ اسی چارپائی کو وقت ضرورت پٹیوں سے بانس باندھ کر اسٹریچر بنالیتے ہیں اور بجوگ پڑ جائے تو انہیں بانسوں سے ایک دوسرے کو اسٹریچر کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مریض جب کھاٹ سے لگ جائے تو تیماردار مؤخر الذکر کے وسط میں بڑا سا سوراخ کرکے اول الذکر کی مشکل آسان کردیتے ہیں۔ اور جب ساون میں اُودی اُودی گھٹائیں اُٹھتی ہیں تو ادوان کھول کر لڑکیاں

دروازے کی چوکھٹ اور والدین چار پائیوں میں جھولتے ہیں۔ اسی پر بیٹھ کر مولوی صاحب قمچی کے ذریعہ اخلاقیات کے بنیادی اصول ذہن نشین کراتے ہیں۔ اسی پر نومولود بچے غاؤں غاؤں کرتے' چندھیائی ہوئی آنکھیں کھول کر اپنے والدین کو دیکھتے ہیں اور روتے ہیں اور اسی پر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پیاروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ بعض حضرات اس مضمون کو چار پائی کا پرچہ ترکیب استعمال سمجھ لیں گے تو اس ضمن میں کچھ اور تفصیلات پیش کرتا لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کر چکا ہوں یہ مضمون اس تہذیبی علامت کا قصیدہ نہیں' مرثیہ ہے۔ تاہم بہ نظر احتیاط اتنی وضاحت ضروری ہے کہ:

ہم اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی

نام کی مناسبت سے پائے اگر چار ہوں تو انسب ہے ورنہ اس سے کم ہوں' تب بھی خلق خدا کے کام بند نہیں ہوتے۔ اسی طرح پایوں کے حجم اور شکل کی بھی تخصیص نہیں۔ انہیں سامنے رکھ کر آپ غبی سے غبی لڑکے کو اقلیدس کی تمام شکلیں سمجھا سکتے ہیں۔ اور اس مہم کو سر کرنے کے بعد آپ کو احساس ہوگا کہ ابھی کچھ شکلیں ایسی رہ گئی ہیں جن کا نہ صرف اقلیدس بلکہ تجریدی مصوری میں بھی کوئی ذکر نہیں۔ دیہات میں ایسے پائے بہت عام ہیں جو آدھے پٹیوں سے نیچے اور آدھے اُوپر نکلے ہوتے ہیں۔ ایسی چار پائی کا الٹا سیدھا دریافت کرنے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ جس طرف بان صاف ہو وہ ہمیشہ ''الٹا'' ہوگا۔ راقم الحروف نے ایسے ان گھڑ پائے دیکھے ہیں جن کی ساخت میں بڑھئی نے محض یہ اصول مدنظر رکھا ہوگا کہ بسولہ چلائے بغیر پیڑ کو اپنی قدرتی حالت میں جوں کا توں پٹیوں سے وصل کر دیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہماری نظر سے خراد کے بنے ایسے سڈول پائے بھی گزرے ہیں جنہیں چوڑی دار پاجامہ پہنانے کو جی چاہتا ہے۔ اس قسم کے پایوں سے منٹو مرحوم کو جو والہانہ عشق رہا ہوگا اس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک دوست سے ایک میم کی حسین ٹانگیں دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں کیا۔ کہنے لگے:

''اگر مجھے ایسی چار ٹانگیں مل جائیں تو انہیں کٹوا کر اپنے پلنگ کے پائے بنوالوں۔''

غور کیجیے تو مباحثے اور مناظرے کے لیے چار پائی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ فریقین آمنے سامنے نہیں بلکہ عموماً اپنے حریف کی پیٹھ کا سہارا لے کر آرام سے بیٹھتے ہیں اور بحث وتکرار کے لیے اس سے بہتر طرز نشست ممکن نہیں۔ کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ فریقین کو ایک دوسرے کی صورت نظر نہ آئے تو کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر میرا عرصے سے یہ خیال ہے کہ اگر بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوئے ہوتے تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ لدی پھندی چار پائیوں پر لوگ پیٹ بھر کے اپنوں کی غنیمت کرتے ہیں مگر دل

بُرے نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ سبھی جانتے ہیں کہ غیبت اُسی کی ہوتی ہے جسے اپنا سمجھتے ہیں۔ اور کچھ یوں بھی ہے کہ ہمارے ہاں غیبت سے مقصود قطعِ محبت ہے نہ گزارشِ احوالِ واقعی بلکہ محفل میں

لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

لوگ گھنٹوں چار پائی پر کسمساتے رہتے ہیں مگر کوئی اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ اس لیے کہ ہر شخص اپنی جگہ بخوبی جانتا ہے کہ اگر وہ چلا گیا تو فوراً اس کی غیبت شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ پچھلے پہر تک مرد ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے بحث کرتے ہیں اور عورتیں گال سے گال بھڑائے کچر کچر لڑتی رہتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مرد پہلے بحث کرتے ہیں، پھر لڑتے ہیں۔ عورتیں پہلے لڑتی ہیں اور بعد میں بحث کرتی ہیں۔ مجھے ثانی الذکر طریقہ زیادہ معقول نظر آتا ہے، اس لیے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ ایک چار پائی پر بیک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں تو گزارش ہے کہ چار پائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو کھڑا نہیں دیکھا۔ لیکن اس نوع کے نظریاتی مسائل میں اعداد و شمار پر بے جا زور دینے سے بعض اوقات عجیب و غریب نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ جس وقت مسلمانوں نے اُندلس فتح کیا تو وہاں کے بڑے گرجا میں چوٹی کے مسیحی علما و فقہا اس مسئلہ پر کمال سنجیدگی سے بحث کر رہے تھے کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں۔

ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ تنگ سے تنگ چار پائی پر بھی لوگ ایک دوسرے کی طرف پاؤں کیے اُا کی شکل میں سوتے رہتے ہیں۔ چنچل ناری کا چیتے جیسا اجیت بدن ہو یا کسی عمر رسیدہ کی کمان جیسی خمیدہ کمر...... یہ اپنے آپ کو ہر قالب کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اس میں بڑی وسعت ہے بلکہ اتنی لچک بھی ہے کہ آپ جس آسن چاہیں بیٹھ اور لیٹ جائیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ بیٹھنے اور لیٹنے کی جو درمیانی صورتیں ہمارے ہاں صدیوں سے رائج ہیں ان کے لیے یہ خاص طور سے موزوں ہے۔ یوروپین فرنیچر سے مجھے کوئی چڑ نہیں، لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ایشیائی مزاج نیم خیزی اور نیم درازی کے جن زاویوں اور آسائشوں کا عادی ہو چکا ہے، وہ اس میں میسر نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر صوفے پر ہم اکڑوں نہیں بیٹھ سکتے۔ کوچ پر دستر خوان نہیں بچھا سکتے۔ اسٹول پر قیلولہ نہیں کر سکتے۔ اور کرسی پر، بقول اخلاق احمد، اُردو میں نہیں بیٹھ سکتے۔

ایشیا نے دنیا کو دو نعمتوں سے روشناس کیا۔ چائے اور چار پائی! اور ان میں یہ خاصیت مشترک ہے کہ دونوں سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہیں۔ اگر گرمی میں لوگ کھری چار پائی پر سوار رہتے ہیں تو برسات میں یہ لوگ پر سوار رہتی ہے اور کھلے میں سونے کے رسیا اسے اندھیری راتوں میں برآمدے سے صحن اور صحن سے برآمدے میں سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں۔ پھر مہاوٹ میں

سردی اور بان سے بچاؤ کے لیے لحاف اور توشک نکالتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ سردی روئی سے جاتی ہے یا دوئی سے۔ لیکن اگر یہ اسباب ناپید ہوں اور سردی زیادہ اور لحاف پتلا ہوتو غریب غربا محض منٹو کے افسانے پڑھ کر سو رہتے ہیں۔

عربی میں اونٹ کے اتنے نام ہیں کہ دور اندیش مولوی اپنے ہونہار شاگردوں کو پاس ہونے کا یہ گر بتاتے ہیں کہ اگر کسی مشکل یا کڈھب لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں تو سمجھ لو کہ اس سے اونٹ مراد ہے۔ اسی طرح اردو میں چار پائی کی جتنی قسمیں ہیں اس کی مثال اور کسی ترقی یافتہ زبان میں شاید ہی مل سکے:۔

کھاٹ' کھٹا' کھٹیا' کھٹور' اُڑن کھٹولہ' کھٹولی' کھٹ' چھپرکھٹ' کھرا' کھری' جھلگا' پلنگ' پلنگڑی' ماچ' ماچی' ماچا' چار پائی' نواری' مسہری' منجی۔

یہ نامکمل سی فہرست صرف اُردو کی وسعت ہی نہیں بلکہ چار پائی کی ہمہ گیری پر وال ہے اور ہمارے تمدن میں اس کا مقام و مرتبہ متعین کرتی ہے۔

لیکن چار پائی کی سب سے خطرناک قسم وہ ہے جس کے بچے کھچے اور ٹوٹے اُدھڑے بانوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے محض اپنی قوت ایمان کے زور سے اٹکے رہتے ہیں۔ اس قسم کے جھلنگے کو بچے بطور جھولا اور بڑے بوڑھے آلہ تزکیہ نفس کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اونچے گھرانوں میں اب ایسی چار پائیوں کو غریب رشتے داروں کی طرح کونوں کھدروں میں آڑے وقت کے لیے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ خود مجھے مرزا عبدالودود بیگ کے ہاں ایک رات ایسی ہی چار پائی پر گزارنے کا اتفاق ہوا جس پر لیٹتے ہی اچھا بھلا آدمی نون غنہ (ں) بن جاتا ہے۔

اس میں داخل ہو کر میں ابھی اپنے اعمال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ یکا یک اندھیرا ہو گیا' جس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ایک دوسرا ملازم اوپر ایک دری اور بچھا گیا۔ اس خوف سے کہ دوسری منزل پر کوئی اور سواری نہ آجائے' میں نے سر سے دری پھینک کر اٹھنے کی کوشش کی تو گھٹنے بڑھ کے پیشانی کی بلائیں لینے لگے۔ کھڑ بڑ سن کر مرزا خود آئے اور چیخ کر پوچھنے لگے کہ بھائی آپ ہیں کہاں؟ میں نے مختصراً اپنے محل وقوع سے آگاہ کیا تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ انہیں کافی زور لگانا پڑا اس لیے کہ میرا سر اور پاؤں بانوں میں بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے اور بان سر سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئے۔ بمشکل تمام انہوں نے مجھے کھڑا کیا۔

اور میرے ساتھ ہی بلکہ مجھ سے کچھ پہلے' چار پائی بھی کھڑی ہو گئی!

کہنے لگے ''کیا بات ہے؟ آپ کچھ بے قرار سے ہیں۔ معدے کا فعل درست نہیں معلوم ہوتا۔''

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دوڑ کر اپنا تیار کردہ چورن لے آئے اور اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں ڈالا۔ پھنکی منہ میں بھر کر شکریہ کے دو چار لفظ ہی کہنے پایا ہوں گا کہ معاً نظر ان کے مظلوم منہ پر

پڑ گئی جو حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ میں بہت نادم ہوا۔ لیکن قبل اس کے کہ کچھ اور کہوں انہوں نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ پھر مجھے آرام کرنے کی تلقین کر کے منہ دھونے چلے گئے۔

میں یہ چارپائی اوڑھے لیٹا تھا کہ ان کی منجھلی بچی آنکلی۔ تتلا کر پوچھنے لگی:

''چچا جان! اکڑوں کیوں بیٹھے ہیں؟''

بعد ازاں سب بچے مل کر اندھا بھینسا کھیلنے لگے۔ بالآخر اُن کی امّی کو مداخلت کرنا پڑی۔

''کم بختو! اب تو چپ ہو جاؤ! کیا گھر کو بھی اسکول سمجھ رکھا ہے؟''

چند منٹ بعد کسی شیر خوار کے دہاڑنے کی آواز آئی۔ مگر جلد ہی یہ چیخیں مرزا کی لوریوں میں دب گئیں جن میں وہ ڈانٹ ڈانٹ کر نیند کو آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ چند لمحوں بعد مرزا اپنے نقش فریادی کو سینہ سے چمٹائے میرے پاس آئے اور انتہائی لجاجت آمیز لہجے میں بولے:

''معاف کیجئے! آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر منو میاں آپ کی چارپائی کے لیے ضد کر رہے ہیں۔ انہیں دوسری چارپائی پر نیند نہیں آتی۔ آپ میری چارپائی پر سو جائیے' میں اپنی فولڈنگ چارپائی پر پڑ رہوں گا۔''

میں نے بخوشی منو میاں کا حق منو میاں کو سونپ دیا اور جب اس میں جھولتے جھولتے ان کی آنکھ لگ گئی تو ان کے والد بزرگوار کی زبان تالو سے لگی۔

اب سنئے مجھ پر کیا گزری۔ مرزا خود تو فولڈنگ چارپائی پر چلے گئے مگر جس چارپائی پر مجھ کو بطور خاص منتقل کیا گیا' اس کا نقشہ یہ تھا کہ مجھے اپنے ہاتھ اور ٹانگیں احتیاط سے تہ کر کے بالترتیب سینہ اور پیٹ پر رکھنی پڑیں۔ اس شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے یوں دو چشمی ھ بنا' یونانی میزبان پر وقراط کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے پاس دو چارپائیاں تھیں۔ ایک لمبی اور دوسری چھوٹی۔ ٹھنگنے مہمان کو وہ لمبی چارپائی پر سلاتا اور کھینچ تان کر اس کا جسم چارپائی کے برابر کر دیتا۔ اس کے برعکس لمبے آدمی کو وہ چھوٹی چارپائی دیتا اور جسم کے زائد حصوں کو کاٹ چھانٹ کر ابدی نیند سلا دیتا۔

اس کے حدود اربعہ کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ انگڑائی لینے کے لیے مجھے تین چار مرتبہ نیچے کودنا پڑا۔ کودنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اس کی اونچائی ''درمیانہ'' تھی۔ یہاں درمیانہ سے ہماری مراد وہ پست بلندی یا موزوں سطح مرتفع ہے' جس کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو کہ:

ع نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے

گو کہ ظاہر بین نگاہ کو یہ متوازی الاضلاع نظر آتی تھی مگر مرزا نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ بارش سے پیشتر یہ مستطیل تھی۔ البتہ بارش میں بھیگنے کے سبب جو کان آ گئی تھی' اس سے مجھے کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ مرزا نے ازراہ تکلف ایک پائے کے نیچے ڈکشنری اور دوسرے کے نیچے میرا نیا جوتا رکھ کر سطح درست کر دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تہذیب کے جس نازک دور میں غیور

مرد چار پائی پر دم توڑنے کے بجائے میدان جنگ میں دشمن کے ہاتھوں بے گوروکفن مرنا پسند کرتے تھے۔ اسی قسم کی مردم آزاد چار پائیوں کا رواج ہوگا لیکن اب جب کہ دشمن سیانے اور چار پائیاں زیادہ آرام دہ ہوگئی ہیں۔ مرنے کے اور بھی معقول اور باعزت طریقے دریافت ہوگئے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے ہاں ایک اوسط درجہ کے آدمی کی دوتہائی زندگی چار پائی پر گزرتی ہے۔ اور بقیہ اس کی آرزو میں! بالخصوص عورتوں کی زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے جو بساط محفل بھی ہے اور مونس تنہائی بھی۔ اس کے سہارے وہ تمام مصائب انگیز کرلیتی ہیں۔ خیر مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کرلیتے ہیں مگر عورتیں اس لحاظ سے قابل ستائش ہیں کہ انہیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مئی جون کی جھلسادینے والی دوپہر میں کنواریاں بالیاں چار پائی کے نیچے ہنڈ کلھیا پکاتی ہیں اور اوپر بڑی بوڑھیاں بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرکے ایک دوسرے کا لہو گرماتی رہتی ہیں (قاعدہ ہے کہ جیسے جیسے حافظہ کمزور ہوتا جاتا ہے، ماضی اور بھی سہانا معلوم ہوتا ہے!) اسی پر بوڑھی ساس تسبیح کے دانوں پر صبح و شام اپنے پوتوں اور نواسوں کی گنتی رہتی ہے اور گڑ گڑا گڑ گڑا کر دعا مانگتی ہے کہ خدا اس کا سایہ بہو کے سر پر رہتی دنیا تک قایم رکھے۔ خیر سے بہری بھی ہے۔ اس لیے بہو اگر سانس لینے کے لیے بھی منہ کھولے تو گمان ہوتا ہے کہ مجھے کوس رہی ہوگی۔ قدیم داستانوں کی روٹھی رانی اسی پر اپنے جوڑے کا تکیہ بنائے اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑتی تھی اور آج بھی سہاگنیں اسی کی اوٹ میں ادوان میں سے ہاتھ نکال کر پانچ اُنگل کی کلائی میں تین اُنگل کی چوڑیاں پہنتی اور گھشتی نجومیوں کو ہاتھ دکھا کر اپنے بچوں اور سوکنوں کی تعداد پوچھتی ہیں۔ لیکن جن بھاگوانوں کو گود بھری ہوئی کے بھرے پرے گھر میں آپ کو چار پائی پر پوتڑے اور سویاں ساتھ ساتھ سوکھتی نظر آئیں گی۔ گھٹنیوں چلتے بچے اسی کی پٹی پکڑ کر میوں میوں چلنا سیکھتے ہیں اور رات برات پائینتی سے قدمچوں کا کام لیتے ہیں۔ لیکن جب ذرا سمجھ آجاتی ہے تو اسی چار پائی پر صاف ستھرے تکیوں سے لڑتے ہیں۔ نامور پہلوانوں کے بچپن کی چھان بین کی جائے تو پتہ چلے گا کہ انہوں نے قینچی اور دھوبی پاٹ جیسے خطرناک داؤ اسی محفوظ اکھاڑے میں سیکھے۔

جس زمانے میں وزن کرنے کی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی تو شائستہ عورتیں چوڑیوں کے تنگ ہونے اور مرد چار پائی صرف میزان جسم ہی نہیں بلکہ معیار اعمال بھی تھی۔ نتیجہ یہ کہ جنازے کو کندھا دینے والے چار پائی کے بان کے دباؤ سے دوسروں کے وزن کا تخمینا کرتے تھے۔ اس زمانے میں چار پائی صرف میزان جسم ہی نہیں بلکہ معیار اعمال بھی تھی نتیجہ یہ کہ جنازہ کا کندھا دینے والے چار پائی کے وزن کی بنا پر مرحوم کے جنتی یا اس کے برعکس ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ہمارے ہاں دبلے آدمی کی دنیا اور موٹے کی عقبےٰ عام طور سے خراب ہوتی ہے۔

برصغیر میں چند علاقے ایسے بھی ہیں جہاں اگر چار پائی کو آسمان کی طرف پائینتی کرکے کھڑا

کر دیا جائے تو ہمسائے تعزیت کو آنے لگتے ہیں۔ سوگ کی یہ علامت بہت پرانی ہے گو کہ دیگر علاقوں میں یہ عموری (1) نہیں، افقی (.........) ہوتی ہے۔ اب بھی گنجان محلوں میں عورتوں اسی عام فہم استعارے کا سہارا لے کر کوستی سنائی دیں گی۔ ''الہٰی! تن تن کوڑھ ٹپکے۔ مچچاتی ہوئی کھاٹ نکلے!'' دوسرا بھرپور جملہ بددعا ہی نہیں بلکہ وقت ضرورتہایت جامع و مانع سوانح عمری کا کام بھی دے سکتا ہے کیونکہ اس میں مرحومہ کی عمر، نامرادی، وزن اور ڈیل ڈول کے متعلق نہایت بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ نیز اس بات کی سند ملتی ہے کہ راہی ملک عدم نے وہی کم خرچ بالانشین وسیلہ نقل وحمل اختیار کیا جس کی جانب میر اشارہ کر چکے ہیں:

تری گلی میں سدا اے کشندہ عالم
ہزاروں آتی ہوئی چار پائیاں دیکھیں

قدرت نے اپنی رحمت سے صفائی کا کچھ ایسا انتظام رکھا ہے کہ ہر ایک چار پائی کو سال میں کم از کم دو مرتبہ کھولتے پانی سے دھارنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو نفاست پسند حضرات جان لینے کا یہ طریقہ جائز نہیں سمجھتے وہ چار پائی کو اُلٹا کر کے چلچلاتی دھوپ میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر دن بھر گھر والے کھٹمل اور محلے والے عبرت پکڑتے ہیں۔ اہل نظر چار پائی کی چولوں میں رہنے والی مخلوق کی جسامت اور رنگت پر ہی سونے والوں کی صحت اور حسب نسب کا قیاس کرتے ہیں (واضح رہے کہ یوروپ میں گھوڑوں اور کتوں کے سوا کوئی کسی کا حسب نسب نہیں پوچھتا) اُلٹی چار پائی کو قرنطینہ کی علامت جان کر راہ گیر راستہ بدل دیں تو تعجب نہیں۔ حد یہ ہے کہ فقیر بھی ایسے گھروں کے سامنے صدا لگانا بند کر دیتے ہیں۔

چار پائی سے جو پُر اسرار آوازیں نکلتی ہیں، ان کا مرکز دریافت کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ برسات کی اندھیری رات میں یہ کھوج لگانا کہ مینڈک کے ٹرانے کی آواز کدھر سے آئی یا یہ تشخیص کرنا کہ آدھی رات کو بلبلاتے ہوئے شیر خوار بچے کے درد کہاں اُٹھ رہا ہے۔ چرچراتی ہوئی چار پائی کو میں نہ گل نغمہ سمجھتا ہوں، نہ پردۂ ساز، اور نہ اپنی شکست کی آواز! درحقیقت یہ آواز چار پائی کا اعلان صحت ہے کیونکہ اس کے ٹوٹتے ہی یہ بند ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک خود کار الارم کی حیثیت سے یہ شب بیداری اور سحر خیزی میں مدد دیتی ہے۔ بعض چار پائیاں اس قدر چغل خور ہوتی ہیں کہ ذرا کروٹ بدلیں تو دوسری چار پائی والا کلمہ پڑھتا ہوا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اگر پاؤں بھی سکیڑیں تو کتے اتنے زور سے بھونکتے ہیں کہ چوکیدار تک جاگ اٹھتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ لوگ رات بھر نہ صرف ایک دوسرے کی جان و مال بلکہ چال چلن کی بھی چوکیداری کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ ہی بتائیے کہ رات کو آنکھ کھلتے ہی نظر سب سے پہلے پاس والی چار پائی پر کیوں جاتی ہے؟

☆☆☆

صبغے اینڈ سنز

سوداگران وناشران کتب

یہ اس پُر اُمید زمانے کا ذکر ہے، جب انہیں کتابوں کی دکان کھولے اور ڈیل کارنیگی پڑھے دو تین مہینے ہوئے ہوں گے اور جب ان کے ہونٹوں پر ہروقت وہ دھلی منجھی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، جو آج کل صرف ٹوتھ پیسٹ کے اشتہاروں میں نظر آتی ہے۔ اس زمانے میں ان کی باتوں میں وہ اُڑ کر لگنے والا جوش اور ولولہ تھا جو بالعموم انجام سے بے خبر سٹے بازوں اور نومسلموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔

دکان کیا تھی، کسی بگڑے ہوئے رئیس کی لائبریری تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے چن چن کر وہی کتابیں دکان میں رکھی ہیں، جو خود ان کو پسند تھیں اور جن کے متعلق انہوں نے ہر طرح اپنا اطمینان کرلیا تھا کہ بازار میں ان کی کوئی مانگ ہے نہ کھپت۔ ہمارے دوست مرزا عبدالودود بیگ نے دکان میں قدم رکھتے ہی اپنی تمام ناپسندیدہ کتابیں اس خوش سلیقگی سے یکجا دیکھیں تو ایک دفعہ اپنی پرانی عینک پر اعتبار نہیں آیا اور جب اعتبار آگیا تو الٹا پیار آنے لگا۔ اپنے مخصوص کھٹ مٹھے لہجے میں بولے ''یار! اگر عام پسند کی بھی دو چار کتابیں رکھ لیتے تو گاہک دکان سے اس طرح نہ جاتے، جیسے سکندر دنیا سے گیا تھا............دونوں ہاتھ خالی!''

تاجرانہ تبسم کے بعد فرمایا ''میں صرف معیاری کتابیں بیچتا ہوں۔''

پوچھا ''معیاری کی کیا پہچان؟''

ارشاد ہوا ''سنو! میرے ایک قریبی ہمسایے ہیں۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس، چوبیس گھنٹے کتابوں میں جٹے رہتے ہیں۔ لہٰذا میں نے کیا یہ کہ دکان کھولنے سے پہلے ان سے ان کی اپنی پسندیدہ کتابوں کی مکمل فہرست بنوالی۔ پھر ان کتابوں کو چھوڑ کر اردو کی بقیہ تمام کتابیں خرید کے دکان میں سجادیں۔ اب اس سے بہتر انتخاب کوئی کر کے دکھادے۔''

پھر ایکا ایکی تاجرانہ لہجہ بنا کر صیغۂ جمع میں بنکارے ''ہماری کتابیں اُردو ادب کی آبرو ہیں۔''

''اور ہم یہ بہت ارزاں بیچتے ہیں!'' مرزا نے اسی لہجے میں جملہ پورا کیا۔

مصیبت یہ تھی کہ ہر کتاب، ہر مصنف کے متعلق ان کی اپنی رائے تھی۔ بے لاگ اور اٹل، جس کا اظہار و اعلان بالجبر وہ بمنزلہ دینی فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ انہوں نے گاہک کو کتاب

خریدنے سے جبراً باز رکھا کہ اس سے اس کا ادبی ذوق خراب تر ہونے کا اندیشہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کتب فروش کم اور کتب نما زیادہ تھے۔ کبھی کوئی خریدار ہلکی پھلکی کتاب مانگ بیٹھتا تو بڑی شفقت سے جواب دیتے ''یہاں سے دو گلیاں چھوڑ کر سیدھے ہاتھ کو مڑ جایئے۔ پرلے نکڑ پر چوڑیوں کی دکان کے پاس ایک لیٹر بکس نظر آئے گا۔ اس کے ٹھیک سامنے جو اونچی سی دکان ہے۔ بچوں کی کتابیں وہیں ملتی ہیں۔'' ایک مرتبہ کا واقعہ اب تک یاد ہے کہ ایک صاحب کلیات مومن پوچھتے ہوئے آئے اور چند منٹ بعد مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی نظموں کا گلدستہ ہاتھ میں لیے ان کی دکان سے نکلے۔

ایک دن میں نے پوچھا اختر شیرانی کی کتابیں کیوں نہیں رکھتے؟ مسکرائے۔ فرمایا وہ نابالغ شاعر ہے۔ میں سمجھا شاید MINOR POET کا وہ یہی مطلب سمجھتے ہیں۔ میری حیرانی دیکھ کر خود ہی وضاحت فرمادی کہ وہ وصل کی اس طور پر فرمائش کرتا ہے گویا کوئی بچہ ٹافی مانگ رہا ہے۔ اس پر میں نے اپنے ایک محبوب شاعر کا نام لے کر کہا کہ بچارے ہوش ملیح آبادی نے کیا خطا کی ہے؟ ان کے مجموعے بھی نظر نہیں آتے۔ ارشاد ہوا کہ اس ظالم کے تقاضائے وصل کے یہ تیور ہیں گویا کوئی کابلی پٹھان ڈانٹ ڈانٹ کر ڈوبی ہوئی رقم وصول کر رہا ہے۔ میں نے کہا مگر وہ زبان کے بادشاہ ہیں۔ بولے ٹھیک کہتے ہو۔ زبان کے گھر کی لونڈی ہے اور وہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں! عاجز ہو کر میں نے کہا اچھا، یوں ہی سہی، مگر فانیؔ بدایونی کیوں غائب ہیں؟ فرمایا ہش! وہ نرے مصور غم ہیں! میں نے کہا بجا! مگر مہدی الافادی تو کامل انشاء پرداز ہیں۔ بولے چھوڑو بھی! فانیؔ مصور غم ہیں تو مہدی مصور بنت عم! واللہ! وہ انشائیہ نہیں، نسائیہ لکھتے ہیں۔ بالآخر میں نے ایک جانے پہچانے پروفیسر نقاد کا نام لیا، مگر پتہ چلا کہ انہوں نے اپنے کانوں سے فاضل پروفیسر کے والد بزرگوار کو لکھنو کو نکھلؤ اور مزاج شریف کو مجاز شریف کہتے سنا تھا۔ چنانچہ اس پدرانہ نا اہلی کی بنا پر ان کے تنقیدی مضامین دکان میں کبھی بار نہ پا سکے۔ یہی نہیں خود پروفیسر موصوف نے ایک محفل میں ان کے سامنے غالبؔ کا ایک مشہور شعر غلط پڑھا اور دوہرے ہو ہو کر داد وصول کی، سوا لگ! میں نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بولے، فرق کی ایک ہی رہی! میرن صاحب کا قصہ بھول گئے؟ کسی نے ان کے سامنے غالبؔ کا شعر غلط پڑھ دیا۔ تیوریاں چڑھا کر بولے، میاں! یہ کوئی قرآن و حدیث ہے۔ جیسے چاہا، پڑھ دیا۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ بہت سی کتابیں وہ اس لیے نہیں رکھتے تھے کہ ان کو سخت ناپسند تھیں اور ان کے مصنفین سے وہ کسی نہ کسی موضوع پر ذاتی اختلاف رکھتے تھے لیکن معدودے چند مصنفین جو اس معتوب و مغضوب زمرے سے خارج تھے، ان کی کتابیں دکان میں رکھتے ضرور تھے، مگر کوشش یہی ہوتی کہ کسی طرح بکنے نہ پائیں، کیونکہ وہ انہیں بے حد پسند تھیں اور انہیں سنگوا سنگوا کر رکھنے میں عجیب روحانی لذت محسوس کرتے تھے۔ پسند و ناپسند کی اس غیر تاجرانہ کشاکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ

کتب از جانہ جنبد!

سنی سنائی نہیں کہتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دیوان غالبؔ (مصور) دکان میں مہینوں پڑا رہا۔ محض اس وجہ سے کہ ان کا خیال تھا کہ دکان اس کے بغیر سونی سونی معلوم ہوگی۔ مرزا کہا کرتے تھے کہ ان کی مثال اس بدنصیب قصاب کی سی ہے، جسے بکروں سے عشق ہو جائے۔

کتابوں سے عشق کا یہ حال تھا کہ عین بوہنی اور بکری کے اوقات میں بھی مطالعے میں کمر کمر غرق رہتے۔ یہ کمر کمر کی قید اس لیے لگانا پڑی کہ ہم نے آج تک انہیں کوئی کتاب پوری پڑھتے نہیں دیکھا۔ مرزا اسی بات کو یوں کہتے تھے کہ بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو اپنے کو ان سے پڑھوا سکی ہیں۔ یہی نہیں، اپنے مطالعے کی تکنیک کے مطابق رومانوی اور جاسوسی ان کو ہمیشہ الٹا یعنی آخر سے پڑھتے تا کہ ہیروئن کا حشر اور قاتل کا نام فوراً معلوم ہو جائے۔ ان کا قول ہے کہ معیاری ناول وہی ہے جو اس طرح پڑھنے پر بھی آخر سے شروع تک دلچسپ ہو) ہر کہیں سے دو تین صفحے الٹ پلٹ کر پوری کتاب کے متعلق بے دریغ رائے قائم کر لینا اور پھر اسے منوانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو لکھائی چھپائی دیکھ کر ہی ساری کتاب کا مضمون بھانپ لیتے۔ مجھے یاد ہے کہ اردو کی ایک تازہ چھپی ہوئی کتاب کا کاغذ اور روشنائی سونگھ کر نہ صرف اسے پڑھنے بلکہ دکان میں رکھنے سے بھی انکار کر دیا۔ ان کے دشمنوں نے اڑا رکھی تھی کہ وہ کتاب کا سرورق پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگتے ہیں اور اس عالم کشف میں جو کچھ دماغ میں آتا ہے، اس کو مصنف سے منسوب کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔

اور مصنف غریب کس شمار قطار میں ہیں۔ اپنے ادبی قیاس و قیافے کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن یہاں تک ڈینگ مارنے لگے کہ میں آدمی کی چال سے بتا سکتا ہوں کہ وہ کس قسم کی کتابیں پڑھتا رہا ہے۔ اتفاق سے اس وقت ایک بھرے بھرے پچھائے والی لڑکی دکان کے سامنے سے گزری۔ چینی قمیض اس کے بدن پر چست فقرے کی طرح کسی ہوئی تھی۔ سر پر ایک ربن سلیقے سے اوڑھے ہوئے، جسے میں ہی کیا، کوئی بھی شریف آدمی، دوپٹہ نہیں کہہ سکتا...... اس لیے کہ دوپٹہ کبھی اتنا بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ تنگ موری اور تنگ تر گھیر کی شلوار۔ چال اگرچہ کڑی کمان کا تیر نہ تھی، لیکن کہیں زیادہ مہک۔ کمان کتنی بھی اتری ہوئی کیوں نہ ہو، تیر لامحالہ سیدھا ہی آئے گا۔ ٹھمک ٹھمک کر نہیں، لیکن وہ قتالہ عالم قدم آگے بڑھانے سے پہلے ایک دفعہ جسم کے درمیانی حصے کو گھنٹے کے پدوم کی طرح دائیں بائیں یوں ہلاتی کہ بس چھری سی چل جاتی۔ نتیجہ یہ کہ متذکرہ حصہ جسم نے جتنی مسافت جنوب سے شمال تک طے کی، اتنی ہی مشرق سے مغرب تک۔ مختصر یوں سمجھئے کہ ہر گام پر ایک قدآدم صلیب + بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

''اچھا، بتاؤ، اس کی چوکھی چال سے کیا ٹپکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی چال سے تو بس اس کا چال چلن ٹپکے ہے'' مجھے آنکھ مار کر لہکتے ہوئے بولے۔
''پھر وہی بات! چال سے بتاؤ کیسی کتابیں پڑھتی ہے؟'' میں نے بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔
''پگلے! یہ تو خود ایک کتاب ہے!'' انہوں نے شہادت کی انگلی سے سڑک پر ان خوانندگان کی طرف اشارہ کیا جو ایک فرلانگ سے اس کے پیچھے پیچھے فہرست مضامین کا مطالعہ کرتے چلے آرہے تھے۔

دیکھا گیا ہے کہ وہی کتب فروش کامیاب ہوتے ہیں جو کتاب کے نام اور قیمت کے علاوہ اور کچھ جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کی ناواقفیت عامہ جس قدر وسیع ہوگی' جس قدر عمیق اور متنوع ہوگی' اتنی ہی بھرپور خود اعتمادی اور معصوم گمراہی کے ساتھ وہ بری کتاب کو اچھا کر کے بیچ سکیں گے۔ اس کے برعکس کتابیں پڑھتے پڑھتے (ادھوری ہی سہی) ہمارے ہیرو کو اسلامی ناولوں کے جوشیلے مکالمے حفظ ہو گئے تھے اور بغدادی جم خانے میں کبھی ویسی وہسکی کی زیادتی سے موصوف پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی تو دشمنانِ اسلام پر گھونسے تان تان کر تڑاق پڑاق ایسے ڈائیلاگ بولتے' جن سے شوقِ شہادت اس طرح ٹپکا پڑتا تھا کہ بیروں تک کا ایمان تازہ ہو جاتا۔

مسلسل ورق گردانی کے سبب نئی نویلی کتابیں اپنی کنواری کراری مہک اور جلد کی کساوٹ کھو چکی تھیں۔ بیشتر صفحات کے کونے کتے کے کانوں کی طرح مڑ گئے تھے اور بعض پسندیدہ اوراق کی یہ کیفیت تھی کہ

جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

اور لشکر بھی وہ جو خون کی بجائے پیک کی پچکاریاں اڑاتا ہوا گزر جائے! ایک مرتبہ ان کو بھری دکان میں اپنے ہی سائز کے ایک اسلامی ناول کا عطر نکالتے دیکھا تو مرزا نے ٹوکا...... ''لوگ اگر کسی حلوائی کو مٹھائی چکھتے دیکھ لیں تو اس سے مٹھائی خریدنی چھوڑ دیتے ہیں اور ایک تم ہو کہ ہر آئے گئے کے سامنے کتب چشی کرتے رہتے ہو!''

پھر کیا تھا' پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ پھٹ پڑے ''کتب فروشی ایک علم ہے' برخوردار! ہمارے ہاں نیم جاہل کتابیں لکھ سکتے ہیں' مگر بیچنے کے لیے باخبر ہونا ضروری ہے۔ بعینہ اسی طرح جیسے ایک اندھا سرمہ بنا سکتا ہے' مگر بیچ بازار میں کھڑے ہو کر بیچ نہیں سکتا۔ میاں! تم کیا جانو' کیسے کیسے جید جاہل سے پالا پڑتا ہے۔ (اپنی عزیز ترین کتاب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) جی میں آتی ہے' دیوانِ غالب (مع مقدمہ مولنا امتیاز علی عرشی) ان کے سر پر دے ماروں۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ دو ہفتے ہونے کو آئے۔ ایک مظلوم صورت کلرک یہاں آیا اور مجھے اس کونے میں لے جا کر کچھ شرماتے' کچھ لجاتے ہوئے کہنے لگا کہ کرشن چندر ایم۔ اے کی وہ کتاب چاہیے' جس میں ''تیری ماں کے دودھ میں حکم کا اکا'' والی گالی ہے۔ خیر' اسے جانے دو کہ اس بچارے کو دیکھ کر واقعی محسوس ہوتا تھا

کہ یہ گالی سامنے رکھ کر ہی اس کی صورت بنائی گئی ہے۔ مگر ان صاحب کو کیا کہو گے جو نئے نئے اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے ہیں۔ میرے واقف کار ہیں۔ اسی مہینے کی پہلی تاریخ کو کالج سے پہلی تنخواہ وصول کر کے سیدھے یہاں آئے اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ لگے پوچھنے' صاحب! آپ کے ہاں منٹو کی وہ کتاب بھی ہے' جس میں ''دھرن تختہ'' کے معنے ہوں؟ اور ابھی پرسوں کا ذکر ہے۔ ایک محترمہ تشریف لائیں۔ سن یہی اٹھارہ انیس کا۔ نکلتا ہوا فربہ بدن۔ اپنی گڑیا کی چولی پہنے ہوئے تھیں۔ دونوں ہتھیلیوں کی رحل بنا کر اس پر اپنا کتابی چہرہ رکھا اور لگیں کتابوں کو ٹکر ٹکر دیکھنے۔ اسی جگہ جہاں تم کھڑے ہو۔ پھر دریافت کیا' کوئی ناول ہے؟ میں نے راتوں کی نیند حرام کرنے والا ایک ناول پیش کیا۔ رحل پر سے بولیں' یہ نہیں کوئی ایسا دلچسپ ناول دیجیے کہ رات کو پڑھتے ہی نیند آجائے۔ میں نے ایک ایسا ہی غشی آور ناول نکال کر دیا۔ مگر وہ بھی نہیں جچا۔ دراصل انہیں کسی گہرے سبز گرد پوش والی کتاب کی تلاش تھی' جو ان کی خواب گاہ کے سرخ پردوں سے ''میچ'' ہو جائے۔ اس سخت معیار پر صرف ایک کتاب پوری اتری۔ وہ تھی ''استاد موٹر ڈرائیوری'' (منظوم) جس کو دراصل اردو زبان میں خودکشی کی آسان ترکیبوں کا پہلا منظوم ہدایت نامہ کہنا چاہیے۔

میں نے نوخیز خاتون کی حمایت کی' ہمارے ہاں اردو میں ایسی کتابیں بہت کم ہیں جو بغیر گرد پوش کے بھی اچھی لگیں۔ گرد پوش تو ایسا ہی ہے جیسے عورت کے لیے کپڑے۔''

''مگر ہالی وڈ میں آج کل زیادہ تر ایکٹرسیں ایسی ہیں جو اگر کپڑے پہن لیں تو ذرا بھی اچھی نہ لگیں۔'' مرزا نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

لیکن نیا نیا شوق تھا اور ابھی یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ ایسے واقعات سے ان کی طبیعت سچ مچ مکدر ہو جائے۔ ڈیل کارنیگی کے مشورے کے مطابق وہ ہر وقت مسکراتے رہتے اور ہم نے سوتے میں بھی ان کی باچھیں بطور خیر سگالی کھلی ہوئی ہی دیکھیں۔ اس زمانے میں بقول مرزا وہ چھوٹا دیکھتے نہ بڑا ہر کس و ناکس کے ساتھ ڈیل کارنیگی کیا کرتے تھے۔ حد یہ کہ ڈاکیا اگر بیرنگ خط بھی لاتا تو انعام و اکرام دے کر رخصت کرتے۔ گاہکوں کو تو ذاتی مہمان سمجھ کر بچھ بچھ جاتے اور اکثر متاع سخن کے ساتھ (اور کبھی اس کے بغیر ہی) خود بھی بک جاتے۔ سچ ہے خوش خلقی کبھی رائیگاں نہیں جاتی چنانچہ چند ہی دنوں میں دوکان چل نکلی' مگر دکانداری ٹھپ ہو گئی۔ یہ صورت تضاد اس طرح پیدا ہوئی کہ دکان پر اب ان قدردانوں کی ریل پیل رہنے لگی' جو اصل میں ان سے کوکا کولا پینے یا فون کرنے آتے اور رونق میں ایک آدھ کتاب عاریتہً لے کر ٹلتے۔ جس گاہک سے خصوصیت برتتے' اس کی پیشوائی کو بے تحاشا دوڑتے ہوئے سڑک کے اس پار جاتے۔ پھر اسے اپنے اونچے سے اسٹول پر بٹھا کر فوراً دوسرے گاہک کو چالیس قدم تک رخصت کرنے چلے جاتے۔ ہر دو رسوم کی پر تکلف ادائیگی کے دوران دکان کسی

ایک گاہک یا گروہ کی اجتماعی تحویل میں رہتی۔ نتیجہ؟ کتابوں کی قطاروں میں جابجا کھانچے پڑ گئے۔ جیسے دانت ٹوٹ گئے ہوں...... ان کے اپنے بیان کے مطابق ایک نئے گاہک کو (جس نے ابھی ابھی ''غبارِ خاطر'' کا ایک نسخہ ادھار خریدا تھا۔) پاس والے ریستوران میں مصنف کی من بھاتی چینی چائے پلانے لیے گئے۔ حلفیہ کہتے تھے کہ مشکل سے ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا ہوں گا' مگر واپس آکر دیکھا تو نوراللغات کی چوتھی جلد کی جگہ خالی تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی بے ایمان نے موقع پاتے ہی ہاتھ صاف کردیا۔ انہیں اس کی جگہ فسانۂ آزاد کی چوتھی جلد رکھنا پڑی اور آخر کو یہی سیٹ چاکسو کالج لائبریری کو بذریعہ وی۔ پی سپلائی کیا۔

چوریاں بڑھتی دیکھ کر ایک بزرگوار نے جو یوم افتتاح سے دکان پر اٹھتے بیٹھتے تھے' (بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صرف بیٹھتے تھے' اس لیے کہ ہم نے ان کو کبھی اٹھتے نہیں دیکھا) مال کی ناجائز ''نکاسی'' روکنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ ایک تعلیم یافتہ مگر ایمان دار منیجر رکھ لیا جائے۔ ہر چند کہ ان کا روئے سخن اپنی ہی طرف تھا' لیکن ایک دوسرے صاحب نے (جو خیر سے صاحب دیوان تھے اور روزانہ اپنے دیوان کی بکری کا حال پوچھنے آتے اور اردو کے مستقبل سے مایوس ہوکر لوٹتے تھے) خود کو اس اسامی کے لیے پیش ہی نہیں کیا' بلکہ شام کو اپنے گھر واپس جانے سے بھی انکار کردیا...... یہی صاحب دوسرے دن سے خزانچی جی کہلائے جانے لگے۔ صورت سے سزا یافتہ معلوم ہوتے تھے اور اگر واقعی سزا یافتہ نہیں تھے تو یہ پولیس کی عین بھلمنساہٹ تھی۔ بہر حال یہاں ان کی ذاتی سے خیانت مجرمانہ کا کوئی خدشہ نہ تھا' کیونکہ دکان کی ساری بکری مدتوں سے ادھار پر ہورہی تھی۔ یوں تو دکان میں پہلے ہی دن سے ''آج نقد کل ادھار'' کی ایک چھوڑ تین تین تختیاں لگی تھیں مگر ہم دیکھتے چلے آئے تھے کہ وہ کل کا کام آج ہی کر ڈالنے کے قائل ہیں۔ پھر یہ کہ قرض پر کتابیں بیچنے پر ہی اکتفا کرتے تو صبر آجاتا۔ لیکن آخر آخر میں یہاں تک سننے میں آیا کہ بعض گاہک ان سے نقد روپے قرض لے کر پاس والی دکان سے کتابیں خریدنے لگے ہیں۔

میں موقع کی تلاش میں تھا' لہٰذا ایک دن تخلیہ پاکر انہیں سمجھایا کہ بندۂ خدا! اگر قرض ہی دینا ہے تو بڑی رقم قرض دو تاکہ لینے والے کو یاد رہے اور تمہیں تقاضا کرنے میں شرم نہ آئے۔ یہ چھوٹے چھوٹے قرضے دے کر خلق خدا کے ایمان اور اپنے اخلاق کی آزمائش کاہے کو کرتے ہو؟ میری بات ان کے دل کو لگی۔ دوسرے ہی دن خزانچی جی سے نادہند خریداروں کی مکمل فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کرائی اور پھر خود اسی ترتیب سے ادھار وصول کرنے کا پنج روزہ منصوبہ بنا ڈالا' لیکن 'الف' ہی کی ردیف میں ایک ایسا نانہجار آن پڑا کہ چھ مہینے تک 'ب' سے شروع ہونے والے ناموں کی باری نہیں آئی۔ میں نے یہ نقشہ دیکھا تو پھر سمجھایا کہ جب یہ حضرات تمہارے پاس حروف تہجی کی

ترتیب سے قرض لینے آئے تو تم اس ترتیب سے وصول کرنے پر کیوں اڑے ہوئے ہو؟ سیدھی سی بات تھی مگر وہ منطق پر اتر آئے۔ کہنے لگے اگر دوسرے بے اصول ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بھی بے اصولا ہوجاؤں۔ دیکھتے نہیں، اسکول میں حاضری کے وقت بچوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے پکارے جاتے ہیں، مگر بچوں کو اسی ترتیب سے پیدا یا پاس ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ بولتے کیوں نہیں؟

اس کے باوجود میری نصیحت کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اب کتاب ادھار نہیں بیچتے تھے، تحفتہً دے دیا کرتے تھے۔ کہتے تھے جب رقم ڈوبنی ہی ہے تو پھر ثواب سے بھی کیوں محروم رہوں؟ ادھر کچھ عرصے سے انہوں نے بہی کھاتے لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جس کا یہ معقول جواز پیش کرتے کہ میں نقصان مایہ میں جان کے زیاں کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ مرزا نے یہ لٹس مچتی دیکھی تو ایک دن پوچھا:

''آج کل تم حکومت کے فرائض کیوں انجام دے رہے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''تم نے قوم کی مفت تعلیم کا ذمہ کیوں لے رکھا ہے؟''

اب ان کے چہرے پر دانائی کی وہ چھوٹ پڑنے لگی جو عموماً دوالہ نکلنے کے بعد طلوع ہوتی ہے۔ مرزا کا خیال ہے کہ جب تک دو تین دفعہ دوالہ نہ نکلے آدمی کو دکان داری کا سلیقہ نہیں آتا، چنانچہ اس مبارک بربادی کے بعد وہ بجھ سے گئے اور ہر شے میں اپنی کمی محسوس کرنے لگے۔ وہ دائمی (BUILT-IN) مسکراہٹ بھی غائب ہوگئی اور اب وہ بھول کر کسی گاہک سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ مبادا وہ ادھار مانگ بیٹھے۔ اکثر دیکھا کہ جوں ہی گاہک نے دکان میں قدم رکھا اور انہوں نے گھرک کر پوچھا ''کیا چاہیے؟'' ایک دن میں نے دڑبڑایا ''اندھے کو بھی نظر آتا ہے کہ کتابوں کی دکان ہے۔ پھر تم کیوں پوچھتے ہو، کیا چاہیے؟ کیا چاہیے؟'' فرمایا ''کیا کروں، بعضے بعضے کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ یہ پوچھنا پڑتا ہے''۔

کتابیں رکھنے کے گناہگار ضرور تھے۔ طوعاً و کرہاً بیچ بھی لیتے تھے۔

لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

ان کے نک چڑھے پن کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص پوچھتا ہوا آیا ''لغت ہے؟'' 'لغت' کا تلفظ اس نے 'لطف' کے وزن پر کیا۔ انہوں نے نتھنے پھلا کر جواب دیا ''اسٹاک میں نہیں ہے''۔ وہ چلا گیا تو میں نے کہا ''یہ سامنے رکھی تو ہے، تم نے انکار کیوں کردیا؟'' کہنے لگے ''یہ؟ یہ تو لغت ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس بچارے کا کام ایک لغت سے تھوڑا ہی چلے گا'' ہاں تلفظ پر یاد آیا کہ اس دور ابتلا میں انہوں نے دکان میں ایک ازکار رفتہ ریڈیو رکھ لیا تھا۔ اسی کو گود میں

لیے گھنٹوں گڑگڑاہٹ سنا کرتے تھے، جسے وہ مختلف ملکوں کے موسم کا حال کہا کرتے تھے۔ بعد میں مرزا کی زبانی غایت سمع خراشی یہ معلوم ہوئی کہ اس ریڈیائی دے کی بدولت کم از کم گاہکوں کی غلط اردو تو سنائی نہیں دیتی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ کتب فروشوں کو ہر کتاب پر اوسطاً تیس چالیس فی صد کمیشن ملتا ہے۔ بلاکدوکاوش۔ جس پیشے میں منافع کی یہ شرح عام ہو اس میں دوالہ نکالنے کے لیے غیر معمولی دل ودماغ درکار ہیں۔ اور وہ ایسے ہی دل ودماغ کے مالک نکلتے اپنی حسابی صلاحیتوں کا دستاویزی ثبوت وہ اس زمانے ہی میں دے چکے تھے، جب سہ ماہی امتحان کی کاپی میں وہ اپنا نام 'شیخ صبغت اللہ' لکھتے اور غیر سرکاری طور پر محض صبغے کہلاتے تھے۔ اسی زمانے سے وہ اپنے اس عقیدے پر سختی سے قائم ہیں کہ علم الحساب درحقیقت کسی متعصب کافر نے مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے لیے ایجاد کیا تھا۔ چنانچہ ایک دن یہ خبر سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ رات ان پر علم الحساب ہی کے کسی قاعدے کی رو سے یہ منکشف ہوا ہے کہ اگر وہ کتابیں نہ بیچیں (دکان ہی میں پڑی سڑنے دیں) تو نوے فی صد منافع ہوگا۔ منافع کی یہ اندھا دھند شرح سن کر مرزا کے بھی منہ میں پانی بھر آیا۔ لہٰذا نزدیک ترین گلی سے صبغے کے پاس وہ گر معلوم کرنے پہنچے، جس کی مدد سے وہ بھی اپنی پرانے کوٹوں کی دکان میں تالہ ٹھوک کر فی الفور اپنے دلدر دور کرلیں۔

صبغے نے کان میں لگی ہوئی پنسل کی مدد سے اپنے فارمولے کی جو تشریح کی اس کا لب لباب سلیس اردو میں یہ ہے کہ اب تک ان کا یہ معمول رہا کہ جس دن نئی کتابیں خرید کر دکان میں لگاتے، اسی دن ان پر ملنے والے چالیس فی صد منافع کا حساب (قریب قریب پائی تک) لگا کر خرچ کر ڈالتے۔ لیکن جب یہ کتابیں سال بھر تک دکان میں پڑی بھنکتی رہتیں تو ''کرسمس سیل'' میں ان گنج ہائے گراں مایہ کو پچاس فی صد رعایت پر فروخت کر ڈالتے اور اس طرح اپنے حساب کی رو سے ہر کتاب پر نوے فی صد ناجائز نقصان اٹھاتے۔ لیکن نیا فارمولا دریافت ہونے کے بعد اب وہ کتابیں یکسر فروخت ہی نہیں کریں گے، لہٰذا اپنی اس حکمت بے عملی سے نوے فی صد نقصان سے صاف بچ جائیں گے اور یہ منافع نہیں تو اور کیا ہے؟

کتب فروشی کے آخری دور میں جب ان پر پیمبری وقت پڑا تو ہر ایک گاہک کو اپنا مالی دشمن تصور کرتے اور دکان سے اس کے خالی ہاتھ جانے کو اپنے حق میں باعث خیر و برکت گردانتے۔ ہفتے کو میرا دفتر ایک بجے بند ہو جاتا ہے۔ واپسی میں یوں ہی خیال آیا کہ چلو آج صبغے کی دکان میں جھانکتا چلوں۔ دیکھا کہ وہ اونچے اسٹول پر پیر لٹکائے اپنے قرضداروں کی فہرستوں سے ٹیک لگائے سو رہے ہیں۔ میں نے کھنکار کر کہا:

"قیلولہ............؟"

"اسٹاک میں نہیں ہے!" آنکھیں بند کیے کیے بولے۔

یہ کہہ کر ذرا گردن اٹھائی۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اپنی داہنی ہتھیلی دیکھی اور پھر سو گئے۔

داہنی ہتھیلی دیکھنا ان کی بڑی پرانی عادت ہے، جسے زمانۂ طالب علمی کی یادگار کہنا چاہیے۔ ہوتا یہ تھا کہ دن بھر خوار و خستہ ہونے کے بعد وہ رات کو ہوسٹل میں ہی نہ کسی کے سر ہو جاتے کہ صبح تمہارا منہ دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے کمرے کے ساتھی اپنی بدنامی کے خوف سے صبح دس بجے تک لحاف اوڑھے پڑے رہتے اور کچھوے کی طرح گردن نکال نکال کر دیکھتے رہتے کہ صبغے دفعان ہوئے یا نہیں۔ جب اپنے بیگانے سب آئے دن کی نحوستوں کی ذمہ داری لینے سے یوں منہ چھپانے لگے تو صبغے نے ایک ہندو نجومی کے مشورے سے یہ عادت ڈالی کہ صبح آنکھ کھلتے ہی شگون کے لیے اپنی دائیں ہتھیلی دیکھتے اور دن بھر اپنے آپ پر لعنت بھیجتے رہتے۔ پھر تو یہ عادت سی ہوگئی کہ نازک و فیصلہ کن لمحات میں مثلاً اخبار میں اپنا رول نمبر تلاش کرتے وقت، تاش پھینٹنے کے بعد اور کرکٹ کی گیند پر ہٹ لگانے سے پہلے، ایک دفعہ اپنی داہنی ہتھیلی ضرور دیکھ لیتے تھے۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے، ان دنوں ان کو اپنی ہتھیلی میں ایک حسینہ صاف نظر آ رہی تھی جس کا جہیز بمشکل ان کی ہتھیلی میں سما سکتا تھا۔

الماریوں کے ان گنت خانے جو کبھی ٹھساٹھس بھرے رہتے تھے، اب خالی ہو چکے تھے...... جیسے کسی نے بھٹے کے دانے نکال لیے ہوں۔ مگر صبغے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ اکثر دیکھا کہ ظہر سے عصر تک شیشے کے شوکیس کی فرضی اوٹ میں اپنے خلیرے چچیرے بھائیوں کے ساتھ سر جوڑے فلش کھیلتے رہتے۔ ان کا خیال تھا کہ جوا اگر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ کھیلا جائے تو کم گناہ ہوتا ہے۔ رہی دکان داری تو وہ ان حالوں کو پہنچ گئی تھی کہ تاش کے پتوں کے سوا اب دکان میں کاغذ کی کوئی چیز نہیں بچی تھی۔ گاہکوں کی تعداد اگرچہ تگنی چوگنی ہوگئی، مگر مول تول کی نوعیت قدرے مختلف ہوتے ہوتے جب یہ نوبت آگئی کہ راہ چلنے والے بھی بھاؤ تاؤ کرنے لگے تو خزانچی جی نے خاکی گتے پر ایک نوٹس نہایت پاکیزہ خط میں آویزاں کر دیا:

"یہ فرنیچر کی دکان نہیں ہے"

یاد رہے کہ ان کی نصف زندگی ان لوگوں نے تلخ کر دی جو قرض پر کتابیں لے جاتے تھے اور بقیہ نصف زندگی ان حضرات نے تلخ کر رکھی تھی جن سے وہ خود قرض لیے بیٹھے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی تباہی میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا۔ قدرت نے ان کے ہاتھ میں کچھ ایسا جس دیا تھا کہ سونے کے ہاتھ لگائیں تو مٹی ہو جائے لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو ان کی بربادی کا سہرا قدرت کے علاوہ ان مہربانوں کے سر تھا جو انتہائی خلوص اور مستقل مزاجی کے ساتھ دامے، درمے، قدمے، سخنے

ان کو نقصان پہنچاتے رہے۔ دوسری وجہ جیسا کہ اوپر اشارہ کر چکا ہوں یہ تھی کہ وہ اپنے خاص دوستوں سے اپنی حاجت اور ان کی حیثیت کے مطابق قرضہ لیتے ہے اور قرضے کو منافع سمجھ کر کھا گئے۔ بقول مرزا ان کا دل بڑا تھا اور قرض لینے میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ قرض پر لین دین ان کے مزاج میں اس حد تک رچ بس چکا تھا کہ مرزا کا خیال تھا کہ صبغے دراصل سہروردی حکومت کو کھکھ کرنے کی غرض سے اپنی آمدنی نہیں بڑھاتے۔ اس لیے کہ آمدنی بڑھے گی تو لا محالہ انکم ٹیکس بھی بڑھے گا۔ اب تو ان کی یہ تمنا ہے کہ بقیہ عمر عزیز ''بنک اور ڈرافٹ'' پر گوشۂ بدنامی میں گذار دیں لیکن ان کی نیت بری نہیں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ حالات نے ان کی نیک نیتی کو ابھرنے نہ دیا۔ گزشتہ رمضان میں ملاقات ہوئی تو بہت اداس اور فکر مند پایا۔ بار بار پتلون کی جیب سے ید بیضا نکال کر دیکھ رہے تھے۔ پوچھا 'صبغے! کیا بات ہے؟ بولے کچھ نہیں۔ پروفیسر عبدالقدوس سے قرض لیے تیرہ سال ہونے کو آئے۔ آج یونہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اب واپسی کی سبیل کرنی چاہیے ورنہ وہ بھی دل میں سوچیں گے کہ شاید میں نادہند ہوں۔

جوانی میں خدا کے قائل نہیں تھے، مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی' ایمان پختہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اب وہ اپنی تمام نالائقیوں کو سچے دل سے من جانب اللہ سمجھنے لگے تھے۔ طبیعت ہی ایسی پائی تھی کہ جب تک چھوٹی سے چھوٹی بات پر بڑی سے بڑی قربانی نہ دے دیتے' انہیں چین نہیں پڑتا تھا۔ بقول مرزا 'وہ انا الحق کہے بغیر سولی پر چڑھنا چاہتے تھے۔ تجارت کو انہوں نے وسیلہ معاش نہیں حلیہ جہاد سمجھا اور بہت جلد شہادت کا درجہ پایا۔

دکان کی دیوار کا پلاسٹر ایک جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ اس مقام پر (جو تقریباً دو مربع گز تھا) انہوں نے ایک سرخ تختی جس پر ان کا فلسفہ حیات بخط نستعلیق کندہ تھا' ٹانگ دی

ع باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم

اس میں قطعی کوئی تعلّی نہیں تھی' بلکہ دیکھا جائے تو انہوں نے کسر نفسی ہی سے کام لیا کیونکہ باطل تو باطل' وہ حق سے بھی دبنے والے نہیں تھے! مرزا اکثر نصیحت کرتے کہ میاں! کامیابی چاہتے ہو تو کامیاب کتب فروشوں کی طرح بقدر ضرورت سچ بولو اور ہر کتاب کے حسن و قبح پر ضدم ضدا کرنے کے بجائے گاہکوں کو انہی کی پسند کی کتابوں سے برباد ہونے دو جو بچارا تربوز سے بہل جائے اسے زبردستی انگور کیوں کھلاتے ہو؟ لیکن صبغے کا کہنا تھا کہ بیسویں صدی میں جیت انہی کی ہے' جن کے ایک ہاتھ میں دین ہے اور دوسرے میں دنیا۔ اور دائیں ہاتھ کو خبر نہیں کہ بائیں میں کیا ہے! تجارت اور نجات میں سنجوگ ممکن نہیں۔ تجارت میں فوری ناکامی ان کے نزدیک مقیاس الشرافت تھی۔ انہی کا مقولہ ہے کہ اگر کوئی شخص تجارت میں بہت جلد ناکام نہ ہو سکے تو سمجھ لو کہ اس کے حسب نسب میں فی

ہے۔ اس اعتبار سے انہوں نے قدم قدم پر بلکہ ہر سودے میں اپنی نسبی شرافت کا وافر ثبوت دیا۔
حساس آدمی تھے۔ اس پر بدقسمتی یہ کہ ایک ناکام کتب فروش کی حیثیت سے انہیں انسانوں کی فطرت کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اسی لیے بہت جلد انسانیت سے مایوس ہو گئے۔ انہوں ے تمام عمر تکلیفیں ہی تکلیفیں اٹھائیں۔ شاید اسی وجہ سے انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ حق پر ہیں۔ زندگی سے کب کے بیزار ہو چکے تھے اور ان کی باتوں سے ایسا لگتا تھا گویا اب محض اپنے قرض خواہوں کی تالیفِ قلوب کے لیے جی رہے ہیں۔ اب ہم ذیل میں وہ تاثرات و تعصبات مختصراً بیان کرتے ہیں جو ان کی چالیس سالہ ناتجربہ کاری کا نچوڑ ہیں۔
دکان کھولنے سے چار پانچ مہینے پہلے ایک ادبی خیر سگالی وفد (ادارہ برائے ترقی انجمن پسند مصنفین) کے ساتھ سیلون ہو آئے تھے' جسے حاسد لنکا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس جزیرے کی سہ روزہ سیاحت کے بعد اٹھتے بیٹھتے ''ترقی یافتہ ممالک'' کی ادب نوازی و علم دوستی کے چرچے رہنے لگے۔ ایک دفعہ برادرانِ وطن کی ناقدری کا گلہ کرتے ہوئے فرمایا ''آپ کے ہاں تو ابھی تک جہالت کی خرابیاں دور کرنے پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں مگر ترقی یافتہ ممالک میں تو اب مارا ماری ایسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں' جن کا مقصد ان خرابیوں کو دور کرنا ہے جو محض جہالت دور ہونے سے پیدا ہو گئی ہیں۔ صاحب! وہاں علم کی ایسی قدر ہے کہ کتاب لکھنا' کتاب چھاپنا' کتاب بیچنا' کتاب خریدنا' حد یہ کہ کتاب چرانا بھی ثواب میں داخل ہے۔ یقین مانیے ترقی یافتہ ممالک میں تو جاہل آدمی ٹھیک سے جرم بھی نہیں کر سکتا۔'' شامتِ اعمال' میرے منہ سے نکل گیا۔ ''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں کوئی کتاب اس وقت تک اچھی خیال نہیں کی جاتی' جب تک کہ اس کی فلم نہ بن جائے اور فلم بننے کے بعد کتاب پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' انہیں غصہ آ گیا ''تین پیسے کی چھوکری'' کا کونا موڑ کر واپس الماری میں رکھی اور میرے لب و لہجے کی ہو بہو نقل اتارتے ہوئے بولے ''اور آپ کے ہاں یہ کیفیت ہے کہ نوجوان اس وقت تک اردو کی کوئی کتاب پڑھنے کی حاجت محسوس نہیں کرتے' جب تک پولیس اسے فحش قرار نہ دے دے اور فحش قرار پانے کے بعد اس کے بیچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ان کے طنز میں طعنے کا رنگ آ چلا تھا' اس لیے میں نے جھٹ سے حامی بھر لی کہ پولیس اگر دل سے چاہے تو تمام اچھی اچھی کتابوں کو فحش قرار دے کر نوجوانوں میں اردو ادب سے گہری دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔
میرے لہجے کا نوٹس نہ لیتے ہوئے الٹے مجھی سے الجھنے لگے کہ آپ بات کی تہ تک نہیں پہنچے۔ آپ دھڑا دھڑ کتابیں چھاپ سکتے ہیں' مگر زبردستی پڑھوا نہیں سکتے میں نے کہا' کیوں نہیں؟ اٹھا کے نصاب میں داخل کر دیجیے۔ وہ بھلا ہار ماننے والے تھے۔ کہنے لگے اگر ایک پوری کی پوری نسل کو ہمیشہ کے لیے

کسی اچھی کتاب سے بیزار کرنا ہو تو سیدھی ترکیب یہ ہے کہ اسے نصاب میں داخل کر دیجیے۔

کتب فروشی کی بدولت صفیے کا سابقہ ایسے ایسے پڑھنے اور نہ پڑھنے والوں سے پڑا۔

ع ہزاروں سال نرگس جن کی بے نوری پہ روتی ہے

ان میں خیام کے وہ دل دادہ بھی شامل تھے جو اصل رباعیوں میں ترجمے کی خوبیاں تلاش کرتے پھرتے تھے۔ ان میں وہ سال خوردہ کتاب خواں بھی تھے جو کجلائے ہوئے کوئلوں کو دہکانے کے لیے بقول مرزا عریاں ناولوں سے منہ کالا کرنے اور سمجھتے کہ ہم اردو کی عزت بڑھا رہے ہیں۔ (یہ قول انہی کا ہے کہ فحش کتاب میں دیمک نہیں لگ سکتی کیونکہ دیمک ایسا کاغذ کھا کر افزائش نسل کے قابل نہیں رہتی۔) ان میں وہ خوش نصیب بھی تھے، جن کے لیے کتاب بہترین رفیق ہے اور وہ کم نصیب بھی جن کے لیے واحد رفیق!

اور اس بے نام قبیلے میں وہ جدت پسند پڑھنے والے بھی شامل تھے جو ہر لحظہ تازہ بہ تازہ، نو بہ نو کے طلب گار تھے۔ حالانکہ ان جیسوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ فقط ڈکشنری ہی ایک ایسی کتاب ہے جسے وہ جب بھی دیکھیں، انشاء اللہ نئی معلوم ہوگی۔ لیکن ایک حد تک صفیے کی بھی زیادتی تھی کہ نئی اردو کتابوں کو اپنے دل اور دکان میں جگہ دینا تو بڑی بات ہے، چمٹے سے پکڑ کر بھی بیچنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک دن خاقانی ہند استاد ذوقؔ کے قصائد کی گرد ہفتہ وار ٹائم سے جھاڑتے ہوئے کٹکٹا کر کہنے لگے کہ آج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ادب ایک ''کیپ سول'' میں بند کر کے ان کے حوالے کر دیا جائے، جسے وہ کوکا کولا کے گھونٹ کے ساتھ غٹک سے حلق سے اتار لیں۔ انسانی تہذیب پتھر اور بھوج پتر کے عہد سے گزر کر اب ریڈرز ڈائی جسٹ کے دور تک آ گئی ہے۔ سمجھے؟ یہ مصنفوں کا دور نہیں، صحافیوں کا دور ہے! صحافیوں کا!

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''مگر صحافت میں کیا قباحت ہے؟''

بولے ''کچھ نہیں۔ بڑا مصنف اپنی آواز پبلک تک پہنچاتا ہے، مگر بڑا صحافی پبلک کی آواز پبلک تک پہنچاتا ہے!''

مصنفوں کا ذکر چھیڑ گیا تو ایک واردات اور سنتے چلیے۔ سات آٹھ مہینے تک وہ اردو افسانوں کا ایک مجموعہ بیچتے رہے، جس کے سرورق پر مصنف کے دستخط بقلم خود ثبت تھے اور اوپر یہ عبارت: ''جس کتاب پر مصنف کے دستخط نہ ہوں وہ جعلی تصور کی جائے۔'' ایک روز انہیں رجسٹری سے مصنف کے وکیل کی معرفت نوٹس ملا کہ ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ ہمارے مؤکل کی کتاب کا ایک مصدقہ ایڈیشن عرصہ آٹھ ماہ سے مبینہ طور پر فروخت کر رہے ہیں، جس پر مصنف مذکور کے دستخط بقید تاریخ ثبت ہیں۔ آپ کو بذریعہ نوٹس ہذا مطلع و متنبہ کیا جاتا ہے کہ محولہ بالا کتاب اور

دستخط دونوں سراسر جعلی ہیں۔ اصل ایڈیشن میں مصنف کے دستخط سرے سے ہیں ہی نہیں۔ اس واقعے سے انہوں نے ایسی عبرت پکڑی کہ آئندہ کوئی ایسی کتاب دکان میں نہیں رکھی، جس پر کسی کے بھی دستخط ہوں بلکہ جہاں تک بن پڑتا' انہی کتابوں کو ترجیح دیتے' جن پر مصنف کا نام تک درج نہیں ہوتا۔ مثلاً الف لیلیٰ' ضابطہ فوجداری' ریلوے ٹائم ٹیبل' انجیل۔

تباہی کی جو طبعزاد راہ بلکہ شاہراہ انہوں نے اپنے لیے نکالی' اس پر وہ تو کیا' قارون بھی زیادہ دیر گامزن نہیں رہ سکتا تھا' کیونکہ منزل بہت دور نہیں تھی۔ آخر وہ دن آ ہی گیا' جس کا دشمنوں کو انتظار تھا اور دوستوں کو اندیشہ۔ دکان بند ہوگئی۔ خزانچی جی کی تنخواہ ڈھائی مہینے سے چڑھی ہوئی تھی۔ لہٰذا خالی الماریاں' ایک عدد گولک چوبی جو نادہندوں کی فہرستوں سے منہ تک بھری تھی۔ چاندی کا خوبصورت سگرٹ کیس' جسے کھولتے ہی محسوس ہوتا تھا گویا بیڑی کا بنڈل کھل گیا۔ نسینی جس کی صرف اوپر کی تین سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں' خواب آور گولیوں کی شیشی' کراچی ریس میں دوڑنے والے گھوڑوں کے شجرہ ہائے نسب' نومبر سے دسمبر تک کا مکمل کیلنڈر کیل سمیت۔ یہ سب خزانچی جی نے صبغے کی اولین غفلت میں ہتھیا لیے اور راتوں رات اپنی تنخواہ کی ایک ایک پائی گدھا گاڑی میں ڈھو ڈھو کر لے گئے۔ دوسرے دن دکان کا مالک بقایا کرائے کی مد میں جو جائیداد منقولہ وغیر منقولہ اٹھا کر یا اکھاڑ کر لے گیا' اس کی تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ ہمارے پڑھنے والوں کو بس اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ ان میں سب سے قیمتی چیز بغیر چابی کے بند ہونے والا ایک قفل فولادی ساختہ جرمنی تھا۔ پرانا ضرور تھا' مگر ایک خوبی اس میں ایسی پیدا ہوگئی تھی جو ہم نے نئے سے نئے جرمن تالوں میں بھی نہیں دیکھی۔ یعنی بغیر چابی کے بند ہونا اور اسی طرح کھلنا!

صبغے غریب کے حصے میں صرف اپنے نام (مع فرضی فرزندان) کا سائن بورڈ آیا' جس کو سات روپے مزدوری دے کر گھر اٹھوا لائے اور دوسرے دن سوا روپے میں محلے کے کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور دو مہینے تک اپنی ہتھیلی کا شبانہ روز مطالعہ کرنے کے بعد ایک ٹریننگ کالج میں اسکول ماسٹروں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ مرزا کے الفاظ میں صبغے کی کتب فروشانہ زندگی کے باب کا انجام نہایت افسانوی رہا۔ جس افسانے کی طرف یہاں مرزا کا اشارہ ہے' وہ دراصل کائی لنگ کی ایک مشہور چینی کہانی ہے' جس کا ہیرو ایک آرٹسٹ ہے۔ ایک دن وہ اپنی ایک ماڈل لڑکی کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت اپنے سارے برش اور کینوس سمیٹ سماٹ کر جلا ڈالے اور ایک سرکس میں ہاتھیوں کو سدھانے کا کام کرنے لگا۔

جنوری ۱۹۶۲ء

☆☆☆

سیزر، ماتا ہری اور مرزا

''ہائے اللہ! یہ ہاتھی کا ہاتھی کتا کاہے کو لے آئے؟''

''چوکیداری کے لیے۔''

''کس کی؟''

''گھر کی''

''اس گھر کی؟''

''ہاں! بہت ہی ہوشیار کتا ہے۔ گھر میں کچھ نہ ہو' تب بھی چوکیداری کر سکتا ہے۔''

اس ازدواجی مکالمے سے بعد میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تنخواہ ملتے ہی ہم نے گھر گرہستی کا ضروری سامان خرید ڈالا تاکہ کتا اس کی چوکیداری کر سکے' لیکن والدین کو سمجھ میں آنے والا جو فوری فائدہ ہم نے سردست بیان کیا' اس سے اپنے معصوم بچوں کو جان بوجھ کر محروم رکھنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ وہ فائدہ یہ تھا کہ آخر کو یہ ایک انگریز کا کتا تھا' اور یہ کون نہیں جانتا کہ ہمارے ہاں ان پڑھ سے ان پڑھ آدمی بھی اپنے کتے کا نام انگریزی رکھتا ہے اور انگریزی ہی میں اس سے بات چیت اور ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اشارۃً توجہ دلائی کہ اس کی وجہ سے بچوں کو انگریزی بولنا آجائے گی۔

یہ سنتے ہی بیگم نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور زنجیر ایسے فیصلہ کن جھٹکے کے ساتھ ہمارے ہاتھ سے چھین لی جیسے لیڈی میکبتھ نے میکبتھ کے ہاتھ سے خنجر چھینا تھا:

INFIRM OF PURPOSE!

GIVE ME THE DAGGER....

یادش بخیر! اس ڈراپ سین سے کوئی بیس سال ادھر جب آتش جوان بلکہ نوجوان تھا' اس نے نیلی آنکھوں' بھری بھری ٹانگوں اور ''بلونڈ'' بالوں والی میم کو بغل میں اپنے جیبی سائز کے ''پومرینین'' کتے کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتے دیکھا تھا۔ تھا بھی ظالم اسی قابل۔ گول مٹول۔ جھبرا۔ سفید گالا سے بالوں سے سارا جسم اس بری طرح ڈھکا تھا کہ جب تک چلنا شروع نہ کرے' یہ بتانا مشکل تھا کہ منہ کس طرف ہے۔ ہائے! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہر چیز جوان تھی۔ ہر چیز حسین تھی۔ ہر چیز پہ ٹوٹ کے پیار آتا تھا۔ کیسے مہکتے دہکتے دن تھے وہ بھی۔

مری سانس میں ہے گری کہ یہ لوسی چل رہی ہے

اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن ان گنہ گار آنکھوں کو زنجیر کے دونوں سروں پر حسن نظر آیا اور دل میں یہ پیار بھری حسرت کروٹیں لینے لگی کہ انگریز کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد کبھی فراغت اور گوشہ چمن نصیب ہوا تو ایک نیلی آنکھوں، بھری بھری ٹانگوں اور ''بلونڈ'' بالوں والا کتا ضرور پالیں گے۔ مگر ایک تو بقول مرزا اعلیٰ نسل کے کتے باوا کے مول ملتے ہیں۔ دوسرے اس زمانے میں مکان اتنا تنگ تھا کہ جانور کا تندرست رہنا محال۔ وہ تو خدا بھلا کرے مسٹر ایس۔ کے ڈین (شیخ خیر الدین ایم۔ اے (آکسن) کا جو ہماری آتش شوق کو ہوا دیتے رہے۔ یہ ہمارے دور پرے کے عزیز ہمسائے تھے۔ ان کے پاس ایک بڑا جید کتا تھا۔ خالص ''گرے ہاؤنڈ'' جسے وہ پڑوسیوں کا خون پلا پلا کر پال رہے تھے۔ دہن رسا رکھتا تھا۔ جسم تیغے جیسا اور مزاج بھی ایضاً۔ یوں تو بھونکنے کے تمام متداول اصناف میں استادانہ مہارت رکھتا تھا، لیکن چاندنی چھٹکی ہو اور طبیعت حاضر، تو پھر کچھ ایسی ''اوریجنل'' طرز اختیار کرتا کہ جتنی مرتبہ بھونکتا، طبیعت کو ہر ایک نئی کوفت حاصل ہوتی۔ دیکھا گیا ہے کہ ایسے ویسے شوقیہ بھونکنے والے کتوں کا سانس تو دو چار دفعہ ہی ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے میں اکھڑ جاتا ہے۔ مگر یہ کتا بقول مرزا، اردو میں بھونکتا تھا، یعنی بھونکتا ہی چلا جاتا تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ مسٹر ایس۔ کے ڈین اپنے نج کے بزرگوں کو اپنے لائق نہیں سمجھتے۔ مگر اپنے اصیل کتے کا شجرۂ نسب پندرھویں پشت تک فر فر سناتے اور اس کے آبا و اجداد پر اس طرح فخر کرتے، گویا ان کا خالص خون ان کی ناچیز رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ کہتے تھے نہر سویز کے اس طرف اتنا خالص و خونخوار کتا ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ اس کا دادا پندرہ جون ۱۹۴۱ء کو پانڈیچری میں دیسی کتوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ چاندنی رات۔ ہو ہو کا عالم۔ چوراہے پر گھمسان کا رن پڑا۔ کتوں کے پشتے لگ گئے تھے۔ محلے میں مشہور تھا کہ مسٹر ڈین کے ہاں کوئی گھبرایا گھبرایا فائر بریگیڈ کو فون کرنے بھی چلا جائے تو اسے اپنے مرحوم کتوں کے البم دکھائے بغیر فون کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ ڈرائنگ روم میں مسٹر ڈین کی ایک بڑی سی تصویر بھی ٹنگی تھی؛ جو انہوں نے اپنے کتے کے جیتے ہوئے کپ اور ٹرافیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر اور اس کے تمغے کوٹ پر لگا کر کھنچوائی تھی۔ ہماری دیرینہ حسرت و شفیتگی کے پیش نظر ایک دن تخلیے میں ہمیں اپنے ٹیپ ریکارڈر پر موجودہ کتے کے والد مرحوم کا بھونکنا سنایا۔ سن کر خود آبدیدہ ہوئے اور ہمیں بھی ان کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا۔

کتا پالنے کی حسرت کا اظہار ہم نے بارہا مرزا کے سامنے کیا، مگر وہ کتے کا نام آتے ہی کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ کہتے ہیں ''ہٹاؤ بھی! واہیات جانور ہے۔ بالکل بے مصرف کتے کی تخلیق کا واحد مقصد یہ تھا کہ پطرس اس پر ایک لاجواب مضمون لکھے۔ سو یہ مقصد عرصہ ہوا، پورا ہو چکا اور اب اس نسل کو زندہ

رہنے کا کوئی حق نہیں۔" وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ نسل ناپید ہو بھی گئی تو اردو طنز نگاروں سے نام چلتا رہے گا۔ یوں تو سبھی جانوروں کے بارے میں مرزا کی معلومات ظالمانہ حد تک ادھوری ہیں (مثلاً ابھی کل شام تک وہ لومڑی کو گیدڑ کی مادہ سمجھے بیٹھے تھے اور ...... غضب خدا کا...... بڑے چیونٹے کو عام چیونٹی کا نر!) مگر کتوں کے ساتھ وہ خصوصیت سے تعصب برتتے ہیں اور اپنی بات کی پچ میں ایک سے ایک دلیل پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دن کہنے لگے:

"جس گھر میں کتا ہو اس گھر میں چور ہی نہیں، رحمت کے فرشتے بھی داخل نہیں ہو سکتے۔"

"چور کا داخل نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر رحمت کے فرشتوں کو کیا ڈر ہے؟"

"اس لیے کہ کتا ناپاک ہوتا ہے۔"

"مگر کتے کو صاف ستھرا بھی تو رکھا جا سکتا ہے۔ انگریزوں کو دیکھیے، صبح و شام نہلاتے ہیں۔"

"اُپلے کو اگر صبح و شام صابن سے دھویا جائے تو کیا پاک ہو جائے گا؟"

"مگر سوال یہ ہے کہ کتا ناپاک کیسے ہوا؟"

"کج بحثی کوئی تم سے سیکھے۔ اللہ بخشے نانی جان کہا کرتی تھیں کہ کتے کے منہ میں سور کی رال ہوتی ہے۔"

"لیجیے۔ آپ نے ناپاکی کی ایک اچھوتی توجیہہ تلاش کر لی۔"

"بھائی میرے! ایک موٹی سی پہچان آج تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ یاد رکھو ہر وہ جانور جسے مسلمان کھا سکتے ہیں، پاک ہے"۔

"اس لحاظ سے مسلمان ممالک میں بکروں کو اپنی پاکی و طہارت کے سبب خاصا نقصان پہنچا ہے۔"

"بکنے والے بکا کریں۔ مسلمانوں نے کتے کو ہمیشہ کتا ہی کہا۔ بڑے آدمیوں کے نام سے نہیں پکارا۔"

"بڑے آدمیوں کی ایک ہی رہی۔ آپ نے سنا نہیں کہ نسلاً سب کتے ایک زمانے میں بھیڑیے تھے؟ آدمی کی صحبت میں ان کا بھیڑیا پن جاتا رہا۔ مگر خود آدمی ......"

"دیکھو، تم پھر لٹریچر بولنے لگے۔ علموں بس کریں او یار!"

اس بارۂ خاص میں مرزا کے نسلی تعصب کی جڑیں ان کے سگ گزیدہ بچپن تک پہنچتی ہیں۔ اس لیے ہم نے خواہ مخواہ ان سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ کتا رکھنے کی آرزو کو پالتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دن آ گیا، جب ہمارا انگریز افسر بھاری دل اور اس سے زیادہ بھاری قدموں کے ساتھ اپنے وطن کی جانب روانہ ہوا۔ اور روانگی سے قبل اس تعلق خاطر کی بناء پر جو ہم کو اس سے اور اس کو اپنے کتے سے تھا، دریافت کیا:

’’تم چاہو‘ تو میرا کتا بطور یادگار رکھ سکتے ہو۔ ☆امپورٹڈ السیشن ہے۔ تیرہ ماہ کا۔ سیزر کہہ کر پکارو تو دم ہلاتا آتا ہے۔‘‘ آپ اندازہ نہیں کرسکتے‘ اس صلائے خاص میں ایک کمزور دل کے آدمی کے لیے للچاہٹ کے کیا کیا سامان پوشیدہ تھے۔ اس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ اس سے بہتر کوئی یادگار نہیں ہوسکتی کہ جب بھی وہ بھونکے گا‘ افسر کی یاد تازہ ہوجائے گی۔ پھر یہ کہ السیشن! کبھی ہم اس کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں! افسر کی ادنیٰ مہربانی سے ہمیں اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بقول مرزا‘ اگر اس وقت ہمارے دم ہوتی تو ایسی ہلتی کہ پھر نہ تھمتی۔

رہی سہی ہچکچاہٹ کو لفظ ’’امپورٹڈ‘‘ نے دور کردیا۔ اس زمانے میں ہر وہ شے جو وطن عزیز میں پیدا نہ ہوئی ہو‘ قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی چنانچہ ہر بگڑا ہوا مسلمان رئیس یہ ثابت کرنے پر تلا بیٹھا تھا کہ نہ صرف اس کے کتے کے بلکہ اس کے اپنے بزرگ بھی اصلی امپورٹڈ تھے اور خالی ایک تلوار لے کر ماوراء النہر سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ امپورٹڈ کتا سماج میں کیا حیثیت رکھتا ہے‘ اس کا سرسری سا اندازہ ان واقعات سے لگایا جاسکتا ہے جو دو سال پیشتر ہماری نظر سے گزر چکے تھے۔ ہم سے چار گھر دور مسٹر خلجی بیرسٹر رہتے تھے۔ ان کے والد مرحوم نے چند نایاب کتے ترکے میں چھوڑے تھے (چھوڑنے کو تو چند نایاب کتابیں بھی چھوڑی تھیں‘ مگر چونکہ وہ بھی کتوں ہی سے متعلق تھیں‘ اس لیے ہم نے قصداً ذکر نہیں کیا) انہی میں کی ایک دوغلی سی کتیا تھی۔ (جس کے متعلق ان کا فخر یہ دعویٰ تھا کہ اس کی نانی جوزیفین کے تعلقات راسپوٹن سے رہ چکے تھے‘ جو ایک امپورٹڈ ’’گریٹ ڈین‘‘ کتا تھا۔ نیز یہ کہ وہ شملہ سول اینڈ ملٹری کینل ☆ سے اس واردات کلبی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرچکے ہیں جو ان کے سونے کے کمرے میں آج بھی آنکھوں کو نور دل کو سرور بخشتا ہے۔) نام ماتاہری رکھ چھوڑا تھا کسی زمانے میں اس کے جھلجھلے کان ہر وقت لٹکے رہتے تھے۔ مگر انہوں نے شہر کے بہترین سرجن سے آپریشن کرا کے السیشن کی طرح کھڑے کرائے تھے۔ رنگ ہلکا براؤن جیسے میٹھی آنچ پر سنکا ہوا توس۔ بیرسٹر صاحب کی اینگلو انڈین بیوی (جو خود بھی بڑی بھری پری عورت تھی اور سلطنت کی طرح دست بدست آئی تھی) اس پر اپنے ہاتھ سے یوڈی کلون چھڑک کر مگر مچھ کی کھال کا جڑاؤ کالر پہنائے گھمانے لے جاتی اور اپنے جوتے سے میچ کرنے کے لیے اس پر ٹوتھ برش سے خضاب لگادیتی۔ کبھی سیاہ‘ کبھی بولتا ہوا عنابی۔ یہ تو گرمیوں کی شاموں کے معمولات میں سے تھا۔ جاڑے میں ماتاہری فرنچ برانڈی کے دو چمچے غٹاغٹ پی کر ایرانی قالین پر اپنی مالکہ کی طرح اطالوی ریشم کی انگیا کی تہمت لگائے سوتے جاگتے پہرا دیتی تھی۔ صورتاً بھیڑیا اور سیرۃً بھیڑ۔ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ

☆امپورٹڈ..........آمدشدہ

☆KENNEL دارالکلاب۔

صبح و شام ولایتی بسکٹ اور ڈبے کا گوشت کھاتے رہنے کے باوجود (یا شاید اسی وجہ سے) بقرعید کی رات کو محلے کے قصائی کے ساتھ بھاگ گئی اور تین شب بعد مٹکتی منکاتی لوٹی بھی تو اس طنطنے سے کہ ایک درجن رفقائے حیات جلو میں۔ چال جیسے قرۃ العین حیدر کی کہانی ...... پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی۔ خوش صحبتی کے گلی گلی چرچے، مگر ذہانت چھو کر نہیں گئی تھی۔ بقول مرزا بالکل گدھی تھی۔ انہی سے مروی ہے کہ اکثر بازاری کتیوں کے پلے آ کر حسپر حسپر اس کے دودھ کا آخری قطرہ تک پی جاتے اور اپنے بچے دم ہلاتے یا پلاسٹ کی ہڈیا چچوڑتے رہ جاتے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے چوکیداری کے لیے چنداں بری نہ تھی کہ اپنی عزت آبرو کے علاوہ ہر چیز کی بخوبی حفاظت کر سکتی تھی۔ اس کے یہ لچھن دیکھے تو بیرسٹر صاحب نے اس کی رکھوالی کے لیے ایک چوکیدار رکھا۔ اسی سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اپنے کنبے اور کتیا سمیت کار سے مری جانے لگے تو ان کے نانا جان قبلہ نے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بس اڑ گئے کہ میں اس ''نجس کتی'' کے ساتھ کار میں سفر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بیرسٹر صاحب ان کو ہمارے ہاں چھوڑ گئے۔ جتنے دن بزرگوار موصوف ہمارے ہاں مہمان رہے بعد نماز عشاء ہاتھ پھیلا پھیلا کر منتقم حقیقی سے دعا مانگتے کہ پروردگار! مال زادی ماتا ہری سالانہ زچگی میں اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ کتیا کہیں کی! ہر رنگ، ہر سائز کی گالی ان کی روزمرہ گفتگو میں نگینے کی طرح جڑی ہوتی۔ دن بھر نماز کی چوکی پر بیٹھے سب کو حسب مراتب خورد و کلاں گالیاں دیتے رہے۔ دعا میں بھی بے ساختہ یہی رنگ رہتا۔ مرزا کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنے دل پر جبر کر کے دعا میں سے گالیاں حذف کر دیتے تو ساری تاثیر جاتی رہتی۔ جو دعا دل سے نہ نکلے کیونکر مستجاب ہو سکتی ہے؟ اوقات دعا کے علاوہ ہر آئے گئے کے سامنے اپنے نافرمان نواسے کے امتیازی سلوک کی شکایتوں کے دفتر کھول دیتے۔ ان کے تمام شکوے شکایتوں کا لب لباب بس یہ تھا کہ میرے ساتھ کتے جیسا سلوک کیوں نہیں کیا جاتا! آخر میں بھی جان دار ہوں۔

امپورٹڈ کتے کی چھیل چھبیلی نواسی کی یہ لذیذ حکایت بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ لفظ ''امپورٹڈ'' نے انگریز افسر کے منہ سے نکلتے ہی ہماری مدافعت کی دیوار کو جو کبھی بھی بہت بلند اور پختہ نہ تھی، یک لخت ڈھا دیا۔ بھلا ایسے صحبت یافتہ کتے روز روز کہاں ملتے ہیں۔ بالآخر شوق فضول ہمارے فطری خوف پر غالب آیا اور جہاز کا لنگر اُٹھنے سے پہلے ہم نے اپنے آپ کو ایک خوش نصیب کتے کا مالک پایا۔

لیکن ایک بات کے لیے ہم بھی ذہنی بلکہ جسمانی طور پر تیار نہ تھے۔ ''تیرہ ماہ'' کی عمر سن کر ہمارے تصور میں ایک بہت ہی بھولی بھالی صورت ابھری تھی۔ ہم نے سوچا جیسے تیرہ مہینے کا آدمی کا بچہ بڑا پیارا سا ہوتا ہے۔ تھن متھنا، گبدا سا، غاؤں غاؤں کرتا ہوا۔ ویسا ہی یہ بھی ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ بچہ کسی کا بھی ہو بڑا ''سویٹ'' لگتا ہے۔ پھر یہ تو السیشن کا بچہ ٹھیرا۔ جی ہاں بچہ! دراصل ہم اس کے

''امپورٹڈ'' ہونے سیاس قدر مرعوب تھے کہ پلا کہتے ہوئے خود شرم سی محسوس ہوتی تھی۔
مگر ٹیریرز ہر اعتبار سے ہماری توقعات سے بڑھ کر نکلا۔ اس کا سراپا کھینچ کر ہم ناظرین کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے ڈیل ڈول کا سرسری سا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے دیرینہ کرم فرما پروفیسر قاضی عبدالقدوس کی سالم ران اس کے منہ میں آجاتی تھی۔
اور یہ پروفیسر مذکور ہی نے بتایا کہ بندۂ خدا! تم نے بھی بڑا غضب کیا! تیرہ مہینے کا السیشن تو پورا پاٹھا کتا ہوتا ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ تین مہینے سے زیادہ کا السیشن نہیں لینا چاہیے۔ اس پر مرزا نے یہ نمک چھڑکا کہ آنکھوں دیکھی بات ہے' کتے کی تندرستی اور نسل اگر مالک سے بہتر ہو تو وہ آنکھیں ملا کر ڈانٹ بھی نہیں سکتا۔ پھر یہ تو غیر معمولی طور پر خونخوار بھی نظر آتا ہے۔ ہم نے کہا' مرزا! تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔ بولے جو شخص کتے سے بھی نہ ڈرے' مجھے اس کی ولدیت میں شبہ ہے۔ ہم نے کہا مرزا! کتا اگر خونخوار نہ ہو تو پالنے سے فائدہ؟ پھر آدمی بکری کیوں نہ پال لے۔ بولے' ہاں! بکری کتے سے بدرجہا بہتر ہے۔ بڑی بات یہ کہ جب چاہو کاٹ کر کھا جاؤ۔

گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو بھاتی ہے بات بکری کی

بحثا بحثی میں ہم دونوں پٹری سے اتر گئے تھے۔ لہٰذا پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے بحیثیت ثالث بالخیر بیچ میں پڑ کے اس معتدل رائے پر بحث ختم کی کہ کتے میں سے اگر جبڑا نکال دیا جائے تو خاصا معقول اور مخلص جانور ہے۔
قاضی عبدالقدوس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا کہ بڑا کتا بڑی مشکل سے سدھایا جاتا ہے۔ پھر نیا گھر' نئے چہرے' نئی بو باس۔ نتیجہ یہ کہ پہلی رات خود سویا نہ دوسروں کو سونے دیا۔ رات بھر ایک سانس میں منہ زبانی بھونکتا رہا۔ دوسری رات بھی دحشت کا یہی عالم رہا۔ البتہ چوبیس گھنٹے کی تربیت سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ فجر کے وقت جن اراکین خاندان کی آنکھ لگ گئی تھی' ان کے منہ چاٹ چاٹ کر خواب غفلت سے بیدار کیا۔ تیسرے رتجگے سے پہلے ہم نے اسے ایک سونے کی گولی دی۔ کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ چوتھی رات دو دیں' مگر صاحب! کیا مجال جو ذرا چپکا ہو جائے۔ زچ ہو کر مرزا سے رجوع کیا تو کہنے لگے' میری مانو' آج اسے کچھ نہ دو۔ خود تین گولیاں کھالو۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اس رات وہ بالکل نہیں بھونکا!
لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ صبح دس بجے ہمارے بہرے ہمسائے خواجہ شمس الدین (امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر) نے جو نئے نئے پڑوس میں آئے تھے ہمیں بڑی بدتمیزی سے جھنجھوڑ کر جگایا اور شکایت کی کہ رات بھی آپ کا کتا میرے گھر کی طرف منہ کر کے خوب بھونکا۔ اور (ہیئرنگ ایڈ یعنی سننے کا

آلہ اپنے کان میں فٹ کرتے ہوئے) اور دیکھ لیجیے اس وقت بھی بہت جی لگا کے بھونک رہا ہے! ہم نے کہا آپ کا ریڈیو بھی تو سارے سارے دن محلے کو سر پر اٹھائے رکھتا ہے۔ خدا گواہ ہے جس دن سے آپ پڑوس میں اٹھ کر آئے ہیں ہم نے اپنے ریڈیو پر پروگرام سننا بند کر دیا ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے پاس تو کتے کا لائسنس بھی ہے۔ لائسنس کا نام آتے ہی ان کے چہرے کا رنگ سیاہ سے بینگنی ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں وہ اور ان کا ریڈیو تین ہفتے تک خاموش رہے۔ البتہ ان کے چوکیدار کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کے اپنی ہیئرنگ ایڈ کان سے لگا کر سنتے ہیں کہ ہمارا کتا بھونک رہا ہے یا سو گیا۔ ہمارے کانوں میں یہ بھنک بھی پڑی کہ اب وہ ہر ایک سے کہتے پھر رہے ہیں کہ بعض نادہندا اپنے قرض خواہوں سے بچنے کے لیے کتے پال لیتے ہیں۔ وہ یہ کہتے بھی سنے گئے کہ سیزر اشرافوں کا کتا معلوم نہیں ہوتا۔ ادھر ان کی بیوی کی بدگمانی کا یہ حال تھا کہ سیزر جھوٹوں بھی دروازے میں سے جھانک لے تو جھٹ ہاتھ بھر کا گھونگھٹ نکال لیتی تھیں۔

تین ہفتے بعد دیکھا کہ پھر منہ پھلائے کلبۂ احزاں کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے پر جوش السلام علیکم کے جواب میں فرمایا' دیکھئے اس سور کے بچے نے کیا کیا ہے؟ مرزا بیچ میں بول اٹھے۔ منہ سنبھال کر بات کیجیے۔ وہ کتے کا بچہ ہے۔ اس جملہ معترضہ کے بعد ہم بھی کچھ سخت بات کہنے والے تھے کہ مرزا نے جو اس وقت ہم سے ''لوڈو'' کھیل رہے تھے' ہمارے کہنی مار کر اپنی چھجے دار بھوؤں کی جنبش سے خواہ شمس الدین کی بائیں ٹانگ کی طرف اشارہ کیا جو گھٹنے تک پائینچے سے بے نیاز تھا۔ ہم نے کن انکھیوں سے دیکھا تو زخم واقعی اتنا لمبا تھا کہ زپ لگا کر بآسانی بند کیا جا سکتا تھا۔

''ندامت اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو کر ہم نے پوچھا:

''کیا کتے نے کاٹا ہے؟''

''جی نہیں! میں نے خود ہی کاٹا ہے!''

''ارے صاحب! گھوڑے بھی کچھ کم ظالم نہیں ہوتے؟'' مرزا پھر بول اٹھے۔

مرزا کا یہ پرشماتت وار ایسا اچانک اور کاری تھا کہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ایک دفعہ کو اپنے جسمانی زخم بھول گئے اور اندرونی چوٹوں کو سہلاتے اور گھوڑوں کی ماں بہنوں کو ارمان بھری گالیاں دیتے ''فیڈ آؤٹ'' ہو گئے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ ان کے بزرگ خیبر پار سے گھوڑے بیچنے ہندوستان آئے تھے اور مالا مال ہو کر یہیں پڑ رہے۔ آگے چل کر ان بزرگوں کی اولاد کو انہی گھوڑوں کی ناخلف اولاد نے تباہ کر ڈالا۔ وہ اس طرح کہ اس خانوادے کے آخری چشم و چراغ خواجہ شمس الدین کی ''بلیک'' کی کمائی کی ایک ایک پائی ریس میں انہی گھوڑوں کے بھینٹ چڑھتی اور ان کے اپنے اہل و عیال انکم ٹیکس والوں کی طرح منہ دیکھتے رہ جاتے۔

اس نوع کی خوش طبعی سے قطع نظر سیزر ابتدائے سن بدتمیزی سے پرلے درجے کا کاہل واقع ہوا تھا اور دوڑ دوڑ کر کام کرنے کے بجائے دن کے بیشتر حصے میں دروازے پر محراب کی شکل میں چھائی ہوئی بوگن دلیا☆ کے سائے میں لوٹیں لگاتا رہتا۔ درزی کی سوئی یوں تو ہر طرح کے کپڑے میں سے نکلتی ہے، مگر ایمان کی بات ہے ہم نے سیزر کو کبھی کسی غلط آدمی کو کاٹتے نہیں دیکھا اور یہ کہنا تو سراسر غلط بیانی اور تہمت طرازی ہوگی کہ وہ بالکل جنگلی یا بے کہا تھا۔ سدھا سدھایا ضرور تھا۔ مگر صرف پچاس فی صد۔ اس اجمال پر ملال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بچے حکم دیتے کہ جاؤ' اس راہ گیر کے پیچھے لگ جاؤ تو یہ میرا شیر اپنی کمین گاہ سے نکل کر تعمیلاً جھپٹ پڑتا اور اس کی ٹائی پکڑ کے لٹک جاتا لیکن جب دوسرا حکم ملتا کہ چھوڑ دو تو مجال ہے جو چھوڑ دے۔

مرزا کو مبدءِ فیاض نے حد درجہ محتاط اور وہمی طبیعت ودیعت کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ انہیں آبِ حیات بھی پینا پڑے تو بغیر ابالے نہیں پییں گے۔ اسی وضع احتیاط کے باعث انہوں نے سیزر کے آنے کے بعد ہمارے ہاں آنا جانا اتنا کم کر دیا کہ کبھی بھولے بھٹکے آنکلتے تو ہم سب ان کی ایسی خاطر مدارات کرتے' ایسی گرمجوشی سے ملتے کہ انہیں خدشہ ہونے لگا کہ ہم قرض نہ مانگ بیٹھیں۔ ایک دن ہمارے ایماء پر پروفیسر عبدالقدوس مرزا کو طرح طرح سے سمجھانے لگے کہ کتا بڑا بے نظیر جانور ہے۔ کتے کے سوا کوئی جان دار پیٹ بھرنے کے بعد اپنے پالنے والے کا شکر ادا نہیں کرتا۔ غور کرو دم دار جانوروں میں کتا ہی تنہا ایسا جانور ہے جو اپنی دم کو بطور آلہ اظہار خلوص وخوشنودی استعمال کرتا ہے۔ ورنہ باقی ماندہ گنوار جانور تو اپنی پونچھ سے صرف مکھیاں اڑاتے ہیں۔ دنبہ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی دم صرف کھانے کے کام آتی ہے۔ البتہ بیل کی دم سے ''ایکسی لریٹر'' کا کام کیا جاتا ہے مگر تمہیں بیل گاڑی تھوڑی دوڑانی ہے۔ (مرزا کے زانو پر ہاتھ مار کر) ہائے! ایک فرانسیسی ادیبہ کیا خوب کہہ گئی ہے کہ میں آدمیوں کو جتنے قریب سے دیکھتی ہوں' اتنے ہی کتے اچھے لگتے ہیں۔ (لہجہ بدل کر) کتوں سے ڈرنا بڑی نادانی اور بزدلی ہے۔ خصوصاً ولایتی کتوں سے! پھر مرزا کا ڈر نکالنے کے لیے انہی کے کھچڑی سر کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ انگریزوں کے کتوں کے دانت مصنوعی ہوتے ہیں! کھانے کے اور کاٹ کھانے کے اور! قسموں سے بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو ہماری طرف اشارہ کر کے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا کہ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی تین ہفتے سے ایک ''دُم کٹا'' کاکراسپنیل'' پلا پال رکھا ہے۔ (کاکراسپنل کی مشہور پہچان معلوم ہے؟ اس کے کان اس کی ٹانگوں سے لمبے ہوتے ہیں اور ٹانگیں اتنی چھوٹی کہ زمین تک نہیں پہنچ پاتیں!) دو ہفتے تک تو بچے دن دن بھر اسے گود میں لیے بھونکنا سکھاتے رہے۔ مگر اب ان کو اس سے ذرا دور ہی رکھتا ہوں کیونکہ جمعہ کو چھوٹے بچے نے

☆ بوگن دلیا۔ ایک زود رو بیل جو بہت اونچی ہوتی ہے اور جس میں بہت شوخ رنگ کے پھول آتے ہیں۔ خصوصاً سرخ

کھیلتے کھیلتے اچانک اسے کاٹ کھایا۔ اپنے پہلے دانت سے۔ ابھی تک پلے کے پنسلین کے انجکشن لگ رہے ہیں۔

پروفیسر قاضی عبدالقدوس بے دودھ کی کافی کے گھونٹ لے لے کر یہ سگ بیتی سنا رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے سیزر کو نہ جانے کیا ہڑک اٹھی کہ بوگن ولیا کی اوٹ سے ان کے قیمہ بھرے سموسے پر جھپٹا۔ کافی منہ کی منہ میں رہ گئی۔ بدحواسی میں پیالی مرزا کے سر پر گری (جن سے مؤخر الذکر کئی جگہ سے چیخ گیا) اور پروفیسر مذکور گرم کافی کا غرارہ کرتے ہوئے اپنے قد سے اونچا پھاٹک پھلانگ گئے۔

مرزا نے پوچھا "کتے سے ڈر گئے؟"

"نہیں تو!" وہ پھاٹک کے دوسری طرف بڑے خوددار لہجے میں تھر تھر کانپتے ہوئے بولے۔

ممکن ہے یہ گفتگو کچھ دیر اور جاری رہتی، مگر موضوع گفتگو نے ایک ہی جست میں پروفیسر قاضی عبدالقدوس کو دبوچ لیا اور ان کی سڈول ران میں اپنے نوکیلے کیلے پیوست کردیے۔ وہ منہ پھیر کر کھڑے ہوگئے۔ چار پانچ دن پہلے بھی ایسی ہی گتھم گتھا ہوچکی تھی کہ کبھی کتا ان کے اوپر اور کبھی ......اور کبھی وہ کتے کے نیچے! لہٰذا ہم نے پھر بوگن ولیا کی کانٹے دار ٹہنی توڑ کر ایک قمچی بنائی اور اس بدتمیز کو سڑاک سڑاک مارنے کو دوڑے۔ مگر پروفیسر موصوف جہاں کے تہاں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ کہنے لگے للہ! یہ نہ کرو۔ ابھی تو میرے پچھلے نیل بھی نہیں مٹے!

جیسا کہ ہمارے پڑھنے والوں نے بھانپ لیا ہوگا، کتا پالنا تو ایک طرف رہا کتوں اور پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے باہمی تعلقات کاٹنے اور کٹوانے کے کامیاب تجربات سے کبھی آگے نہیں بڑھے۔ ورنہ ان کا علم الحیوانات اس حد تک کتابی یعنی ناقص ہے کہ ہمارے بچے جس دن بازار سے طوطے کا پہلا جوڑا خرید کر لائے تو ان سے دریافت کیا چچا جان! ان میں نر کون سا ہے اور مادہ کون سی؟ فاضل پروفیسر نے چار پانچ منٹ تک سوال اور جوڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر بہت محتاط انداز میں فرمایا "بیٹا! یہ بہت طوطا چشم جانور ہوتا ہے۔ ابھی دو تین مہینے اور دیکھو۔ دونوں میں سے جو پہلے انڈے دینا شروع کردے وہی مادہ ہوگی۔" خیر یہ لاعلمی تو انسانی معذوری سمجھ کر پھر بھی معاف کی جاسکتی ہے کیونکہ طوطا اپنی مادہ کو انسان کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے پہچان لیتا ہے لیکن ایک دن ناصحانہ انداز میں بڑے تجربے کی بہت باریک بات یہ بتائی کہ یقین مانو کتا رکھنے سے صحت بہتر ہوجاتی ہے۔ یہ سننا تھا کہ مرزا نے اتنے زور کا قہقہہ لگا کر تعلقات میں فوراً بال پڑ گیا جو کئی دفعہ کافی پلانے کے بعد دور ہوا۔

تعلقات جب از سرِ نو اس درجہ خوشگوار ہوگئے کہ اب تپے سے گفتگو ہونے لگی تو مرزا کو تپانے کے لیے وہ پھر ثنائے سگ میں مشغول ہوگئے۔ ایک دن موج میں جو آئے تو بشارت دی کہ طبی نقطہ نگاہ

سے کتا بہت مفید و مقوی جانور ہے۔ یہ سن کر مرزا انہیں مسلمان نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر اپنے ساتھ کے ان بیماروں کے نام گنوانے لگے جنہیں اس نسل نے تندرستی کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ اور دور کیوں جائیں۔ خود ان کو اپنے بالشت بھر کے پلّے سے بے انتہا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ مرزا نے کہا ''ذرا کھول کے بات کرو''۔ بولے ''اب تم سے کیا پردہ۔ کتے کو روزانہ گوشت چاہیے۔ اور یہ ہم پر کتا پالنے کے بعد ہی منکشف ہوا کہ پہلے ہمارے گھر میں روزانہ گوشت نہیں پکتا تھا اور ہم بڑی لاعلمی میں زندگی بسر کر رہے تھے!'' ان کی بنا بپتی زندگی پر جو پردۂ غفلت چالیس سال سے پڑا ہوا تھا' اس کے دفعتہً اٹھنے بلکہ چاک ہونے کے بعد ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اب وہ اپنی صحت سے اس قدر مطمئن ہو گئے تھے کہ ایک نمبر بڑا جوتا پہننا شروع کر دیا تھا۔

ہم تو اس کو حسن اتفاق ہی کہیں گے کہ مدتوں بعد پروفیسر موصوف کی تندرسی ایک دم ایسی بحال ہوئی کہ ہمیں رشک آنے لگا۔ اس لیے کہ اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ مہینے میں تین چار دن بغیر دوا کے رہ سکتے تھے۔ مرزا کہتے تھے کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے خیالی پلّے کو صبح شام دو تین میل ٹہلانا پڑتا ہے۔

اونچی ذات کے کتوں کی صحت بخش صحبت سے پروفیسروں کی کایا پلٹ ہونا تو غیر شاعرانہ خیال آرائی ہے۔ تاہم اس کی گواہی سارا محلّہ دے گا کہ ہمارے بعض احسان فراموش ہمسایوں کی گرتی ہوئی صحت پر سیزر کی موجودگی' خصوصاً اس کے بھونکنے کا نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ جس کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ غریب خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے لدھڑ سے لدھڑ پڑوسی کی چال میں ایک عجیب چوکنا پن ایک عجیب چستی اور لپک جھپک پیدا ہو جاتی تھی۔ سیزر منٹوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کروا دیتا تھا۔ اوروں کا کیا ذکر خود خواجہ شمس الدین (امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر) جو کہنے کو سیزر سے نالاں تھے' اس کے فیضان صحت سے اپنے کو نہ بچا سکے۔ سیٹھ صاحب موصوف کم و بیش پندرہ سال سے لو بلڈ پریشر (Low Blood Pressure) کے لاعلاج مریض تھے۔ علاج معالجے' ٹونے ٹوٹکوں پر لاکھوں روپے صرف کر چکے تھے۔ سب بے سود اور اب یہ نوبت آ گئی تھی کہ لالچی سے لالچی ڈاکٹر بھی انہیں اپنا مستقل مریض بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ مبادا انہیں روز روز مطب میں بیٹھا دیکھ کر دوسرے مریض بدک جائیں کہ اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں۔ لیکن ہمارے پڑوس میں آنے کے تین مہینے کے اندر اندر نہ صرف یہ کہ ان کا ''بلڈ پریشر'' بڑھ کر نارمل ہو گیا بلکہ بفضلہٖ اس سے بھی پندرہ بیس درجے اوپر رہنے لگا۔

ان واقعات کا تعلق اس دورِ ناواقفیت سے ہے جب ہم کتا پالنا کھیل سمجھتے تھے۔ کنیل کلب کا

باقاعدہ ممبر بننے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ سیزر بچارا بالکل بے قصور تھا۔ غلطی سراسر ہماری ہی تھی کہ کتے کو مثل اپنی اولاد کے پال رہے تھے۔ یعنی ڈانٹ ڈانٹ کر۔ بڑے بڑے جگادریوں سے کتا پالنے کے ادب آداب سیکھے تو پتہ چلا کہ کتے کے ساتھ تو نرمی کا برتاؤ لازم ہے بلکہ اس کے سامنے بچوں کو بے دردی سے پیٹنا نہیں چاہیے ورنہ اس کی شخصیت پچک کر رہ جاتی ہے۔ اور یہاں یہ کیفیت تھی کہ گھر کے ہر فرد نے اس پر بھونک بھونک کر اپنا گلا بٹھا لیا تھا لیکن جیسے جیسے کتا بڑا ہوا ہم میں بھی سمجھ آتی گئی اور ڈانٹ پھٹکار کا سلسلہ بند ہو گیا۔

سیزر ہی کے دم خم سے آٹھ نو سال تک ایسی بے فکری رہی کہ کبھی تالا لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کو ہمارے مال و اسباب کی حفاظت کا اس درجہ خیال تھا کہ شامت کا مارا کوئی کوا یا بلی باورچی خانے کے پاس سے بھی گزر جائے تو نتھنے پھلا کر اس بری طرح کھدیڑتا کہ سارے چینی کے برتن ٹوٹ جاتے۔ گھر کی چوکیداری اور کام کاج میں اس طرح ہاتھ بٹانے کے علاوہ وہ ایک سمجھ دار کتے کے دیگر فرائض بھی انجام دیتا رہا جن سے صاف بوئے وفا آتی تھی۔ یہی نہیں کہ وہ ناشتے پر ہمارے لیے تازہ اخبار منہ میں دبا کر لاتا بلکہ جب مہینے کی پہلی تاریخ کو اخبار والا بل لے کر آتا تو اس پر بھونکتا بھی تھا۔ اور ایک منہ میں اخبار لانے پر ہی موقوف نہیں۔ وہ تو کہیے ہم نے خود دو تین دفعہ سختی سے منع کر دیا' ورنہ وہ تو ہمارے لیے توس بھی اسی طرح لا سکتا تھا۔ کھانے پر دونوں وقت وہ ہماری کہنی سے لگا بیٹھا رہتا اور حسب معمول ہم ہر پانچ لقموں کے بعد ایک لقمہ اسے بھی ڈال دیتے۔ اگر وہ اسے سونگھ کر چھوڑ دیتا تو ہم بھی فوراً تاڑ جاتے کہ ہو نہ ہو کھانا باسی ہے۔

غرض کہ بہت ہی ذہین اور خدمتی تھا۔

وقت گزرتا دکھائی نہیں دیتا۔ مگر ہر چہرے پر ایک داستان لکھ جاتا ہے۔ کل کی سی بات ہے۔ جب سیزر بچہ سا آیا تھا تو پروفیسر قاضی عبدالقدوس جو سدا سے یک رنگی کے قائل ہیں' اتوار کے اتوار موچنے سے اپنے سر کے سفید بال اکھاڑا کرتے تھے۔ بال وہ اب بھی اکھاڑتے تھے' مگر صرف کالے۔ (انہیں خود بھی اپنی عمر کا احساس ہو چلا تھا اور غالباً اسی رعایت کے تحت اب صرف بال بچوں والی عورتوں پر ان کی طبیعت آئی تھی۔) نادان بچوں کی وہ پہلی کھیپ جس نے سیزر کے ذریعے انگریزی سیکھی' اب ماشاء اللہ اتنی سیانی ہو چکی تھی کہ اردو اشعار کا صحیح مطلب سمجھ کر شرمانے کے قابل ہو گئی۔ سیزر بھی رفتہ رفتہ خاندان ہی کا ایک معمر رکن بن گیا...... اس لحاظ سے کہ اب کوئی اس کا نوٹس نہیں لیتا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ بوڑھا ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ دل میں اس کے لیے رفاقت و ہم سفری کا ایک احساس' دردمندی و ہم نصیبی کا ایک رشتہ پیدا ہو چلا کہ ہم نے ایک دوسرے کو بوڑھا ہوتے دیکھا تھا۔ ایک ساتھ وقت سے ہار مانی تھی۔

آج اس کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ جوان تھا تو راہ چلتوں کا پنجے جھاڑ کر ایسا پیچھا کرتا کہ وہ گھگھیا کر قریب ترین گھر میں گھس جاتے اور بے آبرو ہو کر نکالے جاتے۔ وہ تاک میں رہتا اور نکلتے ہی ان کے منہ اور گردن کو ہر دفعہ بانداز دیگر یوں بھنبھوڑتا گویا جانور نہیں، کسی انگریزی فلم کا ندیدہ ہیرو ہے (یہ مرزا کے الفاظ ہیں۔ کہتے ہیں انگریزی فلموں میں لوگ یوں پیار کرتے ہیں جیسے تخمی آم چوس رہے ہیں) ابھی تین سال پہلے تک اسے دیکھ کر پڑوسیوں کا چلوؤں خون سوکھتا تھا۔ مگر اب اتنا ضعیف ہو گیا تھا کہ دن بھر بوگن ولیا کے نیچے کسی مرشد کامل کی طرح مراقبے میں پڑا تھا۔ بہت ہوا تو وہیں سے لیٹے لیٹے دم ہلا کر شفقت کا اظہار کر دیا۔ البتہ چھوٹے بچوں کو خواہ گھر کے ہوں یا پاس پڑوس کے اس نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی بچہ اسے آواز دے کر گیند پھینکے اور وہ گودا بھری نلی چھوڑ چھاڑ، گیند اپنے منہ میں رکھ کر واپس نہ لائے۔ اس معاملے میں اسے بچوں کی تالیف قلوب اس درجہ عزیز تھی کہ کئی دفعہ فٹ بال تک منہ میں رکھ کر لانے کی کوشش کی۔ اعضاء و جوارح رفتہ رفتہ جواب دے رہے تھے۔ ساری تن پھن غائب، غرّش ختم۔ مرزا کے الفاظ میں اس کا بڑھاپا شباب پر تھا۔ کسی کسی دن سہ پہر تک بوگن ولیا کی چھاؤں میں وہی سنسنی خیز اردو اخبار اوڑھے اونگھتا رہتا، جس میں نوکر صبح قیمہ بندھوا کر لایا تھا۔ چاندنی اور ماداؤں کی مست مہک سے اب اس کے خون میں جوار بھاٹا نہیں آتا تھا۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ ''گرمی'' پر آتا تو سرشام ہی سے زنجیر تڑا کر قدآدم دیوار پھاند جاتا اور فجر کی اذان کے وقت شاد کام لوٹتا۔ یا اب اس جواں دیدہ بزرگ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ گرمائی ہوئی مادہ اور ہڈی بیک وقت نظر آ جائیں تو ہڈی پر ہی جھپٹتا تھا اور جب اس ہڈی کو پپولتے پپولتے اس کے بوڑھے جبڑے دکھنے لگتے تو اسے سرخ بوگن ولیا کے نیچے دفن کر کے وضو کے لوٹے میں منہ ڈال کر پانی پینے چلا جاتا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی سیزر ہے جس کے جبڑے کی مہر محلے ہر تیسرے آدمی کی پنڈلی پر آج تک گواہی دے رہی ہے کہ

ع اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

وہی دم جو ایک زمانے میں بقول شخصے سوالیہ نشان کی طرح کھڑی رہتی تھی، اب مفلس کی مونچھ کی مانند لٹکنے لگی۔ اس کے ہم عمر ایک ایک کر کے وہ گلیاں سونی کر گئے، جہاں سے راتوں کو ان دیکھے بھید بھرے جسموں کی خوشبوؤں کے بلاوے آتے تھے۔ وہ تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا و دل گرفتہ۔ نئی پود کے منہ زور کتوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو درکنار، وہ ان کے نو دولتے مالکوں پر بھونکنا بھی اپنے رتبے کے منافی سمجھتا تھا۔ لیکن جس دن سے ماتا ہری کی جوان پٹھور بیٹی کلوپٹرا بھری دوپہری میں ایک حلوائی کے بے نام کتے کے ساتھ بھاگی، وہ ہفتوں اپنے ہم جنس کی آواز تک کو ترسنے لگا۔ جب تنہائی سے بہت جی گھبرانے لگتا تو ریڈیو کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور پکے گانے سن کر بہت خوش ہوتا۔

جسم کے ساتھ ساتھ نظر بھی اتنی موٹی ہو گئی تھی کہ کبھی پروفیسر قاضی عبدالقدوس اجلے کپڑے پہن کر آ جاتے تو انہیں اجنبی سمجھ کر بھونکنے لگتا۔ البتہ سماعت میں فرق نہیں آیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اٹکل سے گیند کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے ٹپا کھانے سے اس کی سمت اور محل وقوع کا اندازہ کر لیتا ہے۔ ایک دن شام کو اچھا خاصا بوگن ولیا کے نیچے اپنا مخصوص آسن مارے (دائیں آنکھ جو بچپن سے سرخ رہتی تھی، آدھی بند کیئے بائیں پنجے پر تھوتھنی رکھتے) بیٹھا تھا کہ ایک نیلی ربن والی بچی نے "شو" کہہ کر سڑک پر پنگ پانگ کی گیند پھینکی۔ وہ آواز کی سیدھ پر لپکا۔ مگر جیسے ہی گیند منہ میں پکڑ کے تیزی سے پلٹا، ایک کار کے بریک لگنے کی دلخراش آواز سنائی دی۔

بچے چیختے ہوئے دوڑے۔ سڑک پر دور تک ٹائروں کے گھسنے سے دو سیاہ پٹیاں بن گئیں۔ کار ایک دھچکے کے ساتھ رکی اور اپنے اسپرنگوں پر دو تین ہچکولے کھا کر غراتی ہوئی تیزی سے پہلے ہی موڑ پر مڑ گئی۔ مگر سیزر بیچ راستے ہی میں رہ گیا۔ اس کا پچھلا دھڑ کار کا پورا وزن سہار چکا تھا۔ منہ سے خون جاری تھا۔ اور پاس ہی گیند پڑی تھی جو اب سفید نہیں رہی تھی۔

سب نے مل کر اسے اٹھایا اور پھاٹک کے پاس بوگن ولیا کے نیچے لٹا دیا۔ لگتا تھا شریانوں کے منہ کھل گئے ہیں۔ اور اس کی زندگی دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ رس رہی ہے۔ ضرب بہ ضرب، قطرہ بہ قطرہ، دم بہ دم۔ ہر ایک اسے چھو چھو کر انگلیوں کی پوروں سے دل کی دھڑکن سن رہا تھا...... وہ دھڑکن جو دوسری دھڑکن تک ایک نیا جنم، ایک نئی جون بخشتی ہے۔ کس جی سے کہوں کہ اس کا آب و دانہ اٹھ چکا تھا اور وہ رخصت ہو رہا تھا اس ہمت، اس حوصلے، اس سکون کے ساتھ، جو صرف جانوروں کا مقدر ہے۔ بغیر کراہے، بغیر تڑپے، بغیر ہراساں ہوئے۔ بس بے نور نظریں جمائے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ باری باری سب نے اسے چمکارا۔ سر پر ہاتھ رکھتے ہی وہ آنکھیں جھکا لیتا تھا اور یہ یاد کر کے سب کی آنکھیں بھر آئیں کہ اس کی زندگی میں آج پہلا موقع تھا کہ سر پر ہاتھ پھرواتے وقت وہ جواباً اپنی ریشم سی ملائم دم نہیں ہلا سکتا تھا۔ اس کے نتھنوں میں ایک اجنبی خون کی بو گھسی جا رہی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا کہ چار پانچ کوے اوپر منڈلانے لگے اور دھیرے دھیرے اتنے نیچے اتر آئے کہ ان کے منحوس سائے اس پر پڑنے لگے۔ کچھ دیر بعد احاطے کی دیوار پر آ بیٹھے اور شور مچانے لگے۔ سیزر نے ایک نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ایک لحظے کے لیے اسکے نتھنے پھڑک اٹھے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ہم سے یہ نہ دیکھا گیا۔ اس کا خون آلود منہ کھول کر سونے کی گولیوں کی شیشی حلق میں الٹ دی اور کالر اتار دیا۔

ذرا دیر بعد وہ اپنے پیار کرنے والوں کی دھندلاتی صورتیں دیکھتا دیکھتا ہمیشہ کے لیے سو گیا!

مارچ کے چڑھتے چاند کی بھیگی بھیگی روشنی میں جب بچوں نے مل کر اس کی محبوب بوگن ولیا کے

نیچے زمین کی امانت زمین کو سونپنے کے لیے گہرا سا گڑھا کھودا تو چھوٹی بڑی بے شمار ہڈیاں نکلیں، جنہیں وہ غالباً دفن کر کے بھول گیا تھا۔ دور دور تک بوگن ولیا کی لمبی لمبی انگلیوں جیسی جڑیں اپنا راستہ ٹٹولتی ہوئی زمین کے نیم گرم سینے میں اترتی چلی گئی تھیں اور اس کا رس چوس چوس کر شاخوں کے سروں پر دہکتے ہوئے پھولوں تک پہنچا رہی تھیں۔ مگر سوکھی پیاسی جڑوں کو آج سینزر کے لہو نے ان پھولوں سے بھی زیادہ سرخ کر دیا ہوگا جو بچوں نے لحد کا منہ اپنی سلیٹوں اور تختیوں سے بند کر کے اوپر بکھیر دیے تھے۔ آخر میں نیلی ربن والی بچی نے اپنی سالگرہ کی موم بتیاں سرہانے روشن کر دیں۔ ان کی اداس روشنی میں بچوں کے میلے گالوں پر آنسوؤں کی نمکین اُجلی لکیریں صاف چمک رہی تھیں۔

کئی مہینے بیت گئے۔ پت جھڑ کے بعد بوگن ولیا پھر انگارے کی طرح دہک رہی ہے۔ مگر بچے آج بھی اس جگہ کسی آدمی کو پاؤں نہیں رکھنے دیتے کہ وہاں ہمارا ایک ساتھی سو رہا ہے۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء

بارے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے

دوسروں کو کیا نام رکھیں، ہم خود بیسیوں چیزوں سے چڑتے ہیں...... کرم کلا، پنیر، کمبل، کافی اور کاذکا، عورت کا گانا، مرد کا ناچ، گیندے کا پھول، اتوار کا ملاقاتی، مرغی کا گوشت، پاندان، غرارہ، خوبصورت عورت کا شوہر...... زیادہ حد ادب کہ مکمل فہرست ہماری فرد گناہ سے بھی زیادہ طویل اور ہری بھری نکلے گی۔ گنہ گار سہی، لیکن مرزا عبدالودود بیگ کی طرح یہ ہم سے آج تک نہ ہوا کہ اپنے تعصبات پر معقولات کا نیم چڑھا کر دوسروں کو اپنی بے لطفی میں برابر کا شریک بنانے کی کوشش کی ہو۔ مرزا تو بقول کسے، غلط استدلال کے بادشاہ ہیں۔ ان کی حمایت و وکالت سے معقول سے معقول ''کاز'' نہایت لچر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے ہم سب انہیں تبلیغ دین اور حکومت کی حمایت سے بڑی سختی سے باز رکھتے ہیں۔ ان کی ایک چڑ ہو تو بتائیں۔ فہرست رنگارنگ ہی نہیں، اتنی غریب پرور بھی ہے کہ اس میں اس فقیر بے تقصیر کا نام بھی خاصی اونچی پوزیشن پر شامل رہ چکا ہے۔ بعد میں ہم سے یہ پوزیشن بینگن کے بھرتے نے چھین لی اور اس سے جیکی کینیڈی کے دولہا اوناسس نے ہتھیالی۔ مرزا کو آج جو چیز پسند ہے کل وہ دل سے اتر جائے گی اور پرسوں تک یقیناً چڑ بن جائے گی۔ لوگ ہمیں مرزا کا ہمدم و ہمراز ہی نہیں، ہمزاد بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس یگانگت و تقرب کے باوجود ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ مرزا نے آلو اور ابوالکلام آزاد کو اول اول اپنی چڑ کیسے بنایا۔ نیز دونوں کو تہائی صدی سے ایک ہی بریکٹ میں کیوں بند کر رکھا ہے؟

بوئے یاسمین باقیست

مولانا کے باب میں مرزا کو جتنا کھرچا، تعصب کے ملمع کے نیچے خالص منطق کی یہ موٹی موٹی تہیں نکلتی چلی گئیں۔ ایک دن کئی وار خالی جانے کے بعد ارشاد فرمایا ''ایک صاحب طرز انشاء پرداز نے بانی ندوۃ العلماء کے بارے میں لکھا ہے کہ شبلی پہلا یونانی تھا جو مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ اس پر مجھے یہ گرہ لگانے کی اجازت دیجیے کہ یونانیوں کی اس اسلامی شاخ میں ابوالکلام آخری اہل قلم تھا جس نے اردو رسم الخط میں عربی لکھی!'' ہم نے کہا ''ان کی شفاعت کے لیے یہی کافی ہے کہ انہوں نے مذہب میں فلسفے کا رس گھولا۔ اردو کو عربی کا سوز و آہنگ بخشا'' فرمایا ''ان کی نثر کا مطالعہ ایسا ہے جیسے دلدل میں تیرنا! اسی لیے مولوی عبدالحق علانیہ انہیں اردو کا دشمن کہتے تھے۔ علم و دانش اپنی جگہ مگر

اس کو کیا کیجیے کہ وہ اپنی انا اور اُردو پر آخری دم تک قابو نہ پاسکے۔ کبھی کبھار رمضان میں ان کا ترجمان القرآن پڑھتا ہوں تو (اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ مارتے ہوئے) نعوذ باللہ محسوس ہوتا ہے گویا کلام اللہ کے پردے میں ابوالکلام بول رہا ہے!'' ہم نے کہا ''لاحول ولا قوۃ! اس بزرگ کی تمام کردہ و ناکردہ خطائیں تمہیں صرف اس بناء پر معاف کردینی چاہیں کہ تمہاری طرح وہ بھی چائے کے رسیا تھے۔ کیا نام تھا ان کی پسندیدہ چائے کا؟ اچھا سا نام تھا۔ ہاں! یاد آیا۔ وہائٹ جیسمین! یاسمن سفید!''

شگفتہ ہوئے۔ فرمایا ''مولانا کا مشروب بھی ان کے مشرب کی مانند تھا۔ ٹوٹے ہوئے بتوں کو جوڑ جوڑ کر امام الہند نے ایسا معبود تراشنے کی کوشش کی جو اہل سومنات کو بھی قابل قبول ہو۔ یونانی فلسفے کی عینک سے جب انہیں دین میں دنیا اور خدا میں ناخدا کا جلوہ نظر آنے لگا تو وہ مسلمان ہوگئے اور سچے دل سے اپنے آپ پر ایمان لے آئے۔ اسی طرح یہ چینی چائے محض اس لیے ان کے دل کو بھاگئی کہ اس میں چائے کے بجائے چنبیلی کے گجرے کی لپٹ آتی ہے۔ حالانکہ کوئی شخص جو چائے پینے کا ذرا بھی سلیقہ رکھتا ہے' اس لیے چائے پیتا ہے کہ اس میں چائے کی...... فقط چائے کی...... مہک آتی ہے' نہ کہ چنبیلی کے تیل کا بھبکا!''

ہم نے کہا ''تعجب ہے! تم اس بازاری زبان میں اس آب نشاط انگیز کا مضحکہ اڑا رہے ہو' جو بقول مولانا 'طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکر عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔'' اس جملے سے ایسے بھڑکے کہ بھڑکتے **چلے گئے۔** لال پیلے ہوکر بولے ''تم نے لپٹن کمپنی کا قدیم اشتہار 'چائے سردیوں میں گرمی اور گرمیوں **میں ٹھنڈک پہنچاتی** ہے' دیکھا ہوگا۔ مولانا نے یہاں اسی جملے کا ترجمہ اپنے مداحوں کی **آسانی کے لیے اپنی زبان میں** کیا ہے!'' بحث اور دل شکنی کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ لیکن مزید نقل **کفر کرکے ہم** اپنی دنیا و عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا اس تشبیب کے بعد مرزا کی دوسری چڑ یعنی آلو کی طرف گریز کرتے ہیں۔

یہ دانت سلامت ہیں جب تک

مرزا کا ''باس'' دس سال بعد پہلی مرتبہ تین دن کی رخصت پر جارہا تھا۔ اور مرزا نے اپنے مشیروں اور بہی خواہوں کو جشن نجات منانے کے لیے بیچ لکژری ہوٹل میں لنچ پر مدعو کیا تھا۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ سمندری کچھوے کا شوربہ سڑ سڑ پینے کے بعد مرزا مسلم کیکڑے (مسلم کے معنی یہ ہیں کہ مرحوم کی سالم ٹانگیں' کھپرے' آنکھیں اور مونچھیں پلیٹ پر اپنی قدرتی حالت میں نظر آرہی تھیں) پر ٹوٹ پڑے۔ ہم نے کہا ''مرزا! ہم نے تمہیں چپکا مارتی خمیری نان کھاتے دیکھا ہے' کھروں کے چٹپٹے سریش میں ڈبو ڈبو کر' جسے تم دلی کے نہاری پائے کہتے ہو۔ مفت کی مل جائے تو سڑاندی سارڈین یوں نگلتے ہو گویا ناک نہیں رکھتے۔ اور تو اور رنگاماٹی میں چکما قبیلے کی ایک دوشیزہ کے ہاتھ سے نشیلا کسیلا جیک فروٹ لپ لپ

کھاتے ہوئے فوٹو کھنچوا چکے ہو۔ اور اس کے بعد پشاور میں چڑوں کے پکوڑے کھاتے ہوئے بھی پکڑے جا چکے ہو۔ تمہاری مشرب اکل وشرب میں ہر شے حلال ہے، سوائے آلو کے!''

کھل گئے۔ فرمایا'' ہم نے آج تک کسی مولوی ...... کسی فرقے کے مولوی کی تندرستی خراب نہیں دیکھی۔ نہ کسی مولوی کا ہارٹ فیل ہوتے سنا۔ جانتے ہو کیا وجہ ہے؟ پہلی وجہ تو یہ کہ مولوی کبھی ورزش نہیں کرتے۔ دوسری یہ کہ سادہ غذا اور سبزی سے پرہیز کرتے ہیں!''

ہوٹل ہذا اور آلو کی عملداری

سبزی نہ کھانے کے فوائد ذہن نشین کرانے کی غرض سے مرزا نے اپنی زیر تجربہ زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا جو آلو سے کیمیائی طور پر متاثر ہوئے تھے۔ ذکر آلو کا ہے۔ انہی کی زبان غیبت بیان سے اچھا معلوم ہوگا:۔

تمہیں تو کیا یاد ہوگا۔ میں دسمبر ۱۹۵۱ء میں منٹگمری گیا تھا۔ پہلی دفعہ کراچی سے باہر جانے کی مجبوری لاحق ہوئی تھی۔ منٹگمری کے پلیٹ فارم پر اترتے ہی محسوس ہوا گویا سردی سے خون رگوں میں جم گیا ہے۔ ادھر چائے کہ اسٹال کے پاس ایک بڑے میاں گرم چائے کے بجائے مالٹے کا رس پیے چلے جا رہے تھے۔ اس بندۂ خدا کو دیکھ کر اور دانت بجنے لگے۔ کراچی کا دائمی حبس اور بغیر کھڑکیوں والا کمرہ بے طرح یاد آئے۔ قلی اور تانگے والے سے صلاح ومشورے کے بعد ایک ہوٹل میں بستر الگا دیا۔ جس کا اصلی نام آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن منیجر سے لے کر مہتر تک سبھی اسے ہوٹل ہذا کہتے تھے۔ کمرہ صرف ایک ہی تھا جس کے دروازے پر کوئلے سے بحروف انگریزی و اردو'' کمرہ نمبر 1'' لکھا تھا۔ ہوٹل ہذا میں نہ صرف یہ کہ کوئی دوسرا کمرہ نہیں تھا، بلکہ مستقبل قریب یا بعید میں اس کی تعمیر کا امکان بھی نظر نہیں آتا تھا کیونکہ ہوٹل کے تین طرف میونسپلٹی کی سڑک تھی اور چوتھی طرف اسی ادارے کی مرکزی نالی جو شہر کی گندگی کو شہر ہی میں رکھتی تھی جنگل تک نہیں پھیلنے دیتی تھی۔ جزیرہ نمائے کمرہ نمبر 1 میں'' اٹیچڈ باتھ روم'' تو نہیں تھا البتہ ایک اٹیچڈ تنور ضرور تھا جس سے کمرہ اس کڑاکے کی سردی میں ایسا گرم رہتا تھا کہ بڑے بڑے'' سنٹرلی ہیٹڈ'' (Centrally heated) ہوٹلوں کو مات کرتا تھا۔ پہلی رات ہم بنیان پہنے سو رہے تھے کہ تین بجے صبح جو تپش سے ایکا ایکی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ امام دین بیرا ہمارے سرہانے ہاتھ بھر لمبی خون آلود چھری لیے کھڑا ہے۔ ہم نے فوراً اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ پھر چپکے سے بنیان میں ہاتھ ڈال کر پیٹ پر چٹکی لی اور پھر کلمہ پڑھ کہ اتنی زور سے چیخ ماری کہ امام دین اچھل پڑا اور چھری چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو تین بیرے سمجھا بجھا کر اسے واپس لوا لائے۔ اس کے اوسان بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ چھری سے وہ ننھی ننھی بٹیریں ذبح کر رہا تھا۔ ہم نے ایک وقار کے ساتھ کہا'' عقلمند آدمی! یہ پہلے کیوں نہ بتایا؟ اس نے فوراً اپنی بھول کی معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ

آئندہ وہ پہلے ہی کرے گا کہ چھری سے بٹیر ہی ذبح کرنا چاہتا ہے۔ نیز اس نے آسان پنجابی میں یہ بھی یقین دلایا کہ آئندہ وہ چیخ سن کر ڈرپوکوں کی طرح خوفزدہ نہیں ہوا کرے گا۔

ہم نے رسان سے پوچھا ''تم انہیں کیوں ذبح کر رہے تھے؟'' بولا ''جناب! ضلع منٹگمری میں جانور کو حلال کر کے کھاتے ہیں! آپ بھی کھائیں گے؟'' ہم نے قدرے ترشروئی سے جواب دیا ''نہیں!'' اور ریلوے ٹائم ٹیبل سے پنکھا جھلتے ہوئے سوچنے لگے کہ جو لوگ دودھ پیتے بچوں کی طرح جلدی سوتے اور جلدی اٹھتے ہیں، وہ اس رمز کو کیا جانیں کہ نیند کا اصل مزا اور سونے کا صحیح لطف آتا ہی اس وقت ہے جب آدمی اٹھنے کے مقررہ وقت پر سوتا رہے کہ اسی ساعت دُزدیدہ میں نیند کی لذتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی جانور کو صبح دیر تک سونے کی صلاحیت نہیں بخشی گئی۔ اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر خود کو مبارکباد دیتے دیتے صبح ہو گئی اور ہم پوری اور آلو چھولے کا ناشتہ کر کے اپنے کام پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد معدے میں گرانی محسوس ہوئی۔ لہٰذا دوپہر کو آلو پلاؤ اور رات کو آلو اور پنیر کا قورمہ کھا کر تنور کی گرمائی میں ایسے سوئے کہ صبح چار بجے بیرے نے اپنے مخصوص طریقے سے ہمیں جگایا، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ناشتے سے پہلے ہم سر جھکائے قمیض کا بٹن نوچ کر پتلون میں ٹانکنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سوئی کھچ سے انگلی میں بھک گئی۔ بالکل اضطراری طور پر ہم نے انگلی اپنی قمیض کی جیب پر رکھ کر زور سے دبائی، مگر جیسے ہی دوسری غلطی کا احساس ہوا تو خون کے گیلے دھبے پر سفید پاؤڈر چھڑک کر چھپانے لگے اور دل میں سوچنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے بیوی بھی کیا چیز بنائی ہے۔ لیکن انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اپنی بیوی کی قدر نہیں کرتا۔ اتنے میں بیرا مقامی خالص گھی میں تلی ہوئی پوریاں لے آیا۔ منٹگمری کا اصلی گھی پاکستان بھر میں سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اس میں چار فی صد گھی ہوتا ہے۔ بیرے نے حسب معمول اپنے ابروئے تساہل سے ہمیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب ہم اس پر ۴ کے ہندسے کی طرح تہرے ہو کر بیٹھ گئے تو ہمارے زانو پر گیلا تولیہ بچھایا اور اس پر ناشتے کی ٹرے جما کر رکھ دی۔☆

☆ممکن ہے بعض شکی مزاج قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر کمرے میں میز یا اسٹول نہیں تھا تو بان کی چارپائی پر ناشتہ کیوں نہ کر لیا۔ شکایۃً نہیں، اطلاعاً عرض ہے کہ جیسے ہی منٹگمری کا پہلا مرغ پہلی بانگ دیتا، بیرا ہماری پیٹھ اور چارپائی کے درمیان سے بستر ایک ہی جھٹکے میں گھسیٹ لیتا۔ اپنے زور بازو اور روزمرہ کی مشق سے اس کام میں اتنی صفائی اور مہارت پیدا کر لی تھی کہ ایک دفعہ سرہانے کھڑے ہو کے جو بستر گھسیٹا تو ہمارا بنیان تک اتر کر بستر کے ساتھ لپٹ کر چلا گیا اور ہم کھُری چارپائی پر کیلے کی طرح چھلے ہوئے پڑے رہ گئے۔ پھر چارپائی کو پائینتی سے اٹھا کر ہمیں سر کے بل پھسلاتے ہوئے کہنے لگا ''صاب! فرنیچر خالی کرو!'' وجہ یہ کہ اس فرنیچر پر سارے دن ''پروپرائٹر اینڈ منیجر ہوٹل ہذا'' کا دربار لگا رہتا تھا۔ ایک دن ہم نے اس بے آرامی پر پُرزور احتجاج کیا تو ہوٹل کے قواعد وضوابط کا پنسل سے لکھا ہوا ایک نسخہ ہمیں دکھایا گیا جس کے سرورق پر ''ضابطہ فوجداری ہوٹل ہذا'' تحریر تھا۔ اس کی دفعہ ۹ کی رو سے فجر کی اذان کے بعد ''پسنجر'' کو چارپائی پر سونے کا حق نہیں تھا۔ البتہ قریب المرگ مریض، زچہ اور یہود ونصاریٰ اس سے مستثنےٰ تھے۔ لیکن آگے چل کر دفعہ ۲۸ (ب) نے ان سے بھی یہ مراعات چھین لی تھیں۔ اس کی رو سے زچہ اور قریب المرگ مریض کو زچگی اور موت سے تین دن پہلے تک ہوٹل میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ''خلاف ورزی کرنے والوں کو بیروں کے حوالے کر دیا جائے گا۔''

ہم نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اسے جھاڑن منہ میں ٹھونسے بڑے ادب سے ہنستے ہوئے پایا۔ ہم نے پوچھا ''ہنس کیوں رہے ہو؟'' کہنے لگا ''وہ تو منیجر صاحب ہنس رہے تھے بولتے تھے' ہم کو لگتا ہے کہ کراچی کا پسنجر بٹیر کو تلیر سمجھ کے نہیں کھاتا!''

ہر چیز کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ ایک تاریک۔ دوسرا زیادہ تاریک۔ لیکن ایمان کی بات ہے اس پہلو پر ہماری نظر بھی نہیں گئی تھی۔ اور اب اس غلط فہمی کا ازالہ ہم پر واجب ہوگیا تھا۔ پھولی ہوئی پوری کا لقمہ پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے ہم نے رندھی ہوئی آواز میں اس جعل ساز پرند کی قیمت دریافت کی۔ بولا ''زندہ یا مردہ؟'' ہم نے جواب دیا کہ ہم تو اس شہر میں اجنبی ہیں۔ فی الحال مردہ کو ہی ترجیح دیں گے کہنے لگا ''دس آنے پلیٹ ملتی ہے۔ ایک پلیٹ میں تین بٹیریں ہوتی ہیں۔ مگر جناب کے لیے تو ایک ہی راس کافی ہوگی!''

قیمت سن کر ہمارے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ پھر یہ بھی تھا کہ کراچی میں مویشیوں کا گوشت کھاتے کھاتے طبیعت اُکتا گئی تھی۔ لہٰذا دل ہی دل میں عہد کرلیا کہ جب تک منٹگمری کا آب و دانہ ہے' طیور کے علاوہ کسی چیز کے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ لنچ پر بھنی ہوئی بٹیر' چائے کے ساتھ بٹیر کا تنوری چرغا' سونے سے پہلے بٹیر کا آب جوش۔ اس رہائشی تنور میں فروکش ہوئے' ہمیں چوتھا دن تھا اور تین دن سے یہی اللے تللے تھے۔ چوتھی صبح ہم زانو پہ تولیہ اور تولیے پہ ٹرے رکھے تلی ہوئی بٹیر سے ناشتہ کر رہے تھے کہ بیرے نے جھاڑن پھر منہ میں ٹھونس لی۔ ہم نے چمک کر پوچھا ''اب کیا بات ہے؟'' کہنے لگا ''کچھ نہیں۔ منیجر صاحب ہنس رہے تھے۔ بولتے تھے کمرہ نمبر 1 کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہے!'' ہم نے طنزاً اٹیچڈ تنور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''تمہارے ہوٹل ہذا میں اور کون سا من و سلویٰ اترتا؟'' بولا ''حرام گوشت کے علاوہ دنیا بھر کی ڈش ملتی ہے۔ جو چاہیں آرڈر کریں' جناب!...... آلو مٹر' آلو گوبھی' آلو میتھی' آلو گوش' آلو مچھی' آلو بریانی اور خدا تمہارے بھلا کرے...... آلو کوفتہ' آلو بڑیاں' آلو سموسہ' آلو کا رائتہ' آلو کا بھرتا' آلو کیماں ☆...... '' ہم نے روک کر پوچھا ''اور سویٹ ڈش؟'' بولا ''آلو کی کھیر'' ہم نے کہا 'بھلے آدمی! تم نے تو آلو کا پہاڑہ سنا دیا۔ تمہارے ہوٹل میں کوئی ایسی ڈش بھی ہے جس میں آلو کا نام نہ آئے۔ فاتحانہ تبسم کے ساتھ فرمایا ''کیوں نہیں! پوٹے ٹو کٹلٹ! حاضر کروں جناب؟''

قصہ دراصل یہ تھا کہ ایک سال پہلے مالک ہوٹل ہذا نے ہیڈ کانسٹبل کے عہدے سے سبکدوش ہو کر زراعت کی طرف توجہ فرمائی۔ اور زمین سے بھی انہی ہتھکنڈوں سے سونا اگلوانا چاہا۔ مگر ہوا یہ کہ آلو کی کاشت میں پچیس سال کی ذہانت سے جمع کی ہوئی رشوت ہی نہیں بلکہ پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ بھی ڈوب گئے۔

☆ آلو قیمہ

ع زمیں کھا گئی بے ایماں کیسے کیسے

پس انداز کیے ہوئے آلوؤں سے ہوٹل کے دھندے کا ڈول ڈالا۔ جنہیں اب اس کے بہترین دوست بھی تازہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ سنا ہے بیٹر بھی اسی زمانے میں پاس پڑوس کے کھیتوں سے پکڑ لیے تھے!

مکالمہ در مذمت آلو

''مرزا! یہ بٹیر نامہ اپنی جگہ، مگر یہ سوال ابھی تشنہ ہے کہ تم آلو کیوں نہیں کھاتے'' ہم نے پھر وہی سوال کیا۔

''نہیں صاحب! آلو کھانے سے آدمی آلو جیسا ہو جاتا ہے۔ کوئی انگریز عورت ☆ جسے اپنا فگر اور مستقبل ذرا بھی عزیز ہے، آلو کو چھوتی تک نہیں۔ سامنے سوئمنگ پول میں پیر لٹکائے یہ میم جو مصر کا بازار کھولے بیٹھی ہے، اسے تم آلو کی ایک ہوائی بھی کھلا دو تو بندہ اسی حوض میں ڈوب مرنے کو تیار ہے۔ اگر یہ کافی میں چینی کے چار دانے بھی ڈالتی ہے یا کوئی اسے میٹھی نظر سے دیکھ لے تو اس کی کیلوریز+ کا حساب اپنی دھوبی کی کاپی میں رکھتی ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''مرزا کیا میمیں بھی دھوبی کی کاپی رکھتی ہیں؟''

''ہاں! ان میں کی جو کپڑے پہنتی ہیں، وہ رکھتی ہیں!''

ہماری تشنگی علم بڑھتی دیکھ کر مرزا نے آلو کی ہجو میں دلائل و نظائر کا طومار باندھ دیا۔ جہاں کہیں منطق کے ٹاٹ میں ذرا سا سوراخ بھی نظر آیا، وہاں مخملی مثال کا بڑا سا پیوند اس طرح لگایا کہ جی چاہتا تھا کچھ اور سوراخ ہوتے۔ کہنے لگے کرنل شیخ کل رات ہی یورپ سے لوٹے ہیں۔ کہہ رہے تھے یورپ کی اور ہماری خواتین میں بڑا فرق ہے۔ یورپ میں جو لڑکی دور سے سترہ برس کی معلوم ہوتی ہے وہ قریب پہنچ کر ستر برس کی نکلتی ہے اور ہمارے ہاں جو خاتون دور سے ستر برس کی دکھلائی پڑتی ہے وہ نزدیک آنے پر سترہ برس کی نکلتی ہے! مگر یہ وضعداری انگلستان میں ہی دیکھی کہ جو عمر دور سے نظر آتی ہے وہی پاس سے۔ چنانچہ کمر کمر تک بالوں والی جو لڑکی دورے سے انیس سال کی نظر آتی ہے وہ پاس جانے پر بھی انیس ہی سال کا ''ہپی'' نکلتا ہے! خیر سنی سنائی باتوں کو چھوڑو۔ اس میم کا مقابلہ اپنے ہاں کی آلو خور خواتین سے کرو۔ ادھر فانوس کے نیچے، سرخ ساری میں جو محترمہ لیٹر بکس بنی اکیلے اکیلے گپا گپ بیف اسٹیک اور آلو اڑا رہی ہیں۔ اماں! گنواروں کی طرح انگلی سے اشارہ مت کرو۔ ہاں! ہاں! وہی۔ ارے صاحب! کیا چیز تھی! لگتا تھا ایک اپسرا سیدھی اجنتا کے غاروں سے

☆ انگریز: مرزا کی عادت ہے کہ تمام سفر عام غیر ملکیوں کو انگریز کہتے ہیں۔ مثلاً امریکہ کے انگریز، جرمنی کے انگریز، حد یہ کہ انگلستان کے انگریز۔

(+) کیوریز: حرارے۔ غذائی اکائیاں۔

چلی آرہی ہے اور کیا فگر تھا۔ کہتے ہوئے زبان سو سو بل کھاتی ہے۔

چلتی تو قدم یوں رکھتی تھی دن جیسے کسی کے پھرتے ہیں

پہلے پہل مارچ ۱۹۵۱ء میں دیکھا تھا۔ وہ صبح یاد آتی ہے تو کوئی دل پر دستک سی دینے لگتا ہے۔ اور اب؟ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بارہ سال پہلے کی Go-Go Girl گوشت کے انبار میں کہیں کھوگئی ہے۔ عشق اور آلو نے ان حالوں کو پہنچا دیا۔

ہم نے کہا '' ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ! '' بولے '' اہل زبان کے محاورے انہی کے خلاف اندھا دھند استعمال کرنے سے پہلے پوری بات تو سن لیا کرو۔ حمیرہ وہ آئیڈیل عورت تھی' جس کے خواب ہر صحت مند آدمی دیکھتا ہے ...... یعنی شریف خاندان' خوبصورت اور آوارہ! اُردو' انگریزی' فرنچ اور جرمن فراٹے سے بولتی تھی' مگر کسی بھی زبان میں '' نہ '' کہنے کی قدرت نہیں رکھتی تھی۔ حسن اور جوانی کی بشرکت غیرے مالک تھی۔ یہ دونوں اشیائے لطیف جب تبرک ہوگئیں اور پلکوں کے سائے گہرے ہو چلے تو مارے باندھے ایک عقد شرعی بھی کیا۔ مگر ایک مہینے کے اندر ہی دولہا نے عروسی کمر بند کا پھندا گلے میں ڈال کر خودکشی کرلی۔ جا تجھے کشمکش عقد سے آزاد کیا۔ پھر تو ایسے کان ہوئے کہ اس بچاری نے شرعی تکلفات سے خود کو کبھی مکلّف نہیں کیا۔ صاحب! مرد کا کیا ہے آج کل مرد زندگی سے اُکتا جاتا ہے تو شادی کرلیتا ہے۔ اور اگر شادی شدہ ہے تو طلاق دے دیتا ہے۔ لیکن عورت ذات کی بات اور ہے۔ بدی پہ آئی ہوئی عورت جب پریشان یا پشیمان ہوتی ہے تو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے بقول گراموفون ریکارڈ لگا کر اپنے جوڑے کو میکانکی انداز سے تھپتھپاتے ہوئے خواب گاہ میں بولائی بولائی نہیں پھرتی' بلکہ غذا سے غم غلط کرتی ہے۔ حمیرہ نے بھی مرد کی بے وفائی کا مقابلہ اپنے معدے سے کیا۔ تم خود دیکھ لو۔ کس رفتار سے آلو کے قتلے قاب سے پلیٹ اور پلیٹ سے پیٹ میں منتقل کر رہی ہے۔ بس اسی نے صورت سے بے صورت کر دیا۔

ہم نے ان کا وقت اور اپنی رہی سہی عزت بچانے کی خاطر ان کی اس 'تھیوری' سے جھٹ اتفاق کرلیا کہ زنانہ آوارگی کی روک تھام کے لیے عقد اور آلو سے بہتر کوئی آلہ نہیں کہ دونوں سے بدصورتی اور بدصورتی سے نیک چلنی زور پکڑتی ہے۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ہم نے کہا '' لیکن اگر آلو سے واقعی مٹاپا پیدا ہوتا ہے تو تمہارے حق میں تو اُلٹا مفید ہوگا۔ کیوں کہ اگر تمہارا وزن صحیح مان لیا جائے تو معیاری حساب سے تمہارا قد تین فٹ ہونا چاہیے۔ ایک دن تمہیں نے بتایا تھا کہ آستین کے لحاظ سے ۱۷ نمبر کی قمیض تمہیں فٹ آتی ہے اور کالر کے لحاظ سے ۱۳ نمبر! ''

کرشمے کاربوہائیڈریٹ کے

اسی سال جون میں مرزا اپنے دفتر میں اگاتا کرسٹی کا تازہ ناول پڑھتے پڑھتے اچانک بے ہوش

ہو گئے۔ ہوش آیا تو خود کو ایک آرام دہ کلینک (CLINIC) میں کمپنی کے خرچ پر صاحب فراش پایا۔ انہیں اس بات سے سخت مایوسی ہوئی کہ جس مقام پر انہیں دل کا شدید درد محسوس ہوا تھا' دل سے اس بالشت بھر دور نکلا۔ ڈاکٹر نے وہم دور کرنے کی غرض سے انگلی رکھ کر بتایا کہ دل یہاں نہیں' یہاں ہوتا ہے۔ اس کے بعد انہیں دل کا درد دل ہی میں محسوس ہونے لگا!

جیسے ہی ان کے کمرے سے ''مریض سے ملاقات منع ہے'' کی تختی ہٹی ہم زینیا کا گلدستہ لے کر عیادت کو پہنچے۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ دیکھ کر خوب روئے۔ نرس نے آکر دونوں کو چپ کرایا اور ہمیں علیحدہ لے جا کر متنبہ کیا کہ اس اسپتال میں بیمار پرسی کرنے والوں کو رونا اور کراہنا منع ہے۔ ہم نے فوراً خود پر فرمائشی بشاشت طاری کر کے مرزا کو ہراساں ہونے سے منع کیا اور تلقین کی کہ مریض کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ چاہے تو تنکے میں جان ڈال دے۔ ہماری نصیحت کا خاطر خواہ بلکہ اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔

''تم کیوں روتے ہو پگلے؟'' ہم نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یونہی خیال آ گیا کہ اگر تم مر گئے تو میری عیادت کو کون آیا کرے گا!'' مرزا نے اپنے آنسو نرس کے رومال میں محفوظ کرتے ہوئے وجہ رقت بیان کی۔

مرض کی اصل وجہ ڈاکٹروں کے نزدیک کثرت افکار تھی جسے مرزا کی زبان قادرالبیان نے کثرت کار بنا دیا۔ خیر اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ مرزا چائے کے ساتھ آلو کے ''چپس'' اڑا رہے تھے۔ ہم نے کہا ''مرزا! آج تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔'' بولے (او وایسی آواز میں بولے گویا کسی اندھے کنویں کے پیندے سے بول رہے ہیں) ''ڈاکٹر کہتے ہیں تمہارا وزن بہت کم ہے تمہیں آلو اور ایسی چیزیں خوب کھانی چاہیں جن میں 'اسٹارچ' اور کاربوہائی ڈریٹ کی افراط ہو۔ صاحب! آلو ایک نعمت ہے' کم از کم سائنس کی رو سے!'' ہم نے کہا ''تو پھر بادب آلو کھا کر ہی صحت یاب ہو جاؤ'' فرمایا ''صحت یاب تو مجھے ویسے بھی ہونا ہی پڑے گا۔ اس لیے کہ یہ نرسیں اس قدر بدصورت ہیں کہ کوئی آدمی جو اپنے منہ پہ آنکھیں رکھتا ہے' یہاں زیادہ عرصے پڑا نہیں رہ سکتا!''

وہ نئے گلے' وہ شکایتیں' وہ مزے مزے کی حکایتیں

کلینک سے نکلتے ہی مرزا نے اپنی توپوں کا رُخ پھیر دیا۔ خوگر ہجو کے شب و روز اب آلو کی تعریف و توصیف میں بسر ہونے لگے۔ ایک وقت تھا کہ ویت نام پر امریکی بمباری کی خبریں پڑھ کر مرزا پچھتاوا کرتے کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کر کے بڑی نادانی کی۔ مگر اب پیار میں آتے تو آلو کی گدرائی ہوئی گولائیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے ''صاحب! کولمبس جہنم میں نہیں جائے گا۔

اُسے واپس امریکہ بھیج دیا جائے گا! مہذب دنیا پر امریکہ کے دو احسان ہیں: تمباکو اور آلو۔ سو تمباکو کا بیڑا تو سرطان نے غرق کر دیا۔ مگر آلو کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ جو ملک جتنا غربت زدہ ہوگا' اتنا ہی آلو اور مذہب کا چلن زیادہ ہوگا۔''

اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حریف ظریف سائنسی ہتھیاروں سے زیر نہیں ہوا تو شاعری کی مار سے وہیں ڈھیر کر دیتے۔ ''صاحب! جوں جوں وقت گزرتا ہے یادداشت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ پہلے اپنی پیدائش کا دن ذہن سے اترا۔ پر مہینہ۔ اور اب تو سنہ بھی یاد نہیں رہتا۔ بیگم یا کسی بدخواہ سے پوچھنا پڑتا ہے۔ اکثر تمہارے لطیفے تمہیں ہی سنانے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ تو جب تم پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگتے ہو تو شک گزرتا ہے کہ لطیفہ تمہارا ہی ہوگا۔ بیگم اکثر کہتی ہیں کہ کاک ٹیل پارٹیوں اور ڈانس میں تمہیں یہ تک یاد نہیں رہتا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے! غرض کہ حافظہ بالکل چوپٹ ہے۔ اب یہ آلو کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ آج بھی کسی بچے کے ہاتھ میں بھوبل میں سنکا ہوا آلو نظر آجائے تو اس کی مانوس مہک سے بچپن کا ایک ایک واقعہ ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ میں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتا ہوں۔ اس سے پھوٹتی ہوئی سوندھی بھاپ کے پرے ایک بھولی بسری صورت ابھرتی ہے۔ گرد آلود بالوں کے پیچھے شرارت سے روشن آنکھیں۔ کرتا بٹنوں سے بے نیاز۔ گلے میں غلیل۔ ناخن دانتوں سے کترے ہوئے پتنگ اڑانے والی انگلی پر ڈور کی خون آلود لکیر۔ بیری سے ہولے ہولے اپنی کینچلیاں اتارتا چلا جاتا ہے۔ اور میں ننگے پاؤں تتلیوں کے پیچھے دوڑتا' رنگ برنگے بادلوں میں ریز گاری کے پہاڑ' پریوں اور آگ اُگلتے اژدہوں کو بنتے بگڑتے دیکھتا...... کھڑا رہ جاتا ہوں.............''

''یہاں تک کہ آلو ختم ہو جاتا ہے''! ہم نے صابن کے بلبلے پر پھونک ماری۔

سنبھلے۔ گردشِ ایام کو اپنے بچپن کے پیچھے دوڑاتے دوڑاتے لگام کھینچی۔ اور گالی دینے کے لیے گلا صاف کرتے ہوئے فرمایا''...... خدا جانے حکومت آلو کو بزور قانون قومی غذا بنانے سے کیوں ڈرتی ہے۔ سستا اتنا کہ آج تک کسی سیٹھ کو اس میں ملاوٹ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ 'اسکنڈل' کی طرح لذیذ اور زود ہضم! وٹامن سے بھرپور' خوش ذائقہ' صوفیانہ رنگ' چھلکا زنانہ لباس کی طرح۔ یعنی برائے نام!

صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو''

دستِ خود دہانِ خود

مرزا پر اب یہ جھک سوار تھی کہ اگر صندل کا گھسنا اور لگانا دردِ سر کے لیے مفید ہے تو اسے اُگانا کہیں زیادہ مفید ہونا چاہیے۔ حکمت و زراعت کی جن پرخار راہوں کو مستانہ طے کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے ان کا اعادہ کیا جائے تو طب پر ایک پوری کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ از بسکہ ہم حکیموں کی لگی لگائی روزی پہ ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے' اس لیے دو تین چنگاریاں چھوڑ کر دور کھڑے ہو جائیں گے۔

ایک دن ہم سے پوچھا ''بچپن میں کھٹ مٹھے بیر' میرا مطلب ہے جھر بیری کے بیر کھائے ہیں؟''
عرض کیا ''جی ہاں! ہزار دفعہ۔ اور اتنی ہی دفعہ کھانسی میں مبتلا ہوا ہوں۔'' فرمایا ''بس یہی فرق ہے'
خرید کے کھانے میں اور اپنے ہاتھ سے توڑ کے کھانے میں۔ تجربے کی بات بتاتا ہوں۔ بیر توڑتے
وقت انگلی میں کانٹا لگ جائے اور خون کی بوند پور پر تھرتھرانے لگے تو آس پاس کی جھاڑیوں کے تمام
بیر میٹھے ہو جاتے ہیں!''

''سائنٹفک دماغ میں یہ بات نہیں آتی'' ہم نے کہا۔

ہمارا یہ کہنا تھا کہ زیادہ اُبلے ہوئے آلو کی طرح تڑختے بکھرتے چلے گئے کہنے لگے'' صاحب!
بعضے حکیم یہ کرتے ہیں کہ جس کا معدہ کمزور ہو اُسے اوجھڑی کھلاتے ہیں۔ جس کے گردوں کا فعل
درست نہ ہو اسے گردے۔ اور جو ضعف جگر میں مبتلا ہو اسے کلیجی۔ اگر میں حکیم ہوتا تو تمہیں مغز ہی
مغز کھلاتا!''

راقم الحروف کے عضو ضعیف کی نشاندہی کرنے کے بعد ارشاد ہوا ''اب آلو خود کاشت کرنے کی
سائنٹفک وجہ بھی سن لو۔ پچھلے سال اترتی برسات کی بات ہے۔ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کالے تیتر کی
تلاش میں کچے میں بہت دور نکل گیا۔ مگر ایک تیتر نظر نہ آیا' جس کی وجہ'' گائیڈ'' نے یہ بتائی کہ شکار
کے لیے آپ کے پاس ڈپٹی کنسٹر کا پرمٹ نہیں ہے۔ واپسی میں رات ہوگئی اور ہماری ۱۹۴۵ ماڈل
جیپ پر دمے کا دورہ پڑا۔ چند لمحوں بعد وہ ضعیفہ تو ایک گڑھے میں آخری ہچکی لے کر خاموش ہوگئی مگر
اپنے قفس عنصری میں ہمارے طائر روح کو پرواز کرتا چھوڑ گئی۔ ہم اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے دل ہی دل
میں خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ رحمت ایزدی سے جیپ گڑھے میں گری' ورنہ گڑھے کی جگہ کنواں
ہوتا تو اس وقت خدا کا شکر کون ادا کرتا؟ نہ کبھی جنازہ اٹھتا' نہ کہیں مزار ہوتا! ہمارے قرض خواہوں پر
کیا گزرتی؟ ہمارے ساتھ رقم کے ڈوبنے پر انہیں کیسے صبر آتا کہ ابھی تو ہمارے تمسک کی روشنائی بھی
خشک نہیں ہوتی تھی؟ ہم ابھی ان کے اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیر ہی
رہے تھے کہ ایک کسان بکری کا نوزائیدہ بچہ گردن پر مفلر کی طرح ڈالے ادھر سے گزرا۔ ہم نے آواز
دے کر بلایا۔ ابھی ہم اتنی ہی تمہید باندھنے پائے تھے کہ ہم کراچی سے آئے ہیں اور کالے تیتر کی
تلاش میں تھے کہ وہ گڑھے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تیتر پانی میں نہیں
رہتے۔ ہمارے گائیڈ نے ہماری فوری ضروریات کی ترجمانی کی تو وہ ایسا پسیجا کہ اپنی بیل گاڑی لانے
اور اسے جیپ میں جوت کر اپنے گھر لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اور بھی بلا معاوضہ!
صاحب! اندھا کیا چاہے؟......''

''دو آنکھیں!'' ہم نے جھٹ لقمہ دیا۔

''غلط! بالکل غلط! اگر اس کی عقل بھی بینائی کے ساتھ زائل نہیں ہوئی ہے تو اندھا دو آنکھیں نہیں چاہتا' ایک لاٹھی چاہتا ہے!'' مرزا نے محاورے کی بھی اصلاح فرمادی۔

ہم ہونکا ابھرتے رہے' کہانی جاری رہی ''تھوڑی دیر بعد وہ بیل گاڑی لے آیا جس کے بیل اپنی جوانی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ادوان کی رسی سے جیپ باندھتے ہوئے اس نے ہمیں بیل گاڑی میں اپنے پہلو میں اگلی سیٹ کی پیش کش کی۔ اور ڈیڑھ دو میل دور کسی موہوم نقطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تسلی دینے لگا:

''اوجیڑی نویں لالٹین بلدی پئی اے نا' اوہی میرا گھاروے'' ☆

گھر پہنچتے ہی اس نے اپنی پگڑی اتار کر چارپائی کے سیروے والے پائے کو پہنادی۔ منہ پر پانی کے چھپکے دیے اور گیلے ہاتھ سفید بکری کی پیٹھ سے پونچھے۔ برسات کی چاندنی میں اس کے کرتے پر بڑا سا پیوند دور سے نظر آرہا تھا۔ اور جب تھونی پر لٹکی ہوئی نئی لالٹین کی لو بھڑکی تو اس پیوند میں لگا ہوا ایک اور پیوند بھی نظر آنے لگا جس کے ٹانکے ابھی اس کی مسکراہٹ کی طرح اُجلے تھے۔ اس کی گھر والی نے کھری چارپائی پر کھانا چن کر ٹھنڈے میٹھے پانی کے دو ردھات کے گلاس پٹی پر بان چھدرا کر کے جمادیے۔ میزبان کی شدید اصرار اور بھوک کے شدید تر تقاضے سے مجبور ہو کر جو ہم نے خشک چنائی شروع کی ہے تو یقین مانو پیٹ بھر گیا مگر جی نہیں بھرا۔ رال نگلتے ہوئے ہم نے پوچھا' چودھری! اس سے مزے دار آلو کا ساگ ہم نے آج تک ہیں کھایا۔ کیا ترکیب ہے پکانے کی؟

بولا' بادشاہو! پہلے تے اک کلے زمین وچ پنج من امریکہ دی کھاد پاؤ۔ فیر............ ☆

قصہ آلو کی کاشت کا

بات اگر اب بھی گلے سے نہیں اُتری تو ''خود اگاؤ' خود کھا'' سلسلے کے تیسری داستان سینئے جس کا عذاب ثواب مرزا کی گردن پر ہے کہ وہی اس کے فردوسی ہیں اور وہی رستم۔ داستان کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''صاحب! بازار سے سڑے بسے آلو خرید کر کھانے سے تو یہ بہتر ہے کہ آدمی چنے بھسکتا پھرے۔ پرسوں شام ہم خود آلو خریدنے گئے۔ شبراتی کی دکان سے۔ ارے صاحب! وہی اپنا شبراتی جس نے چودہ پندرہ سال سے وہ سائن بورڈ لگا رکھا ہے:

مالک ایں دکان شبراتی مہاجرین

☆ وہ جہاں نئی لالٹین جل رہی ہے نا۔ وہی میرا گھر ہے۔

☆ پہلے ایک ایکڑ زمین میں پانچ من امریکی کھاد ڈالو پھر............

(اُس زمانے میں کیمیائی کھاد امریکہ سے آتی تھی۔)

(گر کوئی دعویٰ کند باطل شود)

بمقام موضع کاٹھ، عقب جامع مسجد کلاں

پوسٹ آفس قصبہ باغپت، ضلع میرٹھ۔

حال مقیم کراچی۔

ہم نے ایک آلو دکھاتے ہوئے کہا "میاں شبراتی! حال مقیم کرانچی! تمہارے آلو تو پلپلے ہیں۔ خراب لگتے ہیں۔" بولا" باؤجی! خراب نکلیں تو کالا ناگ (اُس کے گدھے کا نام) کے موت سے مونچھ منڈوا دینا۔ درحقیقت میں یہ پہاڑی آلو ہیں۔" ہم نے کہا" ہمیں تو کراچی سے پانچ سو میل تک کوئی پہاڑ نقشے میں نظر نہیں آتا" بولا" باؤجی! تمہاری نشتے میں اور کون سی پھل پھلاری کرانچی میں نجر آوے ہے؟ یہ رپے چھٹانک کا سانچی پان جو تمہارے غلام کے کلے میں بتاشے کی طریوں گھل ریا ہے، بمقام بنگال سے آریا ہے۔ یہاں کیا دم درود رکھا ہے۔ حالیت تو یہ ہے باؤجی! کرانچی میں مٹی تلک ملیر سے آوے ہے۔ کس واسطے کہ اس میں ڈھاکہ سے منگا کے گھانس لگاویں گے۔ جوانی قسم باؤجی! پشاور کے چوک یادگا میں مرغا اذان دیوے ہے تو کہیں جا کے کرانچی والوں کی صبح انڈا نصیب ہووے ہے!"

اور ایک مرد غیرت مند نے چمن زار کراچی کے دل یعنی ہاؤسنگ سوسائٹی میں آلو کی کاشت شروع کردی۔ اگرچہ سردست پانچ من امریکی کھاد کا انتظام نہ ہو سکا، لیکن مرزا کا جوش جنوں انہیں اس مقام پر پہنچا چکا تھا، جہاں کھاد تو کھاد وہ بغیر زمین کے بھی کاشت کرنے کا جگرا رکھتے تھے!

مرزا عبدالودود بیگ اور کھیتی باڑی! ہمارا خیال ہے کہ سارا کھیت ایئر کنڈیشن کر دیا جائے اور ٹریکٹر میں ایک راکنگ چیئر (جھولا کرسی) ڈال دی جائے تو مرزا شاید دو چار گھنٹے کے لیے کاشت کاری کا پیشہ اختیار کر لیں، جس کے بارے میں ان کا مبلغ علم بس اس قدر ہے کہ انہوں نے سینما کے پردے پر کلین شیو ایکٹروں کو چھاتی پہ مصنوعی بال چپکائے' اسٹوڈیو کے سورج کی دھوپ میں سگریٹ کی پنی چڑھی ہوئی درانتیوں سے باجرے کے کھیت میں سے مکا کے بھٹے کاٹتے دیکھا ہے۔ یہاں یہ بتانا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ اس سے چند سال پیشتر مرزا باغبانی کا ایک انتہائی نادر اور اتنا ہی ناکام تجربہ کر کے ہمیں ایک مضمون کا خام مواد مہیا کر چکے تھے۔ انہیں ایک دن اپنے کوٹ کا ننگا کالر دیکھ کر دفعتہً القا ہوا کہ ہونے کو تو گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے سوائے روپے کے لیکن اگر باغ میں گلاب کے گملے نہیں تو جینا فضول ہے۔ انہیں زندگی میں اچانک ایک زبردست خلا محسوس ہونے لگا، جسے صرف امریکی کھاد سے پُر کیا جا سکتا تھا۔

اب جو آلو کی کاشت کا سودا سر میں سمایا تو ڈیڑھ دو ہفتے فقط اس موضوع پر ریسرچ ہوتی رہی کہ آلو بخارے کی طرح آلو کے بھی بیج ہوتے ہیں یا کوئٹہ کے گلاب کی طرح آلو کی بھی ٹہنی کاٹ کر صاف

ستھرے گملے میں گاڑ دی جاتی ہے۔ نیز آلو پٹ سن کی مانند گھٹنوں گھٹنوں پانی مانگتا ہے یا اخروٹ کی طرح بغیر محنت کے پشتہا پشت تک پھل دیتا رہے گا۔ دوران تحقیق ایک شق کہیں سے یہ بھی نکل آئی کہ بینگن کی طرح آلو بھی ڈال ڈال پہ لٹکیں گے یا ترئی کی بیل کی طرح پڑوسی کی دیوار پہ پڑے رہیں گے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے تو یہ شوشہ بھی اٹھایا کہ اگر رفع شر کی خاطر یہ مان لیا جائے کہ آلو واقعی زمین سے اُگتے ہیں تو ڈھل کا نشان کیسے مٹایا جاتا ہے؟

چھپا دست ہمت میں دست قضا ہے

پھر کیا تھا۔ کوئٹہ سے بذریعہ پی۔ آئی۔ اے سفید گلاب کی قلمیں منگائی گئیں۔ گملوں کو کھولتے پانی اور فنائل سے ''ڈس انفکٹ'' کیا گیا۔ پھر کوئٹہ کے نازک و نایاب گلاب کو کراچی کی دیمک اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اوباش بکری کی مینگنی کی گرم کھاد میں اتنی ہی امریکی کھاد اور امریکی کھاد میں ہموزن ڈی۔ ڈی۔ ٹی پاؤڈر ملایا گیا۔ اُبلے ہوئے پانی سے صبح و شام سینچائی کی گئی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ان گملوں میں کبھی کوئی کیڑا نظر نہیں آیا۔ اور نہ گلاب!

پروفیسر قاضی عبدالقدوس کچھ غلط تو نہیں کہتے کہ مرزا حماقت بھی کرتے ہیں تو اس قدر ''اوریجنل'' کہ بخدا بالکل لہامی معلوم ہوتی ہے!

پایان کار مرزا نے آلو کی کاشت کے لیے زمین یعنی اپنا ''لان'' (جس کی افریقی گھاس کی ہریالی ایسی تھی کہ سگرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے دل دکھتا تھا) تیار کیا۔ اس زراعتی تجربے کے دوران جہاں جہاں عقل محو تماشائے لب بام رہی' وہاں جوش نمرود بے خطر گلزار خلیل میں کود پڑا۔ دفتر کے چپراسیوں' اپنے پالتو خرگوش اور محلے کے لونڈے لاڑھیوں کی مدد سے وہی دن میں سارا لان کھود پھینکا۔ بلکہ اس کے بعد بھی یہ عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ دوسری منزل کے کرایہ داروں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کے کھدائی رکوائی' اس لیے کہ مکان کی نیو نظر آنے لگی تھی۔

کم = س + ک X موزہ

۳۲

کوئٹہ کے گلاب کی طرح آلو کو بھی کراچی کی نظر کھا گئی۔ مگر بیچ وقتہ نلائی' گوڑائی اور کھدائی سے رگ پٹھوں میں جو چستی اور طبیعت میں جو نچالی آگئی تھی' وہ اُسے آلو کی کرامات سمجھتے تھے۔ اب کی دفعہ جو لنچ پر ہمیں ہوٹل انٹر کانٹی ننٹل کے چاندنی لاونج میں لے گئے تو ہم نے دیکھا کہ بوفے میز پر سوائے ان کیمیائی تجربات کے جو یوروپین باورچیوں نے نسلاً بعد نسل آلو پر کیے تھے اور کچھ نہ تھا...... آلو مسلم' آلو دو نیم' آلو سوختہ کوفتہ' آلو چھلکے دار' آلو بریاں' آلو نیم بریاں' بلکہ کہیں کہیں بالکل عریاں!

''مرزا! یہ کیا؟''

''ٹریل بی (Busy Businessmen's Buffet)''

''یا اللہ! کراچی کے کروڑ پتی یہ کھاتے ہیں! مگر ہم نے تو انکم ٹیکس کی چوری بھی نہیں کی۔ پھر یہ سزا کیوں؟ بھوکا ہی مارنا تھا تو ہمیں گز بھر کی ٹائی بندھوا کے نو منزلیں لانگتے پھلانگتے یہاں کاہے کو لائے؟ نیچے ہی نقد پیسے دے کر رخصت کر دیتے۔''

''ہماری صحبتیں اٹھاتے ایک عمر گزری، مگر رہے جنگلی کے جنگلی! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ 'فایو اسٹار' (اعلیٰ درجہ) ہوٹلوں میں قیمت کھانے کی نہیں دی جاتی' اس رومانی فضا کی دی جاتی ہے جہاں آپ دوسرے معززین کو اپنی طرح بھوکا مرتا دیکھتے ہیں۔ بل میں جو رقم درج ہوتی ہے وہ بساندے گوشت اور اُبلے چقندر کی قیمت نہیں ہوتی۔ دراصل اس میں گھر سے بھاگنے کا جرمانہ' دوسری میزوں پر بیٹھی ہوئی خواتین کے فرنچ سینٹ لگانے کا تاوان' کھلکھلاتی ہوئی ویٹرس کے ٹوتھ پیسٹ کی قیمت بلکہ اس کا پورا نان نفقہ شامل کرنا پڑتا ہے۔ جب جا کے کہیں ایک بل بنتا ہے۔ اور جہاں تک لذت کا تعلق ہے تو صاحب! ہر شب آنگن میں اترنے والے من و سلویٰ کے مقابلے میں باہر کی پیاز کی گنٹھی مزا دے جاتی ہے۔ ورنہ دیکھا جائے تو چائے کی پیالی گھر کی انگیٹھی پر ''چراغ تلے'' جلا کر بھی بنائی جا سکتی ہے اور...... اور صاحب! دس دس روپے کے نوٹ جلا کر بھی! جیسا ہاکس بے کی ''ہٹ'' میں تمہارے اس بمبیا سیٹھ نے کیا تھا! مصری بیلی ڈانسر کی خاطر۔''

''مگر وہ تو خاصی PLUMP تھی۔''

''صاحب! مصری تو اسی چیز پر جان دیتے ہیں۔ جبھی تو شاہ فاروق فربہ اندام داشتائیں اس طرح اکٹھی کیا کرتا تھا جیسے بچے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتے ہیں!''

بحث اور ہمیں اس ڈھلوان پر لا کر مرزا نے سراپا کے اعداد ثلاثہ (مثلاً ۳۷۔۲۴۔۳۵) کی جانچ پڑتال کرنے کا خود ساختہ فارمولا پیش کیا جو بے کم و کاست نذر قارئین ہے:

نازنین کے سینے کے ناپ میں کولھوں کا ناپ جوڑو۔ میزان کو اپنے (صاف) موزے کے نمبر سے ضرب دو۔ پھر اس حاصل ضرب کو ۳۲ سے تقسیم کر دو۔ جو جواب آئے وہ کمر کا مثالی ناپ ہوگا۔ اب اگر کمر کا گھیر اس سے زیادہ نکلے تو آلو سے پرہیز لازم ہے۔ اور اگر اس سے کم ہے تو آلو کھلا کھلا کر جسم کو فارمولے کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

ہوٹل کے بل کی پشت پر انہوں نے بال پائنٹ قلم سے مارلن منرو' جینا لولو بریجیڈا' الزبتھ ٹیلر' صوفیہ لارین اور چیدہ چیدہ پری پیکروں کو ایک ایک کر کے اپنے گیارہ نمبر کے موزے میں ایسا اتارا کہ ہم بھونچکے رہ گئے۔ اس میں آپ کو جھوٹ یا عبارت آرائی کا ذرا بھی شائبہ نظر آئے تو دو چار مشقی سوال نکال کر آپ بھی اپنی جان پہچان کے حسینوں کا امتحان کر لیجیے۔ ہم تو اسے ملکہ وکٹوریہ کے بت'

کوکا کولا کی بوتل اور خود پر آزما کر اپنا اطمینان کر چکے ہیں۔

......اس کی شبوں کا گداز

ہمیں ڈیڑھ مہینے کے لیے کام سے ڈھاکہ جانا پڑا اور مرزا سے ملاقاتوں کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔ خط و کتابت کا مرزا کو دماغ نہیں۔ جیسے ہی ہم واپس آئے انناس اور منشی گنج کے کیلوں سے لدے پھندے مرزا کے ہاں پہنچے۔ ہم نے کہا ''السلام علیکم!'' جواب ملا ''پھل اندر پہنچوادو۔ وعلیکم السلام!'' غور سے ان کی صورت دیکھی تو دل پہ چوٹ سی لگی۔

''یہ کیا حال بنالیا تم نے؟''

''ہمیں جی بھر کے دیکھ لو۔ پھر اس صورت کو ترسو گے۔ اشتہا ختم۔ دواؤں پر گزارا ہے۔ دن بھر میں تین انگور کھا پاتا ہوں۔ وہ بھی چھلکا اتار کے۔ کھانے کے نام سے ہول اٹھتا ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہر وقت ایک بیکلی سی رہتی ہے۔ ہر چہرہ اُداس اداس' ہر شے دھواں دھواں ۔ یہ ہونکتا سناٹا' یہ چیت کی اُداس چاندنی' یہ......''

''مرزا! ہم تمہیں رومینٹک ہونے سے روک تو نہیں سکتے لیکن یہ مہینے چیت کا نہیں ہے۔''

''چیت نہ سہی' چیت جیسا ضرور ہے' ظالم۔ تم تو ایک ہندولڑکی سے دل بھی لگا چکے ہو۔ تمہیں بتاؤ یہ کون سے مہینے کا چاند ہے؟'' مرزا نے سوال کیا۔

''اسی مہینے کا معلوم ہوتا ہے'' ہم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمیں بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ صاحب! عجیب عالم ہے۔ کام میں ذرا جی نہیں لگتا۔ اور بیکاری سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ ذہن پراگندہ بلکہ سچ پوچھو تو محض گندہ۔ تاروں بھرا آسمان کے نیچے رات رات بھر آنکھیں پھاڑے تمہاری حماقتیں گنتا رہتا ہوں۔ تنہائی سے دل گھبراتا ہے۔ اور لوگوں سے ملتا ہوں تو جی چاہتا ہے منہ نوچ لوں اور صاحب!

ایک دو کا ذکر کیا' سارے کے سارے نوچ لوں

''مرزا! ہو نہ ہو' یہ عشق کے آثار ہیں!''

''بجا۔ لیکن اگر صاحب معاملہ پر چالیس مہاوٹیں پڑ چکی ہوں' تو یہ آثار عشق کے نہیں' 'السر' کے ہیں۔ کھانا کھاتے ہی محسوس ہوتا ہے گویا کسی نے حلق سے لے کر معدے تک تیزاب کی پھریری پھیر دی ہے۔ اِدھر کھایا' اُدھر پیٹ پھول کر مشکیزہ ہوا ہنسی کا رُخ بھی اندر کی طرف ہوگیا ہے۔ سارا فتور آلو کا ہے۔ معدے میں 'ایسڈ' بہت بننے لگا ہے۔ 'پیپٹک السر' ہوگیا ہے۔'' ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

''اس میں ہراساں ہونے کی کیا بات ہے۔ آج کل کسی کو 'ہارٹ اٹیک' یا 'السر' نہ ہو تو لوگ اس پر ترس کھانے لگتے ہیں کہ شاید بیچارہ کسی ذمہ دار عہدے پر فائز نہیں ہے! مگر تم تو ملازمت کو جوتے کی

نوک پر رکھتے ہو۔ اپنے 'باس' سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بات کرتے ہو۔ پھر یہ کیسے ہوا؟ وقت پر سوتے ہو۔ وقت کے بعد اٹھتے ہو۔ دادا کے وقتوں کی چاندی کی پتیلی میں اُبالے بغیر پانی نہیں پیتے۔ وضو بھی پانی میں 'لسٹرین' ملا کر کرتے ہو' جس میں ۲۶ فی صد الکحل ہوتا ہے۔ حالاتِ حاضرہ سے خود کو بے خبر رکھتے ہو۔ باتوں کے علاوہ کسی چیز میں ترشی کو روا نہیں رکھتے۔ تیل بھی تم نہیں کھاتے۔ دس سال سے تو ہم خود دیکھ رہے ہیں، منٹگمری کا خالص دانے دار گھی کھا رہے ہو۔'' ہم نے کہا۔

''تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ یہ سب اسی منحوس کا فتور ہے۔ اب کی دفعہ جو سونے کے کشتہ سے زیادہ طاقت بخش گھی' کا سربمہر کنستر اپنے ہاتھ سے انگیٹھی پر تپایا تو معلوم ہے تہ میں کیا نکلا؟ تین تین اُنگل آلو کی دانے دار لگدی! جبھی تو میں کہوں کہ میرا بنیان تو تنگ ہو گیا' مگر وزن کیوں نہیں بڑھ رہا!'' مرزا نے آخر اپنے دس سالہ مرض کی پکڑلی' جو ضلع منٹگمری تک پھیلی ہوئی تھی۔

کیا اسیری ہے' کیا رہائی ہے

پہلے مرزا کو درد کی ذرا برداشت نہیں تھی۔ ہمارے سامنے کی بات ہے' پہلی دفعہ پیٹ میں درد ہوا تو ڈاکٹر نے مارفیا کا انجکشن تیار کیا۔ مگر مرزا نے گھگھیا کر منتیں کیں کہ انہیں پہلے کلوروفارم سنگھا دیا جائے تاکہ انجکشن کی تکلیف محسوس نہ ہو! لیکن اب اپنی بیماری پر اس طرح اترانے لگے تھے جیسے اکثر اوچھے اپنی تندرسی پر اکڑتے ہیں۔ ہمیں ان کی بیماری سے اتنی تشویش نہیں ہوتی جتنی اس بات سے کہ انہیں اپنے ہی نہیں پرائے مرض میں بھی اتنی ہی لذت محسوس ہونے لگی تھی۔ بھانت بھانت کی بیماریوں میں مبتلا مریضوں سے اس طرح کرید کرید کر متعدی تفصیلات پوچھتے کہ رات تک ان کے سارے مرض اپنا لیتے۔ اس حد تک کہ بخار کسی کو چڑھتا' سرسامی باتیں وہ کرتے۔ اس ہمدردانہ طرزِ عیادت سے مرزا نے خود کو زچگی کے سوا ہر قسم کی تکلیف میں مبتلا کر لیا۔ گھر یا دفتر کی قید نہیں' نہ اپنے بیگانے کی تخصیص' ہر ملاقاتی کو اپنی آنتوں کے ناقص فعل سے آگاہ کرتے اور اس سیماب صفت ریاحی درد کا لفظی گراف بناتے جو مصافحہ کرتے وقت نفخ وقراقر کا محرک تھا۔ پھر دائیں آنکھ کے پپوٹے میں ''کرنٹ'' مارتا متورم جگر کو چھیدتا ٹلی ہوئی ناف کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ پچھلے پہرا چانک پلٹا اور پلٹ کر دل میں بُرے بُرے خیال پیدا کرنے لگا۔ اور پھر مرزا ر ہر برے خیال کو اس طرح کھول کر بیان کرتے کہ

> میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جن لوگوں نے مرزا کو پہلے نہیں دیکھا تھا وہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ یہ مرد بیمار جو فائلوں پر سر جھکائے' السر کی تپک مٹانے کے لیے ہر دوسرے گھنٹے ایک گلاس دودھ منہ بنا کر پی لیتا ہے۔ یہ چار مہینے قبل کوفتے میں ہری مرچ بھروا کر کھاتا تھا اور اس سے بھی جی نہیں بھرتا تو شام کو یہی کوفتہ ہری

مرچ میں بھروا دیتا تھا۔ یہ نیم جاں جو بے مرچ مسالے کے راتب کو ''انگلش فوڈ'' کہہ کر صبر و شکر کے ساتھ کھا رہا ہے۔ یہ وہی چٹورا ہے جو چار مہینے پہلے یہ بتا سکتا تھا کہ صبح سات بجے سے لے کر رات کے نو بجے تک کراچی میں کس ''سویٹ میٹ مرچنٹ'' کی کڑھائی سے اترتی گرم جلیبی مل سکتی ہے۔ ہاوسنگ سوسائٹی کے کون سے چینی ریستوراں میں تلے ہوئے جھینگے کھانے چاہیں جن کا چوگنا بل بناتے وقت مالک ریستوراں کی بیٹی اس طرح مسکراتی ہے کہ بخدا روپیہ ہاتھ کا میل معلوم ہوتا ہے۔ انہیں نہ صرف یہ پتہ تھا کہ لاہور میں زیورات کی کون سی دکان میں نہایت سبک ''ہیرا تراش'' کلائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ مزنگ میں تکا کباب کی وہ کون سی دکان ہے جس کا ہیڈ آفس گوجرانوالہ میں ہے اور یہ بھی کہ کڑکڑاتے جاڑوں میں رات کے دو بجے لال کرتی کی کس پان کی دکان پر پنڈی کے من چلے طرح طرح کے پانوں سے زیادہ ان کے رسیلے ناموں کے مزے لوٹنے آتے ہیں۔ قصہ خوانی کے کس مچھیل حلوائی کی دکان سے کالی گلاب جامن اور ناظم آباد کی کون سی چورنگی کے قریب گلاب میں بسا ہوا قلاقند قرض پر مل سکتا ہے۔ ☆ (اطلاعاً عرض ہے کہ مرزا نقد پیسے دے کر مٹھائی خریدنا فضول خرچی سمجھتے ہیں) بھلا کوئی کیسے یقین کر لیتا کہ یہ آلو اور ''کاربوہائیڈریٹ'' کا شکار وہی ہے جس نے کل تک من بھاتے کھانوں کے کیسے کیسے البیلے جوڑے بنا رکھے تھے...... کھڑے مسالے کے پسندے اور بیسنی روٹی' قیمہ بھرے کریلے اور گھی میں ترتراتے پراٹھے' مدراسی بریانی اور پارسی کوفتے (وہ بھی ایک لکھنوی پڑوسن کے ہاتھ کے) چپڑی روٹی اور اُردکی پھریری دال' بھنڈی اور ..... بھنڈی! (بھنڈی کے ساتھ مرزا کسی اور چیز کو شامل کرنے کے روادار نہیں)

مرزا کو کھانے کا ایسا ہوکا ہے کہ ایک منہ انہیں ہمیشہ ناکافی معلوم ہوتا ہے!

ان کے ندیدے پن کو دیکھ کر ایک دفعہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے کہا تھا ''مرزا! تمہارا حال گرگٹ جیسا ہے۔ اس کی زبان کی لمبائی اس کے جسم کی آدھی ہوتی ہے!'' مرزا کی اُداس آنکھیں ایک دم مسکرا اٹھیں۔ کہنے لگے ''صاحب! خدا نے ایک پارۂ گوشت کو جانے کس لذت سے ہمکنار کردیا۔ اگر سارا بدن اس لذت سے آشنا ہو جاتا تو انسان اس کی تاب نہ لاتا۔ زمین کی چھاتی پھٹ جاتی!''

مرزا پانچ چھ ہفتے میں پلنگ کو لات مار کر کھڑے ہو گئے۔ ہم تو اسے اُن کی قوت ارادی کی کرامات ہی کہیں گے حالانکہ وہ خود کچھ اور وجہ بتاتے تھے۔ ایک دن اُن کے معدے سے خون کٹ کٹ کر آنے لگا۔ ہمیں چشم پر آب دیکھا تو ڈھارس دینے لگے ''میں مسلمان ہوں۔ جنت کا بھی قائل ہوں۔ مگر مجھے وہاں جانے کی جلدی نہیں ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مگر میں ابھی مر نہیں سکتا۔ میں ابھی مرنا نہیں

☆ یہ مفید مطلب معلومات مرزا کے ملک گیر چٹورپن کا نچوڑ ہیں۔ انہوں نے ساری عمر اور یہ کیا ہی کیا ہے۔ اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودی ہے۔

چاہتا۔ اس لیے کہ اول تو تم میری موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکو گے۔ دوم' میں پہلے مر گیا تو تم مجھ پر مضمون لکھ دو گے!" خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ خوف خاکہ سے صحت یاب ہوئے یا بقول شخصے مرغی کے غسل میت کے پانی سے جسے وہ چکن سوپ کہہ کر نوش جان فرما رہے تھے۔ بہر حال' بیماری جیسے آئی تھی' اُسی طرح چلی گئی۔ فائدہ یہ ہوا کہ آلو سے جو بیزاری پہلے بلا وجہ تھی' اب اس کی نہایت معقول وجہ ہاتھ آ گئی۔ اور یہ سراسر مرزا کی اخلاقی فتح تھی۔

مرض الحمد للہ دور ہو چکا تھا۔ پرہیز البتہ جاری تھا۔ وہ اس طرح کہ پہلے مرزا دوپہر کے کھانے کے بعد آدھ سیر جلیبی اکیلے کھا جاتے تھے۔ لیکن اب ڈاکٹروں نے میٹھا بند کر دیا تھا۔ لہٰذا آدھ سیر امرتی پر اکتفا کرتے تھے۔

آلو کا منہ کالا' بھنڈی کا بول بالا

جیسے ہی مرزا کی صحت اور طبیعت معمول پر آئی' بغدادی جم خانہ میں یار لوگوں نے شایانِ شان پیمانے پر غسل صحت کے جشن کا اہتمام یا۔ استقبالیہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ گھسے پٹے ڈنر ڈانس کے بجائے فینسی ڈریس بال کا اہتمام کیا جائے تاکہ ایک دوسرے پر ہنسنے کا موقع ملے۔ مہمان خصوصی تک یہ بھنک پہنچی تو انہوں نے ہماری زبانی کہلا بھیجا کے نئے مضحکہ خیز لباس سلوانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ممبران اور ان کی بیگمات اگر ایمانداری سے وہی کپڑے پہنے پہنے جم خانہ چلے آئیں' جو وہ عموماً گھر میں پہنے بیٹھے رہتے ہیں تو منشاء پورا ہو جائے گا۔ رقص کے لیے البتہ ایک کڑی شرط مرزا نے یہ لگا دی کہ ہر ممبر صرف اپنی بیوی کے ساتھ رقص کرے گا' مگر اس لپک اور ہمک سے گویا وہ اس کی بیوی نہیں ہے! جشن کی رات جم خانہ کو جھنڈیوں اور بھنڈیوں سے دلہن بنایا گیا۔ سات کورس کے ڈنر سے پہلے روئی اور کاغذ سے بنے ہوئے ایک قد آدم آلو کی ارتھی نکالی گئی' جس پر مرزا نے اپنے ہاتھ سے برانڈی چھڑک کر ماچس دکھائی اور سرگباشی کے "ڈمپل" پر گاف کلب مار کر یا کرم کیا۔ ڈنر کے بعد مرزا پر ٹائلٹ پیپر کے پھول برسائے گئے اور کچی کچی بھنڈیوں میں تولا گیا جن پر ابھی ٹھیک سے سنہری رواں بھی نہیں نکلا تھا۔ پھر یہ بھنڈیاں مستحقین یعنی معدے کے لکھ پتی مریضوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ شمپین سے مہکتے ہوئے ہال روم میں غبارے چھوڑے گئے۔ خالی بوتلوں کی قیمت کا عطیہ ایک یتیم خانے کو دینے کا اعلان کیا گیا۔ اور غسل صحت کی خوشی میں کارڈ روم والوں نے وجئے کے اگلے پچھلے سارے قرضے معاف کر دیے۔

مرزا بات بے بات مسکرا رہے تھے۔ تیسرا رقص ختم ہوتے ہی ہم اپنی کہنیوں سے راستہ بناتے ہوئے ان تک پہنچے۔ وہ اس لمحے ایک بڑے غبارے میں جلتے ہوئے سگرٹ سے سوراخ کرنے چلے تھے کہ ہم نے اس کا ذکر چھیڑ دیا جس کی جناب میں کل تک گستاخی فرشتہ پسند نہ تھا۔ "مرزا! آلو اگر

اتنا ہی مضر ہے تو انگلینڈ میں اس قدر مقبول کیوں ہے؟ ایک انگریز اوسطاً دس اونس آلو یومیہ کھا جاتا ہے۔ یعنی سال میں ساڑھے پانچ من! سن رہے ہو، ساڑھے پانچ من!'' بولے ''صاحب! انگریز کی کیا بات ہے! اس کی مفلسی سے بھی ایک شان ٹپکتی ہے۔ وہ پٹتا بھی ہے تو ایک ہیکڑی کے ساتھ! لن یوتانگ نے کہیں لکھا ہے کہ ہم چینیوں کے بارے میں لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ قحط پڑتا ہے تو ہم اپنے بچے تک کھا جاتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم انہیں اس طرح نہیں کھاتے جس طرح انگریز بیف کھاتے ہیں یعنی کچا!'' ہم بھی جواباً کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ایک نکیلی ایڑی جو ایک حسین بوجھ سہارے ہوئے تھی، ہمارے پنجے میں برمے کی طرح اترتی چلی گئی۔ ہماری مردانہ چیخ ڈانس فلور

FOR HE IS A JOLLY GOOG FELLOW

کے کورس میں دب گئی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کا برمی ساگوان کا ڈانس فلور بہکے بہکے قدموں تلے پھر چرچرانے لگا۔

(۱۹۶۵ـ۱۹۶۸)

☆☆☆

سبق یہ تھا پہلا کتاب ربا کا

تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

کراچی میں سردی اتنی ہی پڑتی ہے جتنی مری میں گرمی۔ اس سے ساکنانِ کوہ مری کی دل آزادی نہیں بلکہ عروس البلاد کراچی کی دلداری مقصود ہے۔ کبھی کبھار شہر خوباں کا درجہ حرارت جسم کے نارمل درجہ حرارت یعنی ۹۸،۴ سے دو تین ڈگری نیچے پھسل جائے تو خوبان شہر لحاف اوڑھ کر ایئر کنڈیشنر تیز کر دیتے ہیں۔ حسن خود بین و خود آرا جب ۴۳ نمبر کے مشمولات کا ۳۴ نمبر کے سوئٹر میں خلاصہ کر کے آئینہ دیکھتا ہے تو حیا کی سرخی رخساروں پر دوڑ جاتی ہے جسے موسم سرما کے خون صالح پر محمول کیا جاتا ہے۔ اس حسن تضاد کو کراچی کے محکمہ موسمیات کی اصطلاح میں ''کولڈ ویو'' (سردی کی لہر) کہتے ہیں۔ یہ خوبی صرف کراچی کے متلون موسم میں دیکھی کہ گھر سے جو لباس بھی پہن کر نکلو' دو گھنٹے بعد غلط معلوم ہوتا ہے۔ لوگ جب اخبار میں لاہور اور پنڈی کی سردی کی شدید خبریں پڑھتے ہیں تو ان سے بچاؤ کے لیے بالو کی بھنی مونگ پھلی اور گزک کے پھنکے مارتے ہیں۔ ان کے بچے بھی انہیں پر پڑے ہیں۔ بادشمال اور گوشمالی سے بچنے کے لیے ادنی کنٹوپ پہن کر آئس کریم کھاتے اور بڑوں کے سامنے بتیسی بجاتے ہیں۔ کراچی میں پنڈی سے تین لحاف کم سردی پڑتی ہے۔ نو وارد حیران ہوتا ہے کہ اگر یہ جاڑا ہے تو اللہ جانے گرمی کیسی ہوتی ہوگی۔ بیس سال سرد و گرم جھیلنے کے بعد ہمیں اب معلوم ہوا کہ کراچی کے جڑے اور گرمی میں تو اتنا واضح فرق ہے کہ بچہ بھی بتا سکتا ہے۔ ۹۰ ڈگری ٹمپریچر اگر مئی میں ہو تو یہ موسم گرما کی علامت ہے۔ اگر دسمبر میں ہو تو ظاہر ہے کہ جاڑا پڑ رہا ہے۔ البتہ جولائی میں ۹۰ ڈگری ٹمپریچر ہو اور شام کو گرج چمک کے ساتھ بیوی برس پڑے تو برسات کا موسم کہلاتا ہے۔ غالباً کیا یقیناً ایسے ہی کسی نیم گرم' کنکنے کراچوی جاڑے سے اُکتا کر نظیر اکبر آبادی نے تمنا کی تھی:

ہر چار طرف سے سردی ہو اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا
اور تن میں نیمہ شبنم کا' ہو جس میں خس کا عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا' اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا
ہاتھوں میں پیالہ شربت کا' ہو آگے اک فراش کھڑا
فراش بھی پنکھا جھلتا ہو' تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

تین چار برس بعد دو تین دن کے لیے سردی کا موسم آجائے تو اہل کراچی اس کا الزام ''کوئٹہ ونڈ'' پر دھرتے ہیں اور کوئٹہ کی سردی کی شدت کو کسی سیم تن کے ستر نما سوئٹر سے ناپتے ہیں۔ کراچی کی سردی بیوہ کی جوانی کی طرح ہوتی ہے۔ ہر ایک کی نظر پڑتی ہے اور وہیں ٹھہر بلکہ ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ اُدھر کوئٹہ میں جب دستانے، کمبل، مفلر اور سمور کے انبار میں سے صرف چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جائے کہ ان کے جنوب میں مونچھ ہے یا پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے، تو کوئٹہ والے اس کھلے کا ذمہ دار قندھاری ہوا کو ٹھیراتے ہیں اور جب قندھار میں سائبیریا کی زمہریری ہواؤں سے درختوں پر اناروں کی بجائے برف کے لڈو لٹکتے ہیں، گوالے گائے کے تھنوں سے آئس کریم دوہتے ہیں اور سردی سے تھر تھر کانپتے ہوئے انسان کے دل میں خود کو واصل جہنم کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے تو اہالیان قندھار کمبل سے چمٹ کر ہمسایہ ملک کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ چھوٹے ملکوں کے موسم بھی تو اپنے نہیں ہوتے۔ ہوائیں اور طوفان بھی دوسرے ملکوں سے آتے ہیں۔ زلزلوں کا مرکز بھی سرحد پار ہوتا ہے۔

یہ جنوری ۱۹۵۰ء کی ایک ایسی ہی صبح کا ذکر ہے۔ موسمی کیفیت ہم نے قدرے تفصیل و تنقیص کے ساتھ اس لیے بیان کی کہ کراچی میں یہ ہماری پہلی صبح تھی۔ گوارا حد تک گرم ہونے کے علاوہ یہ ایک تاریخ ساز صبح بھی تھی۔ زمستان کی اس صبح بینکاری کے پیشے سے ہمارے طویل ''فلرٹیشن'' کا آغاز ہوا۔ اور صبح اس وقت نہیں ہوتی جب سورج نکلتا ہے۔ صبح اس وقت ہوت ہے جب آدمی جاگ اُٹھے۔ کسی نے ایک دن فرانس کے شہرہ آفاق ادیب پروست سے پوچھا کہ دنیا کی عسکری تاریخ میں کس واقعہ نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا تو اس نے بلا تامل جواب دیا، فوج میں میری بھرتی۔

ہمارے فلرٹیشن کا آغاز

کراچی میں براہ کھوکھرا پار وارد ہوئے ہمیں ۲۰ گھنٹے ہوئے تھے۔ وہ صبح نہیں بھولے گی جب ریلوے لائن کے کنارے ایک چھوٹی سی سفید چمکتی تختی پر پہلے پہل ''پاکستان'' لکھا نظر آیا تو اُسے ہاتھ سے چھو چھو کر دیکھا تھا۔ پھر مٹی اٹھا کر دیکھی۔ اسلام علیکم کہتے ہوئے سندھی ساربان دیکھے۔ ہندوستان کے نوٹ پر پہلی دفعہ حکومت پاکستان چھپا ہوا دیکھا۔ اور پھر ریگزار راجستھان میں پرکھوں کی قبریں، وہ بولی جو ماں کے دودھ کے ساتھ وجود میں رچی بسی تھی اور اپنے پیاروں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے، خیرگی امروز میں دھندلاتے چلے گئے۔

مری بار کیوں دیر اتنی کری

منا باؤ کے اجاڑ اسٹیشن پر دو راتیں تاروں بھرے آسمان کے نیچے گزارنے سے گلا خراب ہو گیا تھا اور محسوس ہوتا تھا گویا حلق میں کوئی بدچلن مینڈک پھنس گیا ہے۔ ذرا منہ کھولتے تو ٹرانے لگتا۔ میکلوڈ

روڈ پر بینک کا ہیڈ آفس تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ہم نے ایک چھپی ہوئی پرچی پر اپنا نام لکھ کر جنرل منیجر مسٹر ڈبلو۔ جی۔ ایم اینڈرسن کو بھجوایا۔ تقریب بہر ملاقات کے خانے میں باریک حروف میں ''سرکاری'' لکھ دیا جس سے ہماری مراد نجی یعنی بسلسلہ ملازمت تھی۔ اور آخر میں، جلی حروف میں: ''فرستادہ...... مسٹر ایم۔ اے اصفہانی، چیرمین بینک ہذا۔'' سفارش میں لپٹی ہوئی یہ دھمکی ہمارے کام نہ آئی، اس لیے کہ ہمارے بعد آنے والے ملاقاتی، جو ہمارے حسابوں ہم سے زیادہ خوش پوش اور حیثیت دار نہ تھے، باری باری شرفِ باریابی حاصل کر کے رخصت ہو گئے اور ہم سر جھکائے سوچتے ہی رہ گئے کہ مری بار کیوں دیر اتنی کری؟

ڈیڑھ دو گھنٹے بینچ پر انتظار ساغر کھینچنے کے بعد جی میں آئی کہ لعنت بھیجو۔ ایسی ذلت نوکری سے بے روزگاری بھلی۔ دیر ہے، اندھیر بھی ہوگا۔ چل خسرو گھر آپنے سانج بھئی چوندیس۔ مرزا غالب بھی تو فارسی مدرس کی سو روپے ماہوار اسامی کے لیے پالکی میں بیٹھ کر مسٹر ٹامسن کے پاس انٹرویو کے لیے گئے تھے لیکن اُلٹے پھر آئے، اس لیے کہ وہ ان کی پیشوائی کو باہر نہیں آیا۔ کہاروں سے کہا بس ہو چکی ملاقات۔ پالکی اٹھاؤ۔ ہم بھی اُستاد کے تتبع میں واپس پالکی میں سوار ہو رہے تھے کہ اندر والا بولا، ہوش میں آؤ۔ تم کہاں کے دانا ہو، کس ہنر میں یکتا ہو؟ مرزا تو شاعر آدمی ٹھیرے۔ اس کے بعد بھی جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر نیا آتا تو ایک قصیدہ بطریق نذر گزرانتے رہے اور پنشن کے علاوہ سات پارچے کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالائے مردارید برابر وصول کرتے رہے۔ تم کیا کرو گے؟ تم تو صرف نثر میں خوشامد کرنی جانتے ہو۔ پھر واپسی کے لیے باہر پالکی بھی تو نہیں ہے کہ تنتناتے ہوئے بیٹھ کے گھر آ گئے اور راستے میں کہاروں کو کندھا تک نہ بدلنے دیا۔ اور ہاں، روزی پر لات مار کے چلے بھی گئے تو اس مظاہرہ پندار کو شہرتِ دوام بخشنے کے لیے محمد حسین آزاد کو کہاں سے لاؤ گے؟ کہاں وہ خودداری کہاں یہ سجدہ نا قبول۔ بندہ ناخدا! مزے سے بیٹھے کشکول بجاتے ہو۔ تین برس تم ڈپٹی کمشنر رہے۔ سچ کہو کبھی کسی اہل غرض سے سیدھے منھ بات کی؟

کچھ دیر بعد چپراسی ہماری کس مپرسی پہ ترس کھا کے خود ہی کہنے لگا کہ اگر نوکری کی سفارش لے کر آئے ہو تو آج مڈبھیڑ نہ کرو۔ اجن فجر سے سالے کا مغز پھریلا ہے۔ اکھا باٹلی دارو پیے لا ہے۔ پاکٹ میں چھوٹا باٹلی کے اندر 'کمسچر' بھر کے لایا ہے۔ دو کلاک پہلے سگرٹ سے تجوری کھولنا مانگتا تھا۔ اصلی رنگت سولہ آنے مولی کے موافق ہے۔ پن اس ٹیم جاستی بلڈ پریشر سے ایکدم چقندر لگتا پڑا ہے۔ تمیرا کام آج کے دن نہیں ہونے سکتا۔

پون بجے جب اسٹاف ایک ایک کر کے لنچ کے لیے کھسکنے لگا اور مہتر اس چابکدستی سے جھاڑو دینے لگا کہ گرد کا ایک ایک ذرہ کھینچ کر ہماری عینک اور چہرے پر جمع ہو جائے تو زور سے گھنٹی بجی اور بجتی ہی

چلی گئی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی گھنٹی کے بٹن پر بیٹھ گیا ہے۔ چپراسی نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ چند لمحے پہلے سلگائی ہوئی پہلوان مارکہ بیڑی کے کش لیتا رہا۔ پھر اسے چھنگلیا میں دبا کر الوداعی دم لگایا اور جوتے کی ایڑی پر رگڑ کر بجھا دیا۔ بیڑی کا بنڈل، چونی اور فلمی گانوں کا کتابچہ سر پر رکھا اور ان پر ترکی ٹوپی کو کج کیا۔ پھر اس ''سیف ڈپازٹ لاکر'' کا پھندنا ہلا کر کہنے لگا کہ لگتا پڑا ہے اب کے تمہاری آئی ہے۔ قسمت کی بدنصیبی کو صیاد کیا کرے؟ لارالپا لارالپا! لالالا!

...... کچھ نے کہا چہرہ ترا

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے اپنی دائیں ہتھیلی کا پسینہ پونچھ کر ہاتھ مصافحہ کے لیے تیار کیا۔ سامنے کرسی پر ایک نہایت بارعب انگریز نظر آیا۔ سر بیضوی اور ویسا ہی صاف اور چکنا۔ جس پر پنکھے کا عکس اتنا صاف تھا کہ اس کے بلیڈ گنے جاسکتے تھے۔ آج کل کے پنکھوں کی طرح اس پنکھے کا وسطی حصہ نیچے سے چپٹا نہ تھا بلکہ اس میں ایک گاؤدم چونچ نکلی ہوئی تھی جس کا مصرف بظاہر یہ نظر آیا کہ پنکھا سر پر گرے تو کھوپڑی پاش پاش نہ ہو، بلکہ اس میں ایک صاف گاؤدم سوراخ ہو جائے۔ بعد میں اکثر خیال آیا کہ سر پر اگر بال ہوتے تو اس کی وجاہت و دبدبہ میں یقیناً فرق آجاتا۔ میز کے نیچے ایک اُدھڑا اُدھڑا ''کیمل کلر'' کا قالین بچھا تھا۔ رنگ میں واقعی اس قدر مشابہت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی خارش زدہ اونٹ اپنی کھال فرش راہ کیے پڑا ہے۔ بھرے بھرے چہرے پر سیاہ فریم کی عینک۔ کچھ پڑھنا یا پاس کی چیز دیکھنی ہو تو ماتھے پر چڑھا کر اس کے نیچے سے دیکھتا تھا۔ دور کی چیز دیکھنی ہو تو ناک کی پھننگ پر رکھ کر اس کے اوپر سے دیکھتا تھا۔ البتہ آنکھ بند کر کے کچھ دیر سوچنا ہو تو ٹھیک سے عینک لگا لیتا تھا۔ بعد میں دیکھا کہ دھوپ کی عینک بھی ناک کی نوک پر ٹکائے، اس کے اوپر سے دھوپ کا معائنہ کرتا ہوا بینک آتا جاتا ہے۔ آنکھیں ہلکی نیلی جو یقیناً کبھی روشن روشن رہی ہوں گی۔ ناک ستواں ترشی ترشائی۔ نچلا ہونٹ تحکمانہ انداز سے ذرا آگے کو نکلا ہوا۔ سگرٹ کے دھوئیں سے ارغوانی۔ بائیں ابرو بے ایمان دکاندار کی ترازو کی طرح مستقلاً اوپر چڑھی ہوئی۔ گرجدار آواز۔ جسم مائل بہ فربہی۔ رنگ وہی جو انگریزوں کا ہوتا ہے۔ آپ نے شاید دیکھا ہوگا کہ چینیوں کا چہرہ عمر سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اور انگریزوں کا جذبات سے عاری بلکہ بعض اوقات تو چہرے سے بھی عاری ہوتا ہے۔ لیکن یہ بالکل مختلف چہرہ تھا۔ ایک عجیب تمکنت اور دبدبہ تھا اس چہرے پر۔ کمرے میں فرنیچر برائے نام۔ نہ آرائش کی کوئی چیز۔ سارا کمرہ اس کے چہرے سے ہی بھرا بھرا نظر آتا تھا۔ یہ مقابل ہو تو اور کوئی چیز .... اس کا اپنا جسم بھی .... نظر نہیں آتا تھا۔

اُس کا سراپا ہے یہ مصرع
چہرہ ہی چہرہ پاؤں سے سر تک

ہم نے تیار شدہ ہاتھ مصافحہ کو بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ کچھ دیر بعد ''کریون اے'' کا ''کارک ٹپڈ'' سگرٹ ڈبے سے نکال کر اُلٹی طرف سے ہونٹوں میں دبایا۔ وہ بہت بُرے موڈ میں تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے چائے کی پیالی اٹھائی اور دوسرے کانپتے ہوئے ہاتھ سے زیادہ کانپتے ہاتھ کو تھاما۔ کپ کی ڈگڈگی سی بجنے لگی اور چائے چھلک کر ہماری درخواست کو رنگین کر گئی۔ اب ایک دیا سلائی کو اپنے بہتر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کے اس پر ڈبیا رگڑنے لگا۔ لیکن وہ کسی طرح جل کر نہیں دیتی تھی۔ خواہ مخواہ کا تکلف تھا' ورنہ چاہتا تو اسے اپنے بلڈ پریشر پر رگڑ کے بآسانی جلا سکتا تھا۔

ہمارا سن پیدائش

اس نے غلط طرف سے سگرٹ سلگایا۔ کارک کچھ دیر بعد خود جل جلا کر ہماری گیلی درخواست پر چھن سے بجھ گیا۔ اس نے چھنگلیا کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ہم تعمیلاً بیٹھنے والے ہی تھے ہ ناگاہ اسی کرسی کی گہرائیوں سے ایک کتا اٹھ کھڑا ہوا اور ہمارے شانوں پر دونوں پنجے رکھ کر ہمارا گرد آلود منھ اپنی زبان سے صاف کیا۔ ''مائی ڈاگ از ویری فرینڈلی'' کتے سے تعارف کرانے کے بعد اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لیا۔ کیسے ہو؟ کون ہو؟ کیا ہو؟ اور کیوں ہو؟

سوائے آخری سوال کے' ہم نے تمام سوالات کے نہایت تسلی بخش جواب دیے۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس بینک کو میں چلا رہا ہوں' مسٹر اصفہانی نہیں۔ خیر۔ تم نے معاشیات پڑھی ہے؟'' اس نے کہا۔

''نو سر!''

''حساب میں بہت اچھے تھے؟''

''نو سر! حساب میں ہمیشہ رعایتی نمبروں سے پاس ہوا' حالانکہ انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم۔ اے تک فرسٹ ڈویژن فرسٹ آیا۔''

''حساب میں فیل ہونے کے علاوہ تمہارے پاس اس پیشے کے لیے اور کیا کوالی فیکیشن ہے؟''

''میں نے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا ہے۔''

''ہا ہا ہا! تمہارا سوشل بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ کس خاندان سے تعلق ہے؟''

''میرا تعلق اپنے ہی خاندان سے ہے۔''

''سچ بولنے کا شکریہ۔''

جی تو بہتیرا چاہا کہ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں کہ بزرگ حب جاہ و مال سے بے نیاز تھے۔ فقط ہمیں اپنی نشانی چھوڑا۔ نادر شاہ نے تو اپنی ولدیت شمشیر' ابن شمشیر' ابن شمشیر بتا کر بدخواہوں اور

مورخوں کا منہ بند کر دیا تھا۔ لیکن یہ فقیر' ابن آدم' ابن آدم' ابن آدم کے علاوہ کیا بتاتا؟

اس کے منہ سے ایسی لپٹ آرہی تھی جیسی روئی کے اس پھوئے سے آتی ہے جو انجکشن سے پہلے نقطہ اذیت پر رگڑا جاتا ہے۔ استفسار فرمایا ''تم کب اور کہاں 'ڈلیور' ہوئے تھے؟ ہاہاہا!''

وہ زور سے ہنسا۔ ہم ذرا چکرائے تو کہنے لگا' اچھا یہ بتاؤ کہ جس سنہ میں تم پیدا ہوئے اس سال اور کون سا بین الاقوامی سانحہ ہوا تھا؛

انٹرویو کے سلسلہ میں ایک عرصہ پہلے ہم نے معلومات عامہ کے نامعقول سے سوالوں کے جواب رٹ لیے تھے۔ مثلاً کرکٹ کی گیند کا وزن۔ مکھی کی ٹانگوں اور بیل کے دانتوں کی تعداد۔ نپولین کا قد۔ اگر بینک سے صرف ۱۰۰ روپے ۷% سود پر قرض لیے جائیں تو وہ کس طرح ۲۵۰ سال میں ۴۰۰' ۹۰۲' ۷ا۲۱' ۲ ہو جائیں گے! خالص سونا کتنے کیرٹ کا ہوتا ہے؟ بلی کی آنتوں کی لمبائی۔ کتا زبان کیوں باہر نکالے رکھتا ہے؟ انسان منہ کھولنے سے کیوں ڈرتا ہے؟ اچھا خاصا............ لکھ کر انہیں حرف غلط کی طرح کاٹا............ کیوں جاتا ہے؟ تخلص پر ڈوگی کیوں بنائی جاتی ہے؟ شیکسپیر کے ہاں شادی کے کتنے ماہ بعد بچہ تولد ہوا؟ بانس پولا کیوں ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ ...... لیکن اپنی پیدائش کے بین الاقوامی متوازیات کی طرف ہمارا دھیان کبھی نہیں گیا تھا۔

ہمارا آدھا جسم جو اس کے مقابل تھا بالکل ٹھنڈا ہو گیا اور ہم انتہائی بے بسی کے عالم میں جھورنے لگے ☆ تو اس نے ہماری درخواست میں سن پیدائش دیکھ کر اندوہ گیں لہجے میں کہا کہ بائی دے وے، جس سال تم پیدا ہوئے اسی سال میرے باپ کا انتقال ہوا۔ بڑا منحوس تھا وہ سال!''

ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

''رہنے والے کہاں کے ہو؟''

ایک دفعہ تو جی میں آئی کہ میر بے دماغ کی طرح کہہ دیں:

کیا بود و باش پوچھو ہو یورپ کے ساکنو

لیکن یہ لکھنو کا مشاعرہ نہیں' ملازمت کا انٹرویو تھا۔

''جے پور...... اجمیر کے پاس ہے۔'' ہم نے معذرتی لہجے میں اس شہر کا نام لیا جو کبھی عالم میں انتخاب تھا۔

OH: YES: THE PINK CITY: کیا بات ہے! برٹش ریزیڈنٹ نے ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی تھی۔ برما میں ہم دونوں کا ایک ساتھ کورٹ مارشل ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ہے تمہارا جے پور۔

☆ جھورنا: (پنجابی) گردن ڈال کر عالم غنودگی میں غور فرمانا۔ جیسے ضعیف ولاغر مرغا پروں میں چونچ ڈال کر اپنے حال اور مرغیوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ کر کڑھتا ہے۔

سادے شہر میں سڑک کے دونوں طرف ہر عمارت کا ایک سان زعفرانی رنگ۔ اونچے طرے والے راجپوتی صافے اور ان سے بھی اونچی مونچھیں اور ہر دو کو سونڈ سے سلام کرتے ہوئے ہاتھی۔ آسٹریلین گھوڑوں پر پولو۔ کچرے اور غلاظت کی گڈز ٹرین جسے مقامی بھینسے کھین رہے تھے۔ اسی ریل میں نے امرتسر میں بھی دیکھی تھی جو ایک محلے کی رقیق غلاظت کی دوسرے محلوں میں گشتی نمائش کرتی پھرتی تھی۔ بھرے بازار میں بلکتے بچوں کے منہ میں کھڑے کھڑے چھاتی دیتی ہوئی عورتیں۔ بعض لاڈلے تو اتنے بڑ ہوگئے تھے کہ خود کھڑے ہوکر کھڑے ہوئے منبع سے جوئے شیر نکال رہے تھے۔ درشنی جھروکوں سے آنکھ مارتی ہوئی ناچ گرلز۔ دھنک کے رنگ کے ابرک سے جھاجھم کرتے ہوئے لہریئے شانوں سے ڈھکائے ...... ایک ایک انچ جوانی، راجستھانی روپ سنگھار اور سفلس سے بھرپور۔ شلوکے میں خس کی ٹٹی کا سینٹ، بالوں میں COOKING OIL (چونک کر) عورت کبھی میری کمزور نہیں رہی۔ اور وہ تو میں بھول ہی گیا۔ مادرزاد معصوم اور اتنی ہی مدت سے برہنہ فقیروں کی قطار جن کے پیر وغیرہ کو عورتیں دھو دھو کر پیتی ہیں۔ کیا کہتے ہیں ان کو؟''

''دگمبر جین سادھو''

English کی لڑکیاں اور یہ سادھو کپڑوں کا شمار مکروہات دنیوی میں کرتے ہیں۔ اور ہاں! مجھے سب یاد ہے۔ تمہارے ہوم ٹاؤن میں ہر چوراہے پر مرحوم بزرگوں کے نام پر چھوڑے ہوئے مقدس سانڈ اپنے فرائض منصبی انجام دیتے پھرتے ہیں۔ تمہارے سب بزرگ زندہ ہیں یا......؟ پریسٹلی نے کہیں لکھا ہے کہ جے پور سے زیادہ صاف سڑکیں میں نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھیں۔ وجہ یہ کہ گوبر اور لید زمین پر گرنے سے پہلے ہی اچھوت عورتیں کیچ لے لیتی ہیں۔''

اس نے زعفرانی بادبانوں کی ساری ہوا نکال دی۔ غریب شہر سر جھکائے، چھوڑے ہوئے دیس کو پردیسی کی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ جو شکل نظر آئی تصور نظر آئی۔

''تم راجپوت ہو؟''

''آدھا۔ نانا تھے۔ نومسلم راٹھور۔ طوطے کی چونچ جیسی ناک والے راٹھور۔''

''بالکل لال؟''

''نہیں۔ خمدار۔''

مردانہ کھیلوں سے ہماری دلچسپی

''آخر تم یہ پیشہ کیوں اختیار کرنا چاہتے ہو؟ کوئی معقول وجہ؟''

ہم کافی نروس ہو چکے تھے۔ دو تین دفعہ زور لگانے کے بعد جو آواز اچانک ہمارے مُنہ سے نکلی وہ اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں سُنی تھی۔

شاید اسے بھی ترس آگیا۔ اب کے آسان سوال کیا۔ ''جوانی' میرا مطلب ہے طالب علمی کے زمانے میں کن کھیلوں سے دلچسپی رہی؟''

''کیرم اور لوڈو''

''میرا مطلب مردانہ کھیلوں سے تھا۔''

ہمارا یہ خانہ بالکل خالی تھا۔ پانچویں جماعت میں البتہ سالانہ اسپورٹس کی دوڑ میں ہمارا اکیسواں نمبر آیا تھا۔ دوڑ میں اتنے ہی لڑکے شریک ہوئے تھے۔ کچھ دن فٹ بال سے بھی سر مارا۔ آخری لمحہ اتصال تک یہ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ اس دفعہ فٹ بال پر اپنا دایاں پاؤں ماریں یا بایاں زیادہ مناسب رہے گا۔ دودھ کے دانت ٹوٹنے سے پہلے ہی ہم خاصے دبیز شیشے کی عینک لگانے لگے تھے۔ (جو حضرات ضعف بصارت سے محروم ہیں' ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب کبھی ہم عینک اُتار کر آئینہ دیکھتے ہیں تو بخدا اپنے کان نظر نہیں آتے) کئی دفعہ عینک توڑنے کے بعد اب ہم اسے اُتار کر بے خطر کھیلنے لگے تھے۔ کھیلتے کیا تھے' ہر ایک سے مینڈھے کی طرح ٹکریں لیتے پھرتے تھے۔ مخالف ٹیم میں ہمیشہ بہت ''پاپولر'' اس لیے کہ اپنی ہی ٹیم سے گیند چھینتے اور انہیں کو فاؤل مارتے پھرتے تھے۔ کھیل کے شروع میں ''ٹاس'' کیا جاتا۔ جو کپتان ٹاس ہار جاتا وہ ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کرنے کا پابند ہوتا۔ جب تک مخالف کھلاڑی تاک کر ہمارے پاؤں پر زور سے فٹ بال نہ مارے' وہ ہمارے کک سے محروم ہی رہتی تھی۔ چونکہ سر ہمارے دیدۂ نیم بینا سے قریب ترین عضو تھا' اس لیے ہم نے سر سے فٹ بال روکنے اور گول کرنے کی مشق و مہارت پیدا کی۔ ایک دن ہم نے تین فٹ اچھل کر ''ہیڈ'' کیا تو جس گول شے سے ہم نے آنکھ بند کر کے اپنی پوری قوت سے ٹکر لی وہ دیو قامت جسونت سنگھ چوہان کا منڈا ہوا سر نکلا۔ وہ شام کو ٹھنڈائی (بھنگ) پی کر فٹ بال کھیلتا تھا۔ ہماری ناک کا بانسہ اور دل ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔

ہم نے عینک اتار کر مردانہ کھیل سے اپنی دیرینہ وابستگی کا ثبوت اینڈرسن کو دکھایا۔ ناک کی خمیدہ ہڈی دیکھ کر بہت ہنسا کہنے لگا تمہارا ایک کان بھی ٹیڑھا لگا ہوا ہے۔

''اور تم RIMLESS GLASSES کیوں لگاتے ہو؟ تمہاری صورت سر اسٹیفرڈ کرپس سے ملتی ہے۔''

''ذرّہ نوازی کا شکریہ!'' ہم نے خوش ہو کر کہا۔

''مجھے اُس باسٹرڈ کی صورت سے نفرت ہے۔''

تو پھر اب کیا جگہ کی قید

ہم ابھی اس چوٹ کو ٹھیک سے سہلا بھی نہ پائے تھے کہ استفسار فرمایا ''کنوارے ہو؟''

''نو سر!''

''کتنی بیویاں ہیں؟'' اس نے سوال کر کے دونوں ہونٹ بھینچ لیے۔

''ایک۔''

''مجھے تو چار پر بھی اعتراض نہیں۔ لیکن چار بیویوں میں قباحت یہ ہے کہ چار دفعہ طلاق دینی پڑتی ہے۔''

بھلا وا دے کر پھر وہی سوال دہرایا ''سفارش اپنی جگہ، لیکن بینک میں کیوں ملازمت کرنا چاہتے ہو؟ بینکر کے کیا فرائض اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں؟''

یہ سوال سنتے ہی ہمارے ہاتھوں کے روایتی طوطے دوبارہ اڑ گئے اور ایسے اڑے کہ پھر نہ لوٹے۔ ہم پھر ''جھورنے'' لگے۔ معقول وجہ کے بجائے لطیفے یاد آنے لگے، لیکن یہ موقع اس کے دامن کو ظریفانہ کھینچنے کا نہیں تھا۔ ہم نے تا دم تقریر و تقرر کسی بینک کو اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اتنا معلوم تھا کہ اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ اس کے پاس اتنی جائیداد اور سرمایہ ہے کہ قرض کی قطعاً ضرورت نہیں تو بینک اسے قرض دینے پر رضا مند ہو جاتا ہے۔ مارک ٹوین کا یہ مقولہ بھی کہیں پڑھا تھا کہ بینکر اچھے وقتوں کا بہترین ساتھی ہوتا ہے۔ موسم اچھا ہو تو زبردستی اپنی چھتری ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ لیکن جیسے ہی چھینٹے پڑنے لگیں تو کہتا ہے لاؤ میری چھتری۔ ہمیں تو بس اتنا بتایا گیا تھا کہ بینکر دھڑلے سے سود لیتے ہیں۔ سود دیتے ہیں۔ اور سود کا حساب رکھتے ہیں۔ اور یہ تینوں فعل از روئے شرع حرام ہیں۔

رہی ''بزنس مین'' سے واقفیت، سو ہمارا حلقہ شناسائی صرف ایک کائیاں مارواڑی سیٹھ پر مشتمل تھا جو روپیہ اپنی تجوری میں رکھتا تھا اور ربلو فلمیں بینک کے لاکر میں اور جہاں تک بینکنگ کے بارے میں کتابی معلومات کا تعلق تھا تو وہ اس ادبی دریافت تک محدود تھیں کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے جب WASTELAND لکھی تو وہ لائیڈز بینک میں کلرک تھا اور اس پیشے سے اس کا پنڈ چھڑانے کے لیے ازرا پاؤنڈ نے چندے کی ایک عالم گیر مہم چلائی تھی جس میں کل تیس پاؤنڈ جمع ہوئے۔ اسی طرح مشہور مزاح نگار جارو سلاؤ ہسک بھی ایک بینک میں ملازم ہو گیا تھا۔ وہاں جو کچھ اس نے دیکھا، اس سے اتنا اثر لیا کہ بھرے بھتولے گھر پر جھاڑو پھیر کر ہمیشہ کے لیے خانہ بدوش ہو گیا۔ اور اگر او ہنری بینک میں غبن نہ کرتا تو دنیا ایک عظیم افسانہ نگار سے محروم ہو جاتی۔ اس نے بینک کے خشک اعداد و شمار میں افسانے کا رنگ بھر دیا۔ چنانچہ بینک دوالے میں چلا گیا اور اسے خیانت مجرمانہ کے الزام میں پانچ سال کی سزا ہوئی۔ جیل ہی میں اُس نے اپنا پہلا افسانہ لکھا اور نام تبدیل کر کے ولیم سڈنی پورٹر سے او۔ ہنری بن گیا۔ او۔ ہنری دراصل اس جیل کے سنتری کا نام تھا۔ اس زمانے میں ہمیں اپنی معلومات عامہ پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اور دن میں بھی وہ سرمستی و نخوت طاری رہتی تھی جو خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کو صرف رات گئے میسر آتی تھی:

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشہ علم میں سرمست غرور و نخوت

لیکن اس کذھب سوال سے سارا نشہ علم ہرن ہو گیا۔

NEGOTIABLE INSTRUMETNS ACT کا نام ضرور سنا تھا۔ شروع میں تو ہم سمجھتے تھے کہ ARMS ACT کی طرح سودخوروں کے لیے انتقال آلات قتل کا کوئی قانون ہو گا۔ بعد میں بھی معلوم ہوا تو بس اتنا کہ کسی لیڈر کی روح عالم بالا کو پرواز کر جائے یا سکے کی قیمت زمین پر آ رہے تو بینک اس قانون کے تحت بند کیے جاتے ہیں۔ لیکن جب تک کوئی لیڈر قوم کو داغ مفارقت نہ دے تو اس قانون کا کیا مصرف ہے، بینک اس طویل وقفہ انتظار میں وقت گزاری کے لیے کیا کرتے ہیں ...... اس کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

ایک کم پانچ اور ایک اوپر تین کا فرق

بینکاری کے اسرار و رموز تو کجا' ہم نے تو زندگی میں کسی مسلمان بینکر کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے اس "آوٹ آف ہاؤنڈز" پیشے میں اعلیٰ ہی نہیں' ادنیٰ عہدوں پر بھی انگریز اور ہندو فائز تھے۔ البتہ مسلمانوں پر اپنی جمع جتھا سیونگ بینک اکاؤنٹ میں جمع کرانے پر کوئی پابندی نہیں تھی: اور بیچارے مسلماں سے فقط وعدہ سود!

لیکن ہم دھوکے میں آنے والے نہیں۔ بزرگوں نے صدیوں پہلے کفایت شعاری کو ہندوانہ رسم سمجھ کر ترک کر دیا تھا۔ سو پشت سے جن قوموں اور قبیلوں کا پیشہ آبا سپہ گری (یعنی پہلے دشمن بنانا اور پھر انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتارنا یا وہ اس پر رضامند نہ ہوں تو خود اتر جانا) رہا ہو وہ تجارت کو پتلی دال کھانے والے بقالوں کا حق سمجھ کر اس سے اجتناب کریں تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ مہابلی اکبر نے بھی آخر کار محکمہ مال کا چارج راجہ ٹوڈرمل کو تفویض کیا اور فیضی کو بھگوت گیتا اور مہا بھارت کے فارسی ترجمے میں جوت دیا۔ (بیربل کو البتہ راقم الحروف کے فرائض سونپے گئے کہ خبردار! منہ سے کبھی کوئی سنجیدہ بات نکالی تو وہیں زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔) ایک ریت سی پڑ گئی تھی کہ مسلمان رؤسا اور جاگیرداروں کی آمدنی کا حساب تو ہندو منیم رکھتے اور خرچ کا حساب خود عدالت کو قرقی کے وقت بنانا پڑتا تھا۔ اعمال کے حساب کتاب کا جنجال بھی ہم نے کراماً کاتبین کو اور متعلقہ آڈٹ منکر نکیر کو سونپ رکھا ہے۔ ہمیں روپیہ ہمیشہ کم ہی معلوم ہوتا ہے۔ مسلمان ۲ اور ۲ کو ۴ نہیں' بلکہ ایک کم پانچ کہتا ہے' جب کہ ہندو ایک اوپر ۳ کہتا ہے۔ یہ قول رابرٹ کلایو کے ایک ہم عصر سے منسوب ہے کہ روپیہ بچا کر رکھنے کے معاملے میں مسلمان چھلنی کی طرح ہوتا ہے اور ہندو اسفنج کی مانند۔

سوداگری کو کسر شان سمجھنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ دودمان تیمور یہ پر جب ملک خدا تنگ ہوا تو اس کا

آخری چشم و چراغ مہاجن سے قرض لے کر فوج کی تنخواہیں چکاتا اور اپنی غزلوں کی اصلاح کرنے والے استاد، نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب کو چاندی کے طشت میں زربفت کے تورہ پوش سے ڈھکا ہوا سیم کے بیجوں کا توشہ بھیجتا۔ تقسیم سے پہلے کے تین چار سو برسوں میں خاص کر، برصغیر کے مسلمان نے تجارت کو اپنی شانِ قلندری کے خلاف سمجھا اس نے کہ اس میں یہ اندیشہ تھا کہ ذرا سی غفلت یا لاپروائی سے کہیں منافع نہ ہو جائے۔ چمڑے اور کھالوں کی ساری تجارت البتہ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی، جس کی تین وجہیں تھیں۔ اول تو یہ انہی مرحومین کی آخری نشانی تھی جنہیں وہ برغبت کھا چکے تھے۔ دوم یہ کہ ہندو اس کاروبار کو ناپاک سمجھتے تھے۔ سوم، خوش قسمتی سے ان تاجروں کا تعلق چنیوٹ سے تھا جو دلی کے دربار سے ہنوز دور تھا۔ ان کی سوجھ بوجھ کے سامنے مارواڑی بھی کان پکڑتے ہیں۔ مشہور ہے کہ چنیوٹی یا میمن پاگل ہو جائے تب بھی دوسرے کی پگڑی اتار کر اپنے ہی گھر میں پھینکتا ہے۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔

حساب کتاب کا جنجال

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اردو کی داستانوں میں سوداگروں کا ذکر اگر کہیں آتا ہے تو وہ محض قزاقوں سے لٹنے کے لیے۔ اور یہ بھی اس طور پر کہ پڑھنے والے کی اخلاقی ہمدردی ہمیشہ لوٹنے والے کے ساتھ رہتی ہے۔ اردو غزل میں ہمیں یاد نہیں کہ کسی شاعر نے سوداگر کو کلمہ خیر کے ساتھ یاد کیا ہو۔ ہاں ایک نظم، مثنوی زہر عشق، میں سوداگر در آیا ہے۔ وہ بھی فقط اس لیے کہ اس کی ایک دختر تھی جو خلاف محاورہ، نیک اختر نہ نکلی۔ مگر جس سے آگے چل کر شاعر کو ردیف و قافیہ کی چول بٹھانے کے علاوہ اور بھی بہت سے کام لینے تھے جن میں خلوت کی ملاقاتیں، ان کے لازمی نتیجہ میں خودکشی اور آخرالذکر سے پہلے ''پان کل کے لیے لگاتے جائیں'' کا فریضہ شامل تھا:

جس محلے میں تھا ہمارا گھر
وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
ایک دختر تھی اس کے ماہ جبیں
شادی اس کی ہوئی نہیں تھی کہیں

آخری مصرع میں جو نوید مسرت ہے بس اسی نے پچھلے تین مصرعوں میں جان سی ڈال دی ہے۔ اور تو اور عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی نے سود بڑھا کر لانے اور ٹوٹا گھاٹا پانے والے بنجارے کے ٹھاٹ باٹ کو مٹی میں ملایا سو ملایا، تعلقات زناشوئی پر بھی ہاتھ صاف کر گئے:

دھی، پوت، جنوائی، بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی

بچپن کی بات ہے۔ شاید اسی لیے اچھی طرح یاد ہے۔ پورے قصبہ چاکسو (خورد) میں تجارت

وجارت تو بڑی بات ہے۔ کسی مسلمان کی پنساری تک کی دکان نہ تھی۔ ۱۹۳۳ء میں چند مسلمانوں نے قرض حسنہ اور چندہ جمع کر کے سرمایہ فراہم کیا اور صولت یار خاں ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس کو مسلمانوں کے محلے میں پرچون کی دکان کھلوادی۔ اس زمانے میں کوڑیاں بھی چلتی تھیں۔ دھیلے کا گھی اور چھدام کے بینگن خریدتے غریبوں کو ہم نے بھی دیکھا ہے۔ چھوٹے بینگن کا ''جھونگا'' ☆ اس کے علاوہ صولت یار خاں کو منافع سے تو دلچسپی تھی، لیکن حساب کتاب کو مکروہ گردانتے تھے۔ دکان میں ان کی مسند تکیے، حقے اور ترازو کے سامنے آٹا، شکر، بیسن، نمک، مرچ، دالیں اور مسالے، الٹی ہوئی آستین کی طرح ادھ کھلی بوریوں میں بھرے رہتے تھے۔ جو چیز جتنی بکتی اس کی قیمت اس بوری یا کنستر پر سارے دن پڑی رہتی تاکہ حساب میں آسانی ہو۔ شام کو ہر جنس کی بکری کو علیحدہ علیحدہ گنتے۔ روکڑ کی میزان نہیں بیٹھتی تو اپنا دل نہیں جلاتے تھے۔ بہی کھاتوں میں ایک نئی مد ''بھول چوک لینی دینی'' کھول لی تھی۔ روزانہ کیش میں جو کمی واقع ہوتی وہ اسی کے متھے مارتے ہوتے ہوتے اس مدت میں کافی رقم چڑھ گئی جو تقریباً اصل سرمایہ کے برابر تھی۔ شب برات کی صبح مرزا عبدالودود بیگ جن کی عمر اس وقت سات سال ہوگی، چھ پیسے کی زعفران لینے گئے۔ زعفران کی پڑیا لے کر انہوں نے صولت یار خاں کو ایک کلدار روپیہ تھمایا۔ اتفاق سے زعفران کی ابھی بوہنی نہیں ہوئی تھی اور اس کے ڈبے پر کوئی ریزگاری نہیں تھی۔ صولت یار خاں نے بندھی بندھائی پڑیا مرزا کے ہاتھ سے چھین کر کہا ہشت! ہمارے پاس ریزگاری نہیں۔ گوبندا بنئے کی دکان سے خرید لے۔ مرزا نے انگلی سے ریزگاری کی ان ڈھیریوں کی طرف اشارہ کیا جو تقریباً ہر بوری اور کنستر پر پڑی تھیں۔ ارے صاحب وہ تو آپے سے باہر ہوگئے۔ دھمکی آمیز انداز سے دوسیری ☆ اٹھاتے ہوئے بولے، مرغی کے! دوسری ڈھیری میں سے ریزگاری نکال کے تجھے دے دوں تو شام کو حساب کون کرے گا؟ تیرا باپ؟

ہمارا چوتھی کھونٹ جانا

بچپن میں ہم کبھی ''کیریر'' کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے تھے تو انجن ڈرائیوری کے سامنے بادشاہی بھی ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ نام خدا ذرا سیانے ہوئے اور دل سے جن، بھوت اور بزرگوں کا ڈر نکلا اور وہ دن آئے ''جب سائے دھانی ہوتے ہیں، جب دھوپ گلابی ہوتی ہے'' تو گھنے جنگلوں میں ٹارزن کی سی سادہ زندگی گزارنے کا عزم کیا۔ نہ امتحان کا کھٹکا، نہ روز صبح منہ دھونے کا کھڑاگ۔ محبوبہ ایک گز بھی دور کھڑی ہو تو زور شباب میں اکیس گز کی چھلانگ لگانا۔ پھر واپس بیس گز کی چھلانگ لگا کر پہلو میں پہنچنا اور چنگھاڑنا۔ جٹا دھاری برگد کی داڑھی یا یہ ہاتھ نہ لگے تو لنگور کی دم پکڑ

☆ جھونگا: (پنجابی) وہ فاضل چیز جو سودا خریدنے والے کو ردکن میں ملے۔

☆ دوسیر سے زیادہ کچھ تولنا ہو تو باٹ گاہک کو اٹھانے پڑتے تھے۔

کے جھولتے ہوئے زون سے ایک درخت سے دوسرے درخت اور ایک مقام سے دوسری دم تک پہنچنا۔ بن میں ترے کو دا کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا! پھر اپنے اور حورِ صحرائی کے درمیان کوئی دریا، ظالم سماج کی طرح حائل ہو جاتا تو اسے اس کے والد یا مگرمچھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر پار کرتے۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ جو کہانی بھی پڑھتے اس کے ہیرو کا محبوب مشغلہ بلکہ محبوبہ تک کو اپنانے کا فیصلہ کر لیتے۔ کسی کے منہ پر سہرا لٹکا دیکھتے تو واللہ تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ محسوس ہوتا گویا ہماری ذاتی حق تلفی ہو رہی ہے۔ اور اگر صلیبی جنگیں بند کرنے میں فریقین اور مولنا عبدالحلیم شرر اتنی عجلت سے کام نہ لیتے کہ ہمیں پیدا ہونے کا موقع تک نہ دیا، تو آج ہماری قبر قسطنطنیہ، رومانیہ، ہسپانیہ یا کسی اور ترقی یافتہ ملک میں ہوتی۔

ہم نے خود کو ہر بہروپ، ہر سوانگ میں دیکھا تھا، سوائے بینکر کے۔ یہ وہ چوتھی کھونٹ تھی جس طرح جانے کی داستانوں میں سخت مناہی ہوتی ہے۔ لیکن جدھر جانے والا ضرور جاتا ہے اور پچھتاتا ہے۔

حلال و حرام

"پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب، کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب۔" بزرگوں کی اس نصیحت اور علم نجوم سے لبریز پیش گوئی پر سارا بچپن نچھاور کروانے کے بعد جب ہماری باری آنے لگی تو یار لوگوں نے ریاستیں رجواڑے ہی ختم کر دیے لیکن بات دراصل یہ ہے کہ آدمی ذرا اوریجنل ہو تو کھیلے کودے بغیر بھی خود کو خراب و خوار کرنے کی کوئی نئی راہ نکال ہی لیتا ہے۔ تیسری جماعت تک ٹونک (راجستھان) میں خود پر تعلیمی تجربے کروائے۔ وہاں اسکول میں ظہر کی نماز باجماعت ہوتی تھی جسے بے وضو ادا کرنے یا سجدے میں ہنسنے پر انگلیوں کے درمیان نیزہ کا قلم رکھ کر دبایا جاتا تھا جو اکثر اس سزا کی تاب نہ لا کر ٹوٹ جاتا تھا۔ قتل عمد کی سزا موت تھی۔ جلاد جب ٹھراپی کر گردن اڑاتا تو تماشا دیکھنے کے لیے شہر امنڈ پڑتا۔ رقیق القلب لوگ سبز عینک لگا کر جاتے تھے جو اس زمانے میں صرف اس وقت پہنی جاتی تھی جب آنکھیں دکھنی آجائیں۔ اس سے خون بینگنی اور تلوار سبز نظر آتی تھی۔ محکمہ قضاۃ اور عدالت شرع شریف بھی تھی گو کہ اس کا دائرہ بے اختیاری سکڑتے سکڑتے طلاق اور آشنائی کے لذیذ قضیوں تک محدود ہو گیا تھا۔ (حیدرآباد دکن میں تو طوائفوں اور تاڑی پر نظر رکھنے والے سرکاری محکمہ کو محکمہ بدعت کہتے تھے) ٹونک میں دین اور شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ جلاد اور امراء و شرفا کے علاوہ عام آدمی کو شراب پینے کی اجازت نہ تھی۔ خدا نہ سہی، قاضی شہر کا خوف ابھی دلوں سے دور نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ خلاف شرع کوئی کام کرنا ہو تو مسلمان اپنی ترکی ٹوپیاں اتار کر جیب میں رکھ لیتے تھے۔ ٹونک کے ایک سیلانی نواب زادے مصر اور ترکی گئے تو اس بات پر بہت متعجب ہوئے کہ وہاں

تو مسلمان نماز بھی ٹوپی اتار کر پڑھتے ہیں۔

ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سود جسے حرام ٹھہرایا گیا ہے اور ربا جس کی حرمت میں ہمیں آج

بھی شمہ برابر شب نہیں، ہمارا ذریعہ معاش ہی نہیں بلکہ ہر اعتبار سے غالب و کار آفریں، کار کشا و کار ساز ثابت ہوگا۔ والد مرحوم پاکستان آنے لگے تو اپنے پوسٹ آفس سیونگ بینک اکاونٹ میں ساڑھے چار ہزار روپے چھوڑ آئے تھے جو ان کے حساب سے بیس سال کے سود کی رقم بنتی تھی۔ وہ کسی ایسے مسلمان کے ہاں دعوت کھانا تو بڑی بات ہے، پانی پینا بھی حرام سمجھتے تھے جس کے متعلق انہیں معلوم ہو کہ وہ اپنے اکاونٹ پر سود لیتا ہے۔ انہوں نے ایک دن امام ابوحنیفہ کا قصہ سنایا تھا کہ ایک شخص کی تدفین کے بعد لوگ ایک مکان کی دیوار کے سائے میں کھڑے ہوگئے مگر امام ابوحنیفہ دور چلچلاتی دھوپ میں کھڑے رہے۔ کسی نے پوچھا حضرت! آپ سائے میں کیوں نہیں آجاتے؟ آپ نے جواب دیا اس مکان کا مالک میرا مقروض ہے، اگر میں اس کے سایہ دیوار سے فائدہ اٹھاؤں تو ڈرتا ہوں کہ روز حساب اس کا شمار سود میں نہ ہو جائے۔

خیال آیا کہ ملازمت مل بھی گئی تو ایسے باپ کو یہ کیسے بتائیں گے کہ مچھندر نے بہر طور روٹی کمانے کے لیے کیا کسب اختیار کیا ہے۔ وہ ریاست ٹونک میں پولیٹکل سکریٹری رہ چکے تھے۔ ریاستی خوبو سے مبرا، پابند شرع، سادہ دل مسلمان تھے۔ کٹّے بے علم نہ تھے۔ جے پور کے پہلے مقامی مسلمان تھے جس نے ۱۹۱۴ میں بی اے کیا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ ٹونک میں بڑے کنویں کے سامنے ہماری لق و دق حویلی میں ہز ہائی نس نواب حافظ سر ابراہیم علی خاں، والی ریاست، کے درجنوں فوٹو ہر اس جگہ ٹنگے تھے جہاں کیل بغیر اس خدشے کے ٹھونکی جاسکتی تھی کہ ساری دیوار نہ آن پڑے۔ انہوں نے ہر ایک کی ناک چاقو سے چھیل دی تھی، اس لیے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ شبیہ مکمل ہو تو اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ ساٹھ ستر امرا، صاحبزادگان اور درباریوں پر مشتمل ایک گروپ فوٹو، جس میں وہ خود بھی شامل تھے، ایک طاقچے کی زینت تھا۔ اس کا بھی وہی نقشہ تھا۔ ناوک نے تیرے ناک نہ چھوڑی زمانے میں! نواب صاحب جو اسی کے پیٹے میں ہوں گے، خود بھی حافظ و متشرع، تہجد گزار، سادہ و نیک طینت مسلمان تھے۔ اپنی ناک آپ چھیلتے تھے۔ فیضی رحمین سے انہوں نے جو اپنی قد آدم پینٹنگ بمبئی جا کر بصرف کثیر بنوائی تھی، اس کی ناک انہوں نے اپنے جد اعلیٰ امیر خاں لیٹرے کی قرولی سے ٹونک میں خود چھیلی تھی۔ رعایا کو اس خدا ترس، درویش منش فرمانروا سے بے پناہ عقیدت تھی۔ چنانچہ یکم محرم کو پیدائش کے بعد ہمیں اس وقت تک کوئی کپڑا نہیں پہنایا گیا جب تک عشرہ کے بعد اس بزرگ کی اترن کے تبرک سے ہمارا پہلا کرتا نہ سل گیا۔ خدا علیم و خبیر ہے۔ وہی جانتا ہے کہ اس عقیدت و ارادت میں مصلحت و مصاحبت کو کتنا دخل تھا۔ ہم نے اپنے ہوش میں پہلی دفعہ جے پور

☆ جھورنا: (پنجابی) گردن ڈال کر عالم غنودگی میں غور فرمانا۔ جیسے ضعیف ولاغر مرغا پروں میں چونچ ڈال کر اپنے حال اور مرغیوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھتا ہے۔

کا میوزیم دیکھا تو بڑا تعجب ہوا کہ صدیوں پرانی مورتیاں اور بت البرٹ ہال کے کاریڈور میں قطار اندر قطار سجے ہیں۔ ہر طرح صحیح و سالم۔ لیکن ناک ہر ایک ٹوٹی ہوئی۔ جب ذرا سوجھ بوجھ پیدا ہوئی تو سمجھ میں آیا کہ اس آذر کدے سے ہر دور، ہر صدی میں نام بدل بدل کر، کوئی ابراہیم علی خاں مع اپنے مشیر باتدبیر کے گزرتا رہا ہے۔

ہمارے برہمچاری آشرم میں چھ ہفتے کی توسیع

''تم یہ پیشہ کیوں اختیار کرنا چاہتے ہو؟ کوئی معقول وجہ؟'' ذہن پر بہتیرا زور دیا۔ وہ اگر معقول کی بخ نہ لگاتا تو ہم ایک ہزار ایک وجوہات گنوا سکتے تھے۔ اور اگر اس نے ہماری سچ بولنے کی عادت کو اس شدت سے نہ سراہا ہوتا تو ہم یہ جھوٹ بول کر پیچھا چھڑا لیتے کہ حساب کتاب سے ہمیں پیدائشی لگاؤ ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ بزرگ ہمارے حساب کے نمبر دیکھ کر مشتعل ہو جانے اور ہر سوال پر صفر کو صحبت بد کا ثمرہ سمجھتے۔ (حاشا و کلا! مرحوم بزرگوں کی خطا کی گرفت کرنا ہمارا کام نہیں، فرشتوں کا فرض ہے۔ لیکن صحبت بد کی وضاحت اور ''رکارڈ درست رکھنے'' کی خاطر خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتے ہیں کہ جتنی بھی گالیاں ہمیں یاد تھیں وہ سب ہم نے اپنے بزرگوں اور ماسٹروں ہی سے سیکھی تھیں۔) ان دنوں ہمیں اس کا بڑا ارمان تھا کہ کاش ہمارے سر پر سینگ ہوتے تو بزرگ ہمیں کم از کم گدھا تو نہ سمجھتے۔ مرزا کے ددھیالی بزرگ تو ان کی پیٹھ پر باکسنگ کی مشق بھی کرتے تھے۔ ساتویں جماعت میں جب ہمیں انگریزی میں ۱۰۰ میں سے ۹۱ اور حساب میں پندرہ نمبر ملے تو ہم نے گردھاری لال شرما سے رجوع کیا جس نے بالکل یہی نمبر حاصل کیے تھے۔ مضامین کی ترتیب البتہ الٹی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہندوستان کا سب سے بڑا ریاضی داں رامانج رات کو چراغ کی روشنی میں اس طرح پڑھتا تھا کہ ایک ڈوری سے اپنی چوٹی کی چھت کے کڑے سے باندھ لیتا تھا کہ نیند کا جھونکا آئے تو آنکھوں کے آگے بجلی سی کوند جائے۔ لیکن ہم نے اسے بتایا کہ ہماری چھت کے کڑوں میں تو پہلے سے ہی فرشی پنکھا لٹک رہا ہے، جسے صرف بقرعید پر اتارتے ہیں تاکہ قصائی ان میں بکرے اُلٹے لٹکا کر کھال اتار سکے۔ بغل تک ہاتھ اور بند مٹھی کھال میں گھسا گھسا کر۔ گردھاری لال شرما نے ہاتھ جوڑ کر ہمیں مزید تفصیلات میں اترنے سے روکا اور اپنی تجویز فوراً واپس لے لی۔

کچھ دیر بعد کہنے لگا کہ چنتا نہ کرو۔ بچار کر کے کل تک کوئی اور اُپائے نکالوں گا۔ دوسرے دن اس نے اپنا بچن پورا کیا اور حساب میں ۹۱ نمبر لانے کے دو گر بتائے۔ پہلا تو یہ کہ بھوگ بلاس سے دور رہو۔ آج سے پرتگیا کر لو کہ امتحان تک برہمچریہ کا پالن کرو گے۔ ہیٹلی کا منائیں یا چنچل بچار ہلہ بول دیں تو تین دفعہ ''اوم! شانتی! شانتی! شانتی!'' کہنا۔ اس سے بیاکل ساگر اور بھڑکتا جوالا مکھی بھی شانت ہو جاتا ہے۔ اوم! شانتی! شانتی! شانتی!

ہم نے کہا نہ بابا! یہ ہم سے نہ ہوگا۔ بولا بھائی جی! تم مسلے ہوتے ہو بڑے کٹے۔ ہم نے کہا یار! یہ بات نہیں۔ ہمیں تو اس شانتی کھنا یاد آنے لگے گی۔ بولا نا! نا! پھر تو سوتے سمے پرانے پیڑے کی لسی پی لینا۔ کسی کو لوگ جائے تو پلاتے ہیں۔ اور جیسے ہی سندر سپنا دکھائی دینے لگے تو انٹرول میں ہی اٹھ کھڑے ہونا اور ایک لال مرچ کی دھونی لے لینا۔ ایک پل، ایک چھن کے لیے بھی استری کا دھیان من میں نہ لانا۔

''کوئلے سے گرم ہونے والی کا بھی نہیں؟'' ہم نے وضاحت چاہی۔

''پاس ہونا ہے تو برہمچریہ کا پالن کرنا ہوگا۔''

خیر۔ اس شرط سے تو ہم زیادہ بد دل نہ ہوئے۔ اس لیے کہ بارہ برس کی عمر میں ڈیڑھ دو مہینے اور برہمچاری رہنا کچھ ایسا دشوار نہ تھا۔ ہم نے حتی الامتحان کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ دوسرا گر یہ بتایا کہ چوٹی کا کشٹ نہیں اٹھا سکتے تو سر پر باریک مشین پھروالو۔ اور بیچ میں استرے سے منڈوا کر ایک پان بنوالو۔ اور اسے سردلی آم کی گٹھلی سے رگڑ داؤ۔ ساری بھوسی جھڑ جائے تو اس پر گائے کے مکھن کی ٹکیہ رکھ کر کھلے آکاش تلے سوال نکالا کرو۔ ہاں! تالو اس کارن منڈواتے ہیں کہ دھرماتماؤں کے پران کھوپڑی کے رستے ہی نکلتے ہیں۔ پھر اس کا چمتکار دیکھنا۔ میری چوٹی ٹائیفائیڈ کے بعد جھڑ گئی تھی۔ میں نے تو یہی کیا۔ اور یار میاں جی! دھارن جیون بتانا سیکھو۔ گرم چیزوں سے ایک دم پرہیز۔ گوشت' گرم مصالحے' گڑ کی گجک اور اُردو گجل سے چالیس دن الگ رہنا۔

اس کے بدلے انگریزی میں ۹۱ نمبر حاصل کرنے کا جو نسخہ ہم نے اس رامانج کے لیے تجویز کیا اس میں صرف وہ اجزا شامل تھے جن سے ہمیں پرہیز کرنے کی تاکید کی تھی۔ بہرحال ہم نے اس کی ترکیب پر ۱۲' ۱۳ شب عمل کیا' جس میں یوم الحساب کی چاندرات بھی شامل تھی۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ کھلے آسمان کے نیچے پان اور اس کے متعلقہ علاقے کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگتی تو آنکھیں آٹھ بجے آپ ہی آپ بند ہو جاتیں۔ برے برے خیال آنے کا انتظار ہی رہا۔

ہمیں تو نیند ہی آئی شباب کے بدلے

سمندری موت کی ہوائی موت پر فضیلت

مسٹر اینڈرسن نے آخری مرتبہ بڑی دھیرج سے سوال کیا ''تم اس پیشے میں کیوں آنا چاہتے ہو؟ میں یہ سوال تمہیں انٹرویو میں فیل کرنے کے لیے نہیں پوچھ رہا ہوں۔ اگر یہی منشا ہوتا تو میں یہ بھی پوچھ سکتا تھا کہ بتاؤ اس کتے کے والد کا کیا نام ہے؟ ہو! ہو! ہو!''

''میرا تقرر مسٹر ایم۔ اے اصفہانی نے اورینٹ ایئرویز میں کیا تھا۔ میں سول سروس چھوڑ کر ہندوستان سے کراچی آیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ حال ہی ایک ہوائی جہاز گر گیا ہے۔''

''تم پائلٹ ہو؟''

''نہیں تو! ایر کریش میں وفات پانے کے لیے آدمی کا پائلٹ ہونا ضروری نہیں۔''

"You're telling me!"

''سر! مجھے یوں بھی ہوائی جہاز سے سخت نفرت ہے۔'' ہم نے جھوٹ بولا جس میں سچ کا عنصر صرف اس قدر تھا کہ منا باؤ سے کھوکھرا پار تک ہندوستان و پاکستان کا سرحدی علاقہ ہم نے اونٹ کے کوہان پر بیٹھ کر طے کیا تھا۔ (اونٹ کے بقیہ حصوں پر دوسروں کا اسباب رکھا تھا۔) انٹرویو کے دن تک ہماری ٹانگوں کا درمیان فاصلہ اسی کوہان کے برابر یعنی ایک گز تھا جیسے کسی نے چمٹے کو چیر کر سیدھا کر دیا ہو۔

''ہا ہا ہا! عالی و دماغ لوگ ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ مجھے بھی اس شیطانی ایجاد سے سخت چڑ ہے۔ سمندری سفر سے بہتر کوئی سفر نہیں۔ شاہی سواری صرف ایک ہے ...... اسٹیمر۔ سب سے بڑی خوبی یہ کہ چوبیس گھنٹے کا سفر چوبیس دن میں طے ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ فری ڈرنکس۔ میں تو پچھلے تیس سال سے لندن سے ہمیشہ بحری جہاز سے آتا ہوں

Afterall, a ship-wreck is much safer than an air-crash! Don't you agree?

مجھے یہ جان کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ تم بھی ہوائی جہاز سے الرجک ہو۔ آج سے تم خود کو بینک کا COVENANTED OFFICER سمجھو۔''

پسلی پھڑک اُٹھی نگہِ انتخاب کی

اس انٹرویو کو تیئس سال ہو گئے۔ ہمارا خیال کیا' پختہ یقین ہے کہ اس نے ہمیں بینک میں محض اس لیے ملازم رکھ لیا کہ ہمیں بھی ہوائی جہاز سے نفرت تھی۔ ہوائی کمپنی اور خدا ہمیں معاف کرے، ہمیں اس ایجاد سے ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ تادم تحریر ہم کسی ہوائی حادثے میں ہلاک نہیں ہوئے، جیسا کہ بہت سے ذہین قارئین نے اندازہ لگایا ہوگا لیکن کبھی کبھی احمقانہ فقرے سے بھی آدمی کے دن پھر جاتے ہیں' بشرطیکہ سننے والا بھی اس صنف سخت کا قدردان ہو۔ اینڈرسن کم و بیش نو سال پاکستان میں رہا لیکن لاہور محض اس لیے نہیں گیا کہ وہاں پانی کا جہاز نہیں جاتا۔ لاہور کو ''کنٹری سائیڈ'' کہتا تھا۔ حالانکہ اس کے اپنے آبائی گاؤں کی آبادی دو سو نفوس پر مشتمل تھی۔ نصف آبادی وہسکی بناتی اور بقیہ نصف اسے پیتی تھی۔ خیر' ہم ٹوکنے والے کون۔ کنویں کے مینڈک کو تالاب کے مینڈک کا مذاق اڑانے کا حق نہیں پہنچتا۔ ہم خود اندرون سانگانیری گیٹ' جے پور' کے رہنے والے تھے اور عرصہ دراز تک باقی ماندہ برصغیر کو OUTSIDE SNAGANERI GATE سمجھتے رہے۔

اس نے ہمیں تقرری مبارکباد دی۔ ہم نے بھی جی کھول کر اس کے حسن انتخاب کی داد دی۔ ابھی ہم نے انگریزی کا دوسرا جملہ اپنے خراد پر چڑھایا ہی تھا کہ اس نے پوچھا:

''اسکاٹ لینڈ کی کس چیز کی ساری دنیا میں دھوم ہے؟''

''بیگ پائپ میوزک، وہسکی اور کنجوسی۔''

''اور؟'' اس نے منھ بگاڑ کر پوچھا۔

''بل ٹیریر کتے، گاف کلب، KILT اور HAGGIS☆ ہم نے سب کچھ اُگل دیا۔ وہ انگارہ ہو گیا۔ ''معلوم ہوتا ہے تم نے اپنا سارا جنرل نالج ان گندے لطیفوں سے کشید کیا ہے جو انگریزوں نے اسکاٹ لینڈ کے بارے میں گھڑ رکھے ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسکاٹ لینڈ کا سب سے قیمتی سرمایہ، سب سے مشہور چیز تمہارے سامنے بیٹھی ہے...... اسکاٹ بینکر۔ ہمارا لوہا ساری دنیا مانتی ہے۔ ہم جب قرض دیتے ہیں تو اس میں سے سارا سود پیشگی مجرا کر کے دھروا لیتے ہیں۔ ہمارا سود کبھی نہیں ڈوبتا۔ اصل رقم بھلے ہی ڈوب جائے اور محتاط اور وہمی اتنے کہ جب تک یکم جنوری کے سورج کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں، اسکاٹ لینڈ میں کوئی شخص دیوار پر نئے سال کا کیلنڈر نہیں ٹانگتا۔ مجھے تو تمہاری خوش نصیبی پر رشک آ رہا ہے کہ تم ایک اسکاٹ بینکر سے اس پیشے کی ابجد سیکھو گے۔ اولین فرصت میں لندن سے RAE'S COUNTRY BANKER منگوا کر حفظ کر لو۔ ہمارے پیشے کی بائبل ہے۔ اس کے علاوہ لارڈ چیسٹر فیلڈ کے خطوط پڑھا کرو۔ دو سو سال سے ان کا شمار کلاسکس میں ہوتا ہے۔ پند و نصائح اور 'ورڈلی وزڈم' (فراست ارضی) سے بھرپور۔ اخلاقیات، نفسیات اور آداب مجلس کے بڑے باریک نکتے ملیں گے۔ خون جگر سے لکھی ہوئی یہ کتاب مجموعہ ہے ان خطوط کا جو اس نے تیس سال کی مدت میں اپنے NATURAL SON کو لکھے تھے۔ جانتے ہو انگریزی میں حرامی اولاد کو فطری بیٹا کہتے ہیں؟ اس لحاظ سے ہم تم غیر فطری اولاد ہوئے۔ ہاہاہا!''

اس کا موڈ بدل چکا تھا۔ ہم رخصت ہونے لگے تو اس کے کتے نے پھر اٹھ کر چوما چاٹی کی الوداعی رسوم ادا کیں اور دروازے تک دم اٹھائے مشایعت کو آیا۔ ہم دروازہ کھول کر نکلنے والے ہی تھے کہ ''جسٹ اے منٹ!'' کہہ کر واپس بلایا۔ رب العزت! اب کون سی کسر باقی رہ گئی؟ یہ اہانتوں کا ٹھیکرا جسے پاپی پیٹ کہتے ہیں، یہ تو کبھی کا بھر چکا۔

''اور اگر تم تھری پیس سوٹ پہن کر ہی بھرے دفتر میں کراچی اسٹیم باتھ لینے پر مصر ہو، جس کی وجہ

☆KILT مردوں کا گھٹنوں سے اوپر تک کا اسکرٹ جو صرف اسکاٹ لینڈ والے پہنتے ہیں۔

HAGGIS دل، کلیجی اور پھیپھڑے کو اوجھڑی میں بند کر کے دم پخت کرتے ہیں۔

اندر پھٹی قمیض بھی ہوسکتی ہے' ہاہاہا!...... تمہاری خوشامد مجھے مقصود نہیں' لیکن ایمان کی بات ہے، اس سے زیادہ WELL-DRESSED SCARE-CROW میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا...... اگر کچھ پہننا ہی ہے تو یہ شطرنج کی بساط جیسا چوخانے دار سوٹ اور میرے دیس کی ٹارٹن ٹائی پہن کر بینک نہ آنا۔ ساری دنیا میں بینکروں اور کسبیوں کا روایتی پہناوا سیاہ لباس ہے۔ سیاہ سوٹ پہنا کرو۔ ٹریڈ مارک!''

اور یوں ہماری زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ بلکہ بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس صفحہ پلٹنے کی آواز بھی دور دور تک سنائی دی۔ اگر ہم نے اپنے دانا دوست میاں محمد شفیع کے مشورے پر عمل کیا ہوتا تو آج ہم ایک ناکام سے بینکر کے بجائے ٹوٹا باسمتی چاول اور کریانا کے ناکام آڑھتی ہوتے۔

☆☆☆

حویلی

۱

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یادش بخیر! میں نے ۱۹۴۵ء میں جب قبلہ کو پہلے پہل دیکھا تو ان کا حلیہ ایسا ہو گیا تھا جیسا اب میرا ہے۔ لیکن ذکر ہمارے یارِ طرح دار بشارت علی فاروقی کے خسر کا ہے، لہٰذا تعارف کچھ انہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوگا۔ ہم نے بارہا سنا' آپ بھی سنیے:

''وہ ہمیشہ سے میرے کچھ نہ کچھ لگتے تھے۔ جس زمانے میں میرے خسر نہیں بنے تھے تو پھوپا ہوا کرتے تھے۔ اور پھوپا بننے سے پہلے میں انہیں چچا حضور کہا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی یقیناً وہ کچھ اور لگتے ہوں گے' مگر اس وقت میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں مراد آباد اور کانپور میں رشتے ناتے اُبلی ہوئی سویوں کی طرح اُلجھے اور پیچ در پیچ گتھے ہوتے ہیں۔ ایسا جلالی' ایسا مغلوب الغضب آدمی زندگی میں نہیں دیکھا۔ بارے ان کا انتقال ہوا تو میری عمر آدھی اِدھر' آدھی اُدھر' چالیس کے لگ بھگ تو ہوگی۔ لیکن صاحب! جیسی دہشت ان کی آنکھیں دیکھ کر چھٹپن میں ہوتی تھی' ویسی ہی نہ صرف ان کے آخری دم تک رہی' بلکہ میرے آخری دم تک بھی رہے گی۔ بڑی بڑی آنکھیں اپنے ساکٹ سے نکلی پڑتی تھیں۔ لال سرخ۔ ایسی ویسی؟ بالکل خون کبوتر! لگتا تھا بڑی بڑی پتلیوں کے گرد لال ڈوروں سے ابھی خون کے فوارے چھوٹنے لگیں گے اور میرا منہ خونم خون ہو جائے گا۔ ہر وقت غصے میں بھرے رہتے تھے۔ جنے کیوں۔ گالی ان کا تکیہ کلام تھی۔ اور جو رنگ تقریر کا تھا وہی تحریر کا۔ رکھ ہاتھ نکلتا ہے دھواں مغزِ قلم سے۔ ظاہر ہے کچھ ایسے لوگوں سے بھی پالا پڑتا تھا جنہیں بوجوہ گالی نہیں دے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر زبان سے تو کچھ نہ کہتے' لیکن چہرے پر ایسا ایکسپریشن لاتے کہ قدِ آدم گالی نظر آتے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتا۔ اختلاف تو درکنار' اگر کوئی شخص محض ڈر کے مارے ان کی رائے سے اتفاق کر لیتا تو فوراً اپنی رائے تبدیل کر کے اُلٹے اس کے سر ہو جاتے۔

ارے صاحب! بات اور گفتگو تو بعد کی بات ہے۔ بعض اوقات محض سلام سے مشتعل ہو جاتے

تھے! آپ کچھ بھی کہیں، کیسی ہی سچی اور سامنے کی بات کہیں، وہ اس کی تردید ضرور کریں گے۔ کسی کی رائے سے اتفاق کرنے میں اپنی سبکی سمجھتے تھے۔ ان کا ہر جملہ ''نہیں' سے شروع ہوتا تھا۔ ایک دن کانپور میں کڑاکے کی سردی پر رہی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ' آج بڑی سردی ہے' بولے' نہیں۔ کل اس سے زیادہ پڑے گی'۔

''وہ چچا سے پھوپا بنے اور پھوپا سے خسر الحذر' لیکن مجھے آخر وقت تک نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ نکاح کے وقت وہ قاضی کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ قاضی نے مجھ سے پوچھا' قبول ہے؟' ان کے سامنے منہ سے ہاں کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ بس اپنی تھوڑی سے دو مودبانہ ٹھونگیں ماردیں جنہیں قاضی اور قبلہ نے رشتہ مناکحت کے لئے ناکافی سمجھا۔ قبلہ کڑک کر بولے' لونڈے! بولتا کیوں نہیں؟ ڈانٹ سے میں نروس ہوگیا۔ ابھی قاضی کا سوال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ میں نے' جی ہاں! قبول ہے' کہہ دیا۔ آواز یکلخت اتنے زور سے نکلی کہ میں خود چونک پڑا۔ قاضی اُچھل کر سہرے میں گھس گیا۔ حاضرین کھلکھلا کے ہنسنے لگے۔ اب قبلہ اس پر بھنا رہے ہیں کہ اتنے زور کی' ہاں' سے بیٹی والوں کی ہیٹی ہوتی ہے۔ بس تمام عمر ان کا یہی حال رہا۔ اور تمام عمر میں کرب قرابت داری و قربت قہری دونوں میں مبتلا رہا۔

''حالانکہ اکلوتی بیٹی' بلکہ اکلوتی اولاد تھی۔ اور بیوی کو شادی کے بڑے ارمان تھے، لیکن قبلہ نے مائیوں کے دن عین اس وقت جب میرا رنگ نکھارنے کے لئے ابٹن ملا جارہا تھا' کہلا بھیجا کہ دولہا میری موجودگی میں اپنا منہ سہرے سے باہر نہیں نکالے گا۔ دو سو قدم پہلے سواری سے اتر جائے گا او پیدل چل کر عقد گاہ تک آئے گا۔ عقد گاہ انہوں نے اس طرح کہا جیسے اپنے فیض صاحب قتل گاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قبلہ کی دہشت دل میں ایسی بیٹھ گئی تھی کہ مجھے تو عروسی چھپر کھٹ بھی پھانسی گھاٹ لگ رہا تھا۔ انہوں نے یہ شرط بھی لگائی کہ براتی پلاؤ زردہ ٹھونسنے کے بعد یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ گوشت کم ڈالا اور شکر ڈیوڑھی نہیں پڑی۔ خوب سمجھ لو' میری حویلی کے سامنے بینڈ باجا ہرگز نہیں بجے گا۔ اور تمہیں رنڈی نچوانی ہے تو' Over my dead body اپنے کوٹھے پر نچواؤ۔

''کسی زمانے میں راجپوتوں اور عربوں میں لڑکی کی پیدائش نحوست اور قہر الٰہی کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ ان کی غیرت یہ کیسے گوارہ کرسکتی تھی کہ ان کے گھر برات چڑھے۔ داماد کے خوف سے وہ نوزائیدہ لڑکی کو زندہ گاڑ آتے تھے۔ قبلہ اس وحشیانہ رسم کے خلاف تھے۔ وہ داماد کو زندہ گاڑ دینے کے حق میں تھے۔

"چہرے، چال اور تیور سے کوتوال شہر لگتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ بانس منڈی میں ان کی عمارتی لکڑی کی ایک معمولی سی دکان ہے۔ نکلتا ہوا قد۔ چلتے تو قد، سینہ اور آنکھیں، تینوں بیک وقت نکال کر چلتے تھے۔ ارے صاحب! کیا پوچھتے ہیں۔ اول تو ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور کبھی جی کڑا کر کے دیکھ بھی لیا تو بس لال بھبوکا آنکھیں ہی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد۔ رنگ گندمی، آپ جیسا، جسے آپ اس گندم جیسا بتاتے ہیں جسے کھاتے ہی حضرت آدمؑ بیک بیوی و دو گوش جنت سے نکال دیے گئے۔ جب دیکھو جھلاتے تنتناتے رہتے۔ مزاج، زبان اور ہاتھ کسی پر قابو نہ تھا۔ دائمی طیش سے لرزہ براندام رہنے کے سبب اینٹ، پتھر، لاٹھی، گولی، گالی کسی کا بھی نشانہ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ گچھی گچھی مونچھیں جنہیں گالی دینے سے پہلے اور بعد میں تاؤ دیتے۔ آخری زمانے میں بھوؤں کو بھی بل دینے لگے۔ گٹھا ہوا کسرتی بدن ململ کے کرتے سے جھلکتا تھا۔ چنی ہوئی آستین اور اس سے بھی مہین چنی ہوئی دو پلی ٹوپی۔ گرمیوں میں خس کا عطر لگاتے۔ کیکری کی سلائی کا چوڑی دار پاجامہ۔ چوڑیوں کی یہ کثرت کہ پاجامہ نظر نہیں آتا تھا۔ دھوبی الگنی پر نہیں سکھاتا تھا۔ علٰحدہ بانس پر دستانے کی طرح چڑھا دیتا تھا۔ آپ رات کے دو بجے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر بلائیں تو چوڑی دار ہی میں برآمد ہوں گے۔

واللہ! میں تو یہ تصور کرنے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا کہ دائی نے انہیں چوڑی دار کے بغیر دیکھا ہوگا۔ بھری بھری پنڈلیوں پر خوب کھبتا تھا۔ ہاتھ کے بنے ریشمی ازار بند میں چابیوں کا گچھا چھنچھناتا رہتا۔ جو تالے برسوں پہلے بیکار ہوگئے تھے ان کی چابیاں بھی اس گچھے میں محفوظ تھیں۔ حد یہ کہ اس تالے کی بھی چابی تھی جو پانچ سال پہلے چوری ہوگیا تھا۔ محلے میں اس چوری کا برسوں چرچا رہا، اس لیے کہ چور صرف تالا، پہرہ دینے والا کتا اور ان کا شجرۂ نسب چرا کر لے گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ اتنی ذلیل چوری صرف کوئی عزیز رشتے دار ہی کرسکتا ہے۔ آخری زمانے میں یہ ازار بندی گچھا بہت وزنی ہوگیا تھا اور موقع بے موقع فلمی گیت کے بازو بند کی طرح کھل کھل جاتا۔ کبھی جھک کر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے تو دوسرے ہاتھ سے ازار بند تھامتے۔ مئی جون میں ٹمپریچر ۱۱۲ ہو جاتا اور منہ پر لو کے تھپڑے پڑنے لگتے تو پاجامے سے ایئر کنڈیشننگ کر لیتے۔ مطلب یہ کہ چوڑیوں کو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں بھگو کر، سر پر انگوچھا ڈالے۔ تربوز کھاتے۔ خس خانہ و برفاب کہاں سے لاتے۔ اس کے محتاج بھی نہ تھے۔ کتنی ہی گرمی پڑے، دکان بند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے، میاں! یہ تو بزنس، پیٹ کا دھندا ہے۔ جب چمڑے کی جھونپڑی (پیٹ) میں آگ لگ رہی ہو تو کیا گرمی کیا سردی۔ لیکن ایسے میں

کوئی شامت کا مارا گاہک آنکلے تو برا بھلا کہہ کے بھگادیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کھچا کھچا دوبارہ انہی کے پاس آتا تھا۔ اس لئے کہ جیسی عمدہ لکڑی وہ بیچتے تھے، ویسی سارے کانپور میں کہیں نہیں ملتی تھی۔ فرماتے تھے، داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی۔ لکڑی اور داغ دار؟ داغ تو دو ہی چیزوں پر سجتا ہے۔ دل اور جوانی۔

لفظ کے لچھن اور بازاری پان

''تمباکو' قوام' خربوزے اور کڑھے ہوئے کرتے لکھنو سے، حقہ مراد آباد اور تالے علی گڑھ سے منگواتے تھے۔ حلوہ سوہن اور ڈپٹی نذیر احمد والے محاورے دلی سے۔ دانت گرنے کے بعد صرف محاوروں پر گزارہ تھا۔ گالیاں البتہ مقامی بلکہ خانہ ساز دیتے جن میں سلاست و روانی پائی جاتی تھی۔ طبع زاد لیکن بلاغت سے خالی۔ بس جغرافیہ سا کھینچ دیتے تھے۔ سلیم شاہی جوتیاں اور چنری آپ کے جے پور سے منگواتے تھے۔ صاحب! آپ کا راجستھان بھی خوب تھا۔ کیا کیا سوغاتیں گنوائی تھیں اس دن آپ نے؟ .... کھانڈ' سانڈ' بھانڈ اور رانڈ۔ اور یہ بھی خوب رہی کہ مارواڑیوں کو جس چیز پر بھی پیار آتا ہے اس کے نام میں ٹھ، ڈ اور ڑ لگا دیتے ہیں۔ مگر یہ بات آپ نے عجیب بتائی کہ راجستھان میں رانڈ سے مراد خوبصورت عورت ہوتی ہے۔ مارواڑی زبان میں سچ مچ کی بیوہ کے لئے بھی کوئی لفظ ہے کہ نہیں؟ یا سبھی خوبصورت نور علی نور بلکہ حور علیٰ حور ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ سوسوا سو سال قبل تک رنڈی سے بھی مراد صرف عورت ہوتی تھی۔ جب سے مردوں کی نیتیں خراب ہوئیں' اس لفظ کے لچھن بھی بگڑ گئے۔ صاحب! راجستھان کے تین طرفہ تحفوں کے تو ہم بھی قائل اور گھائل ہیں۔ میرا بائی' مہدی حسن اور ریشماں۔

''ہاں' تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ باہر نکلتے تو ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور بٹوہ رہتا۔ بازار کا پان ہرگز نہیں کھاتے تھے۔ کہتے تھے، بازاری پان صرف رنڈوے' تماشبین اور بمبئی والے کھاتے ہیں۔ صاحب، یہ نفاست اور پرہیز میں نے انہی سے سیکھا۔ ڈبیا چاندی کی۔ نقشین۔ بھاری۔ ٹھوس۔ اس میں جگہ جگہ ڈینٹ نظر آتے تھے جو انسانی سروں سے تصادم کے باعث پڑے تھے۔ طیش میں اکثر پانوں بھری ڈبیا پھینک مارتے۔ بڑی دیر تک تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ مضروب کے سر اور چہرے سے خون نکل رہا ہے یا بکھرے پانوں کی لالی نے غلط جگہ رنگ جمایا ہے۔ بٹوے خاص طور سے آپ کی جائے پیدائش' ریاست ٹونک سے منگواتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہاں کے پٹوے ایسے ڈورے ڈالتے ہیں کہ اک ذرا گھنڈی کو جھوٹوں ہاتھ لگا دو تو بٹوہ آپی آپ مصاحبوں کی باچھوں کی طرح کھلتا چلا جاتا ہے۔ گنکا بھوپال سے آتا تھا۔ لیکن خود نہیں کھاتے تھے۔ فرماتے تھے، میٹھا پان' ٹھمری' گنکا اور ناول۔ یہ سب نابالغوں کے شغل

ہیں۔ شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ردیف قافیے سے آزاد شاعری سے بطوری خاص پڑتے تھے۔ یوں بھی بقول شخصے آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اردو فارسی کے جتنے بھی اشعار لکڑی، آگ، دھوئیں، ہیکڑی، لڑمرنے، ناکامی اور خواری سے متعلق ہیں سب یاد کر رکھے تھے۔ صورت حال کبھی قابو سے باہر ہوجاتی تو شعر سے اس کا دفعیہ فرماتے۔ آخری زمانے میں عزت گزیں اور مردم بیزار ہو گئے تھے اور صرف دشمنوں کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے باہر نکلتے تھے۔ خود کو کاسنی اور بیوی کو موتیا رنگ پسند تھا۔ شیروانی ہمیشہ موتیا رنگ کے ٹسر کی پہنی"۔

واہ کیا بات کورے برتن کی

بشارت کی زبان تعارف ختم ہوا۔ اب کچھ میری، کچھ ان کی زبان سینے اور رہی سہی، زبان خلق سے جسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

کانپور میں پہلے بانس منڈی اور پھر کوپر گنج میں قبلہ کی عمارتی لکڑی کی دکان تھی۔ اسی کو آپ ان کا حیلہ معاش اور وسیلہ مردم آزاری کہہ سکتے ہیں۔ تھوڑی بہت جلانے کی لکڑی بھی رکھتے تھے مگر اسے کبھی لکڑی نہیں کہا۔ سوختہ یا ہیزم سوختنی کہتے تھے۔ ان کی دکان کو کبھی کوئی نا آشنائے مزاج ٹال کہہ دیتا تو دوسیری لے کر دوڑتے۔ جوانی میں پنسیری لے کر دوڑتے تھے۔ تمام عمر پتھر کے باٹ استعمال کئے۔ فرماتے تھے لوہے کی فرنگی باٹ بھاری اور بے برکت ہوتے ہیں۔ پتھر کے باٹ کو بازوؤں میں بھر کے سینے سے لگا کے اٹھانا پڑتا ہے۔ اعمال تو دور رہے، کبھی کسی کو یہ جرات نہ ہوئی کہ ان کے پتھر کے باٹوں ہی کو تلوا کر دیکھ لے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی دی ہوئی رقم یا لوٹائی ہوئی ریزگاری کو گن کر دیکھے۔ اس زمانے میں، یعنی اس صدی کی تیسری دہائی میں عمارتی لکڑی کی کھپت بہت کم تھی۔ 'سال' اور چیڑ کا رواج عام تھا۔ بہت ہوا تو چوکھٹ اور دروازے شیشم کے بنوالئے۔ ساگوان تو صرف امراء رؤسا کی ڈائننگ ٹیبل اور گوروں کے تابوت میں استعمال ہوتی تھی۔ فرنیچر ہوتا ہی کہاں تھا۔ بھلے گھروں میں فرنیچر کے ذیل میں صرف چار پائی آتی تھی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، ان دنوں کرسی صرف دو موقعوں پر نکالی جاتی تھی۔ اول، جب حکیم، وید، ہومیو پیتھ، پیر، فقیر اور سیانوں سے مایوس ہو کر ڈاکٹر کو گھر بلایا جائے۔ اس پر بیٹھ کر وہ جگہ جگہ اسٹے تھس کوپ لگا کر دیکھتا کہ مریض اور موت کے درمیان جو خلیج حائل تھی اسے ان حضرات نے اپنی دواؤں اور تعویذ گنڈوں سے کس حد تک پُر کیا ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جس گھر میں موسمبی یا مہین لکڑی کی پٹاری میں روئی میں رکھے ہوئے پانچ انگور آئیں، یا سولا ہیٹ پہنے ڈاکٹر آئے (اور اس کے آگے آگے ہٹو بچو کرتا ہوا تیمار دار خصوصی اس کا چمڑے کا بیگ اٹھائے) تو اڑوس پڑوس والے جلدی جلدی کھانا کھا کر خود کو تعزیت اور کندھا دینے کے لئے تیار کر لیتے تھے۔ درحقیقت ڈاکٹر کو صرف اس مرحلے پر بلا کر اس

کرسی پر بٹھایا جاتا تھا جب وہ صورت حال پیدا ہو جائے جس میں دو ہزار سال پہلے لوگ حضرت عیسیٰ کو آزماتے تھے۔ کرسی کے استعمال کا دوسرا اور آخری موقع ہمارے یہاں ختنوں پر آتا تھا۔ جب لڑکے کو دولہا کی طرح سجا بنا کر اور مٹی کا کھلونا ہاتھ میں دے کر اس کرسی پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ اس جلادی کرسی کو دیکھ کر اچھے اچھوں کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ غریبوں میں اس مقصد کے لئے نئے ماٹ یا لمبی وضع کے کورے مٹکے ☆ کو الٹا کر کے سرخ کپڑا ڈال دیتے تھے۔

چار پائی

سچ تو یہ ہے کہ جہاں چار پائی ہو وہاں کسی فرنیچر کی ضرورت، نہ گنجائش، نہ تک۔ انگلستان کا موسم اگر اتنا ذلیل نہ ہوتا اور انگریزوں نے بروقت چار پائی ایجاد کر لی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ وہ موجودہ فرنیچر کی کھکھیڑ سے بچ جاتے، بلکہ پھر آرام دہ چار پائی چھوڑ کر، کالونیز بنانے کی خاطر، گھر سے باہر نکلنے کو بھی ان کا دل نہ چاہتا۔ ''اوور ورکڈ'' سورج بھی ان کی سلطنت پر ایک صدی تک ہمہ وقت چمکتے رہنے کی ڈیوٹی سے بچ جاتا۔ اور کم از کم آج کل کے حالات میں اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہنے کے لئے ان کے گھر میں کوئی ڈھنگ کی چیز تو ہوتی۔ ہم نے ایک دن پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی سے کہا کہ بقول آپ کے، انگریز تمام ایجادات کے موجد ہیں۔ آسائش پسند، بے حد پریکٹیکل لوگ ہیں۔ حیرت ہے چار پائی استعمال نہیں کرتے! بولے، ادوان کسنے سے جان چراتے ہیں! راقم الحروف کے خیال میں، ایک بنیادی فرق ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ یوروپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لئے ہوتا ہے، جب کہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں۔ مثال میں دری، گدیلے، قالین، جازم، چاندنی، چار پائی، کوچہ یار اور پہلوئے دلدار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک چیز ہمارے ہاں البتہ ایسی تھی جسے صرف بیٹھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے حکمرانوں کا تخت کہتے تھے۔ لیکن جب انہیں اسی پر لٹا کر اور پھر لٹا کر نہلا دیا جاتا تو یہ تختہ کہلاتا تھا اور اس عمل کو تختہ الٹنا کہتے تھے۔

اسٹیشن، لکڑ منڈی اور بازارِ حسن میں بجوگ

☆ کورے مٹکے کا ذکر آیا تو نوکِ قلم پر بے اختیار نظیر اکبر آبادی کا شعر آ رہا ہے جسے نقل کئے بغیر رہا نہیں جاتا:

تازگی دل کی اور تری تن کی　　واہ کیا بات کورے برتن کی

نظیر اکبر آبادی کی کیا بات ہے۔ کوئی سی نظم اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ انہیں جہاں کہیں قدرت کی کاریگری یا خدا کی شان نظر آ جاتی ہے، وہیں پائے بتاں پہ سر بسجود ہو کر ثنائی سراپا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پنہاری کے سر پر کورا مٹکا دیکھا تو ردیف قافیے کی کانی اوٹ لے کر سارے سراپا کو نظروں سے کھوند ڈالا۔ پھر تو ''اس کا جوبن کچھ اور ہی مٹکا'' اس میں وہ اپنے دل اور قافیے کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جہاں وہ لے جائیں، چاؤ سے جاتے ہیں۔ حد یہ کہ گھڑونچی اور لوٹا دیکھ کر صبر و قرار و قافیہ ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ دل میں خیالات فاسد پیدا ہونے لگتے ہیں۔

کوری ٹھلیا پہ دیکھ کر لوٹا　　دل لگا ہونے کچھ کھرا کھوٹا

اس میں بچارے (ٹونٹی دار؟) لوٹے کا بظاہر صرف اتنا قصور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے معشوق سے مشابہت رکھتا ہے۔

مقصد اس تمہید غیر دل پذیر کا یہ کہ جہاں چارپائی کا چلن ہو وہاں فرنیچر کی بزنس پنپ نہیں سکتی۔ اب اسے چوب عمارتی کہیے یا ہیزم غیر سوختنی' دھندا اس کا بھی ہمیشہ مندا ہی رہتا تھا کہ دکانوں کی تعداد گاہکوں سے زیادہ تھی۔ لہٰذا کوئی شخص ایسا نظر آجائے جو حلیے اور چال ڈھال سے ذرا بھی گاہک معلوم ہو تو لکڑ منڈی کے دوکاندار اس پر ٹوٹ پڑتے۔ بیشتر گاہک گردونواح دیہاتی ہوتے جو زندگی میں پہلی اور آخری بار لکڑی خریدنے کانپور آتے تھے۔ ان بچاروں کا لکڑی سے دو ہی مرتبہ سابقہ پڑتا تھا۔ ایک' اپنا گھر بناتے وقت۔ دوسرے' اپنا کریا کرم کرواتے سمے۔ قیام پاکستان سے پہلے جن پڑھنے والوں نے دلی یا لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا نقشہ دیکھا ہے' وہ اس چھینا جھپٹی کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۵ میں ہم نے دیکھا کہ دلی سے لاہور آنے والی ٹرین کے رکتے ہی جیسے ہی مسافر نے اپنے جسم کا کوئی حصہ دروازے یا کھڑکی سی باہر نکالا' قلی نے اسی کو مضبوطی سے پکڑ کے سالم مسافر کو ہتھیلی پر رکھا اور ہوا میں ادھر اٹھا لیا۔ اور اٹھا کر پلیٹ فارم پر کسی صراحی یا حقے کی چلم پر بٹھا دیا۔ لیکن جو مسافر دوسرے مسافروں کے دھکے سے خود بخود ڈبے سے باہر نکل پڑے' ان کا حشر ویسا ہی ہوا جیسا اُردو کی کسی نئی نویلی کتاب کا نقادوں کے ہاتھ ہوتا ہے۔ جو چیز جتنی بھی جس کے ہاتھ لگی' سر پر رکھ کر ہوا ہو گیا۔ دوسرے مرحلے میں مسافر پر ہوٹلوں کے دلال اور ایجنٹ ٹوٹ پڑتے۔ سفید ڈرل کا کوٹ پتلون' سفید قمیص' سفید رومال' سفید کینوس کے جوتے' سفید موزے' سفید دانت۔ اس کے باوجود محمد حسین آزاد کے الفاظ میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ ان کی ہر چیز سفید اور اجلی ہوتی' سوائے چہرے کے۔ ہنستے تو معلوم ہوتا توا ہنس رہا ہے۔ یہ مسافر پر اس طرح گرے جیسے انگلستان میں رگبی کی گیند اور ایک دوسرے پر کھلاڑی گرتے ہیں۔ ان کی ساری تگ و دو کا مقصد خود کچھ حاصل کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو حاصل کرنے سے باز رکھنا ہوتا تھا۔ مسلمان دلال ترکی ٹوپی سے پہچانے جاتے۔ وہ دلی اور یوپی سے آنے والے مسلمان مسافروں کو ٹونٹی دار لوٹے' مستورات' کثرت اطفال اور قیمے پراٹھے کے بھبکے سے فوراً پہچان لیتے اور ''السلام علیکم Brother in Islam'' کہہ کر لپٹ جاتے۔ مسلمان مسافروں کے ساتھ صرف مسلمان دلال ہی دھینگا مشتی کر سکتے تھے۔ جس دلال کا ہاتھ مسافر کے کپڑوں کے مضبوط ترین حصے پر پڑتا وہی اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آتا۔ جن کا ہاتھ لباس کے کمزور یا بوسیدہ حصوں پر پڑتا' وہ بعد میں ان کو بطور دستی رومال استعمال کرتے۔ نیم ملبوس مسافر قدم قدم پر اپنی ستر کشائی کرواتا' اسٹیشن کے باہر قدم رکھتا تو لاتعداد پہلوان جنہوں نے اکھاڑے کو ناکافی محسوس کر کے تانگہ چلانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا خود کو اس پر چھوڑ دیتے۔ اگر مسافر کے تن پر کوئی چیتھڑا اتفاقاً بچ رہا تو اسے بھی نوچ کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر راجپوت رجی کی کھڑاؤں کی طرح سجا دیتے۔ اگر کسی کے چوڑی دار کے کمر بند کا سرا تانگے والے کے ہاتھ لگ

جاتا تو وہ غریب گرہ پہ ہاتھ رکھے اسی میں بندھا چلا آتا۔ کوئی مسافر کا دامن آگے سے کھینچتا' کوئی پیچھے سے زلیخائی کرتا۔ آخری راؤنڈ میں ایک تگڑا سا تانگے والا سواری کا دایاں ہاتھ اور دوسرا مسٹنڈا اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کے tug of war کھیلنے لگتے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہر دو فریقین اپنے اپنے حصے کی ران اور دوست اکھیڑ کر لے جائیں' ایک تیسرا پھرتیلا تانگے والا ٹانگوں کے چرے ہوئے چمٹے کے نیچے بیٹھ کر مسافر کو یکلخت اپنے کندھوں پر اٹھالیتا اور تانگے میں جوت کر ہوا ہو جاتا۔

کم و بیش یہی نقشہ کوپر گنج کی لکڑ منڈی کا ہوا کرتا تھا' جس کے قلب میں قبلہ کی دکان تھی۔ گودام بالعموم دکان سے ملحق' عقب میں ہوتے تھے۔ گاہک پکڑنے کے لئے قبلہ اور دو تین چڑیمار دکانداروں نے یہ کیا کہ دکانوں کے باہر سڑک پر لکڑی کے چھوٹے کیبن بنالیے۔ قبلہ کا کیبن مسند تکیے' حقے' اگالدان اور اسپرنگ سے کھلنے والے چاقو سے آراستہ تھا۔ کیبن گویا ایک نوع کا چمان تھا جہاں سے گاہک کو مار گراتے تھے۔ پھر اسے چمکار پچکار کر اندر لے جایا جاتا جہاں کوشش یہ ہوتی تھی کہ خالی ہاتھ اور بھری جیب واپس نہ جانے پائے۔ جیسے ہی کوئی شخص جو قیافے سے گاہک لگتا' سامنے سے گزرتا تو دور و نزدیک کے دکاندار اسے ہاتھ کے اشارے سے یا آواز دے کر بلاتے'' مہاراج! مہاراج!'' ان مہاراجوں کو دوسرے دکانداروں کے پنجے سے چھڑانے اور خود گھسیٹ کر اپنے کچھار میں لے جانے کے دوران اکثر ان کی پگڑیاں کھل کر پیروں میں الجھ جاتیں۔ اس سلسلے میں آپس میں اتنے جھگڑے اور ہاتھا پائی ہو چکی تھی کہ منڈی کے تمام بیوپاریوں نے پنچایتی فیصلہ کیا کہ گاہک کو صرف وہی دکاندار آواز دے کر بلائے گا جس کی دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا ہو۔ لیکن جیسے ہی وہ کسی دوسرے دکاندار کے حلقۂ تشدد میں داخل ہوگا تو اسے کوئی اور دکاندار ہرگز آواز نہ دے گا۔ اس کے باوجود چھینا جھپٹی اور کستم پچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو ہر دکان کے آگے چونے سے حد بندی کی لائن کھینچ دی گئی۔ اس سے یہ فرق پڑا کہ کشتی بند ہوگئی۔ کبڈی ہونے لگی۔ بعض دکانداروں نے مار پیٹ' گاہکوں کا ہانکا کرنے اور انہیں ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لانے کے لئے بگڑے پہلوان اور شہر کے چھٹے ہوئے شہدے اور مسٹنڈے پارٹ ٹائم ملازم رکھ لئے تھے۔ کساد بازاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ لوگ دن میں لکڑ منڈی میں گاہکوں کو ڈرا دھمکا کر ناقص اور کنڈم مال خریدواتے اور رات کو یہی فریضہ بازار حسن میں انجام دیتے۔ بہت سی طوائفوں نے اپنی آبرو کو ہر شب زیادہ سے زیادہ غیر محفوظ رکھنے کی غرض سے ان کو بطور ''پمپ'' ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ قبلہ نے اس قسم کا کوئی غنڈا یا بدکردار پہلوان ملازم نہیں رکھا کہ انہیں اپنے زور بازو پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن اوروں کی طرح مال کی چرائی کٹائی میں مارکٹائی کا خرچہ بھی شامل کر لیتے تھے۔

آلات اخراج خون: جونک' سینگی' لاٹھی

ہمہ وقت طیش کا عالم طاری رہتا تھا۔ سونے سے پہلے ایسا موڈ بنا کر لیتے کہ آنکھ کھلتے ہی غصہ کرنے میں آسانی ہو۔ پیشانی کے تین بل سوتے میں بھی نہیں مٹتے تھے۔ غصے کی سب سے خالص قسم وہ ہوتی ہے جو کسی اشتعال کی محتاج نہ ہو یا کسی بہت ہی معمولی سی بات پر آجائے۔ غصے کے آخر ہوتے ہوتے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ آیا کس بات پر تھا۔ بیوی ان کو روزہ نہیں رکھنے دیتی تھیں۔ غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن عشا کی نماز کے بعد گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی دیرینہ پریشانیاں دور ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ ایک تازہ پریشانی کا خیال آتے ہی ایک دم جلال آگیا۔ دعا ہی میں کہنے لگے کہ تو نے میری پرانی پریشانیاں ہی کون سے رفع کر دیں جو اب یہ نئی پریشانی دور کرے گا۔ اس رات مصلاتہ کرنے کے بعد پھر کبھی نماز نہیں پڑھی۔

ان کے غصے پر یاد آیا کہ اس زمانے میں کن میلئے محلوں بازاروں میں پھیری لگاتے تھے۔ کان کا میل نکالنے پر ہی کیا موقوف' دنیا جہاں کے کام گھر بیٹھے ہو جاتے تھے۔ سبزی' گوشت اور سودا سلف کی خریداری' حجامت' تعلیم' زچگی' پیڑھی' کھاٹ کھٹولے کی .... یہاں تک کہ خود اپنی مرمت بھی سب گھر بیٹھے ہو جاتی۔ بیبیوں کے ناخن نہرنی سے کاٹنے اور پیٹھ ملنے کے لئے نائنیں گھر آتی تھیں۔ کپڑے بھی مغلانیاں گھر آ کر سیتی تھیں تا کہ نامحرموں کو ناپ تک کی ہوا نہ لگے۔ حالانکہ اس زمانے کی زنانہ پوشاک کے جو نمونے ہماری نظر سے گزرے ہیں وہ ایسے ہوتے تھے کہ کسی بھی لیٹر بکس کا ناپ لے کر سئے جا سکتے تھے۔ غرض کہ سب کام گھر ہی میں ہو جاتے۔ حد یہ کہ موت تک گھر میں واقع ہوتی تھی۔ اس کے لئے باہر جا کر کسی ٹرک سے اپنی روح قبض کروانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ فسادِ خون سے کسی کے بار بار پھوڑے پھنسی نکلیں' یا دماغ میں خیالات فاسدہ کا ہجوم دن دہاڑے بھی رہنے لگے تو گھر پر ہی فصد کھول دی جاتی تھی۔ فاضل و فاسد خون نکلوانے کی غرض سے اپنا سر پھڑوانے یا پھوڑنے کے لئے کسی سیاسی جلسے میں جانے یا حکومت کے خلاف مظاہرہ کر کے لاٹھی کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس زمانے میں لاٹھی کو آلہ اخراج خون کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ جونک اور سینگی ☆ لگانے والی کنجریاں روز پھیری لگاتی تھیں۔ اگر اس زمانے کے کسی حکیم کا ہاتھ آج کل کے نوجوانوں کی نبض پر پڑ جائے تو کوئی نوجوان ایسا نہ بچے جس کے جہاں تہاں سینگی لگی نظر نہ آئے۔ رہے ہم جیسے آج کل کے بزرگ کہ

کی جس سے بات اس کو ہدایت ضرور کی

تو کوئی بزرگ ایسا نہ بچے گا جس کی زبان پر حکیم صاحبان جونک نہ لگوا دیں۔

☆ سینگی' درد یا فساد خون کے مقام پر ہلکا سا شگاف لگایا جاتا تھا۔ سوراخ کئے ہوئے سینگ کے بڑے دہانے کو اس پر رکھ کر اور سوراخ والے سہرے کو منہ سے لگا کر سارا فاسد و غیر فاسد خون کھینچ لیا جاتا تھا۔ اس عمل کو یونانی طب کی اصطلاح میں سینگی لگانا اور اردو شاعری میں قافیہ کہتے ہیں۔

ہم واقعہ یہ بیان کرنے چلے تھے کہ گرمیوں کے دن تھے۔ قبلہ ادلے کا قورمہ اور خربوزہ تناول فرما کر کیبن میں قیلولہ کررہے تھے کہ اچانک کن میلیئے نہ کیبن کے دروازے پر بڑے زور سے آواز لگائی ''کان کا میل''۔ خدا جانے میٹھی نیند سو رہے تھے یا کوئی بہت ہی حسین خواب دیکھ رہے تھے جس میں گاہک ان سے تنگنے داموں دھڑا دھڑ لکڑی خرید رہے تھے۔ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ایک دفعہ تو دہل گئے۔ چق کے پاس پڑی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس کے پیچھے ہولئے۔ کمینے کی یہ جرأت کہ ان کے کان سے فقط ایک گز دور بلکہ پاس ایسے گستاخانہ طریقے سے چیخے۔ یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے یہ۔ اس لئے کہ قبلہ غصے میں ایسے بھرے ہوئے تھے کہ کبھی کبھی اس سے آگے بھی نکل جاتے۔ سڑک پر کچھ دور بھاگنے کے بعد کن میلیا گلیوں میں نکل گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ مگر قبلہ محض اپنی چھٹی حس کی بتائی ہوئی سمت دوڑتے رہے اور یہ وہ سمت تھی جس طرح کوئی شخص جس کے پانچوں حواس سلامت ہوں' جارحانہ انداز میں لکڑی لاٹھی گھماتا ہرگز نہ جاتا کہ یہ تھانے کی طرف جاتی تھی۔ اس وحشیانہ دوڑ میں قبلہ کی لکڑی اور کن میلیئے کا پگڑ جس کے ہر پیچ میں اس نے میل نکالنے کے اوزار اُڑس رکھے تھے، زمین پر گر گیا۔ اس میں سے ایک ڈبیا بھی نکلی جس میں اس نے کان کا میل جمع کر رکھا تھا۔ نظر بچا کر اسی میں سے تولہ بھر میل نکال کر رکھا دیتا کہ دیکھو' یہ تمہارے کان سے نکلا ہے۔ کسی کے کان سے گولر کے بھنگے برآمد کر کے کہتا کہ تمہارے کان میں جو بھن بھن تن تن کی آوازیں آرہی تھیں وہ انہیں کی تھیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ کان کی بھول بھلیوں میں اتنی دور تک سج سج سلائی ڈالتا چلا جاتا کہ محسوس ہوتا ابھی کان کے راستے آنتیں بھی نکال کر...... ص 42 کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ قبلہ نے اس پگڑ کو بلی پر چڑھا کر بلی اپنی کیبن کے سامنے اس طرح گاڑ دی جس طرح اگلے وقتوں میں کوئی بے صبرا ولی عہد' یا وہ نہ ہو تو پھر کوئی دشمن' بادشاہ سلامت کا سر کاٹ کر نیزے پر ہر خاص و عام کی اطلاع کے لئے بلند کر دیتا تھا۔ اس کی دہشت ایسی بیٹھی کہ دکان کے سامنے سے بڑھئی' کھٹ بنے' سینگی لگانے والیوں اور سحری کے لئے جگانے والوں نے بھی نکلنا چھوڑ دیا۔ ملحقہ مسجد کا کریہ الصوت مؤذن بھی عقب والی گلی سے آنے جانے لگا۔

کانسی کی لٹیا' بالی عمریا اور چکی داڑھی

قبلہ اپنا مال بڑی توجہ' محنت اور محبت سے دکھاتے تھے۔ 'محبت' کا اضافہ ہم نے اس لئے کہا کہ وہ گاہک کو تو شیر کی نظر سے دیکھتے' مگر اپنی لکڑی پر محبت سے ہاتھ پھیرتے رہتے۔ کوئی ساگوان کا تختہ ایسا نہیں تھا جس کے ریشوں کے ابر اور رگوں (Veins) طغریٰ' اگر وہ چاہیں تو' یادداشت سے کاغذ پر نہ بنا سکتے ہوں۔ لکڑ منڈی میں وہ واحد دکاندار تھے جو گاہک کو اپنا اور ہر شہتیر اور بلی کا شجرۂ نسب ازبر کرا دیتے تھے۔ ان کا اپنا شجرۂ نسب بلی سے بھی زیادہ لمبا تھا۔ اس پر اپنے جد اعلیٰ کو ٹانگ رکھا

تھا۔ ایک بلی کی قامت زیبا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے' سوا اُنتالیس فٹ لمبی ہے! گونڈہ کی ہے۔ افسوس! اصغر گونڈوی کے غوغائے شاعری نے گونڈہ کی بلیوں کی شہرت کا بیڑا غرق کر دیا۔ لاکھ کہو' اب کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ گونڈے کی اصل وجہ شہرت خوبصورت بلیاں تھیں۔ اصغر گونڈوی سے پہلے ایسی سیدھی' بے گانٹھ بلی ملتی تھی کہ چالیس فٹ اونچے سرے پر سے چھلا چھوڑو تو بے روک' سیدھا نیچے جھن سے آکے ٹھہرتا تھا۔ ان کے ہاں کا ہر شہتیر اصیل اور خاندانی تھا۔ بیشتر تو خالص مغل یا روہیل کھنڈ کے پٹھان معلوم ہوتے تھے کہ ہر آئے گئے کہ کپڑے پھاڑتے اور خود مشکل سے چرتے تھے۔ کبھی قبلہ کونے میں پڑے ہوئے گرم و سرد و سیلاب چشیدہ seasoned تختے کی طرف اتنے ادب و احترام سے اشارہ کرتے گویا ابھی ابھی جودی پہاڑ کی ترائی سے کشتی نوح میں سے اکھاڑ کر بطور خاص ایک ''دانہ'' آپ کے approval کے لیے لے آئے ہیں۔ کبھی برمی ساگوان کے لٹھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے' میاں! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے! بچہ ہے۔ بہت سے بہت اسی سال۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال کا ساگوان اراودی کے جنگلوں میں آندھی طوفان میں بالکل کھڑی کمر استادہ رہتا ہے۔ لیکن صاحب! ہے بلا کا سیزنڈ۔ سیکڑوں بارشوں اور سات دریاؤں کا پانی پی کر یہاں پہنچا ہے۔ اور اس لٹھے پر تو مگرمچھ نے پیشاب بھی کیا ہے۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) یہ جو کنول نین گرہ نظر آ رہی ہے' اس پر۔ مگرمچھ جس لکڑی پہ موت دے اس کو حشر تک نہ دیمک لگ سکتی ہے' نہ آگ! اس پر خواجہ عبدالمجید جو منشیانہ ڈیسک کے لئے لکڑی خریدنے آئے تھے' پوچھ بیٹھے'' کیا مگرمچھ بجلی کے کھمبے کے بجائے درخت پر...... '' وہ جملہ مکمل نہ کر پائے تھے کہ قبلہ تنک کر بولے'' جی نہیں! مگرمچھ تو سبیل اہل اسلام میں زنجیر سے بندھے ہوئے ٹین کے گلاس سے پانی پی کے' سڑک پر ٹہل ٹہل کے استنجا سکھاتے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کی طرح۔ آیا خیال شریف میں؟

بس چوبیس گھنٹے مزاج کی کچھ ایسی ہی جوالا مکھی کیفیت رہتی تھی۔ ایک دفعہ حاجی محمد اسحاق چمڑے والے کچھ شیشم خریدنے آئے۔ قبلہ یوں تو ہر لکڑی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے، لیکن شیشم پر سچ مچ فریفتہ تھے۔ اکثر فرماتے'' تخت طاؤس میں شاہ جہاں نے شیشم ہی لگوائی تھی۔ شیشم کے گن گاہک وار قدر دان تو قبر میں جا سوئے۔ مگر کیا بات ہے شیشم کی! جتنا استعمال کرواتنے ہی جوہر کھلتے ہیں۔ شیشم کی جس چارپائی پر میں پیدا ہوا' اسی پر دادا میاں کی ولادت ہوئی تھی''۔ اپنے حسن تولد و توارد کو قبلہ چارپائی اور دادا جان دونوں کے لئے باعث سعادت و افتخار سمجھتے تھے۔ حاجی محمد اسحاق بولے'' یہ لکڑی تو صاف معلوم نہیں ہوتی''۔ قبلہ نہ جانے کتنے برسوں بعد مسکرائے۔ حاجی صاحب کی داڑھی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا'' یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی' کانسی کی لٹیا' بالی عمریا اور چکی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو اتنی ہی چمکتی ہے۔ اعلیٰ

ذات کی شیشم کی پہچان یہ کہ آرا' رندہ' برما سب کھنڈے (کند) اور ہاتھ شل ہو جائیں۔ یہ چیسٹر تھوڑا ہی ہے کہ ایک ذرا کیل ٹھونکو تو الف سے لے کر ے تک چر جائے۔ پر ایک بات ہے۔ تازہ کٹی ہوئی چیسٹر سے بن مہکار کا ایک آبشار پھوٹ پڑتا ہے۔ لگتا ہے اس میں نہایا جا رہا ہوں۔ جس دن کارخانے میں چیسٹر کی کٹائی ہونے والی ہو'اس دن میں عطر لگا کر نہیں آتا۔''

قبلہ کا موڈ بدلا تو حاجی محمد اسحاق کی ہمت بندھی۔ کہنے لگے' یہ شیشم تو واقعی اعلیٰ درجہ کی معلوم ہوتی ہے' مگر سیزنڈ نہیں لگتی۔ قبلہ کے آگ ہی تو لگ گئی۔ فرمایا ''سیزنڈ! کتنے فاقوں میں سیکھا ہے یہ لفظ؟ اگر فقط سیزنڈ ہی چاہیے تو سب سے زیادہ سیزنڈ سامنے والی مسجد کے غسل میت کا تختہ ہے۔ بڑا پانی پیا ہے اس نے! لاؤں؟ اسی پہ لٹال دوں گا۔''

سائی کے ساتھ عزت سادات بھی گئی

یوں تو ان کی زندگی ڈیل کارنیگی کے ہر اصول کی اول تا آخر نہایت کامیاب خلاف ورزی تھی' لیکن بزنس میں انہوں نے اپنے ہتکھنڈے الگ ایجاد کئے تھے۔ گاہک سے جب تک یہ نہ کہلوالیں کہ لکڑی پسند ہے' اس کی قیمت اشارتاً بھی نہیں بتاتے تھے۔ وہ پوچھتا بھی تو صاف ٹال جاتے۔'' آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کو لکڑی پسند ہے۔ لے جایئے۔ گھر کی بات ہے''۔ گاہک جب قطعی طور پر لکڑی پسند کر لیتا تو قبلہ قیمت بتائے بغیر' ہاتھ پھیلا کر بیعانہ طلب کرتے۔ سستا سماں تھا۔ وہ دونی یا چونی کی سائی پیش کرتا جو اس سودے کے لئے کافی ہوتی۔ اشارے سے دھتکارتے ہوئے کہتے' چاندی دکھاؤ (یعنی کم از کم ایک کلدار روپیہ نکالو)۔ وہ بچارا اشرما حضوری ایک روپیہ نکالتا جو اس زمانے میں پندرہ سیر گیہوں یا سیر بھر اصلی گھی کے برابر ہوتا تھا۔ قبلہ روپیہ لے کر اپنی ہتھیلی پر اس طرح رکھے رہتے کہ اسے تسلی کے لئے نظر تو آتا رہے' مگر جھپٹا نہ مار سکے۔ ہتھیلی کو اپنے زیادہ قریب بھی نہ لاتے' مبادا سودا پٹنے سے پہلے ہی گاہک بدک جائے۔ کچھ دیر بعد خود بخود کہتے ''مبارک ہو! سودا پکا ہو گیا''۔ پھر قیمت بتاتے جسے سن کر ہکا بکا رہ جاتا۔ وہ قیمت پر حجت کرتا تو کہتے ''عجب گھن چکر ہو۔ سائی دے کر پھرتے ہو۔ ابھی روپیہ دے کر سودا پکا کیا ہے۔ ابھی تو اس میں سے تمہارے ہاتھ کی گرمائی بھی نہیں گئی اور ابھی پھر گئے۔ اچھا کہہ دو کہ یہ روپیہ تمہارا نہیں ہے۔ کہو' کہو'' قیمت ناپ تول کر ایسی بتاتے کہ کائیاں سے کائیاں گاہک دبدھا میں پڑ جائے اور یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ پیشگی ڈوبنے میں زیادہ نقصان ہے یا اس بھاؤ لکڑی خریدنے میں۔

دوران حجت کتنی ہی گرما گرمی بلکہ ہاتھا پائی ہو جائے وہ اپنی ہتھیلی کو چت ہی رکھتے۔ مٹھی کبھی بند نہیں کرتے تھے تاکہ بے آبرو ہوتے ہوئے گاہک کو اطمینان رہے کہ کم از کم سائی تو محفوظ ہے۔ ان کے بارے میں ایک قصہ مشہور تھا کہ ایک سر پھرے گاہک سے جھگڑا ہوا تو دھوبی پاٹ کا داؤں لگا کر

زمین پر دے مارا اور چھاتی پر چڑھ کے بیٹھ گئے۔ لیکن اس پوز میں بھی اپنی ہتھیلی جس پر روپیہ رکھا تھا' چت ہی رکھی تا کہ اسے یہ بدگمانی نہ ہو کہ روپیہ ہتھیانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جیسی بے داغ اور اعلیٰ لکڑی وہ بیچتے تھے' ویسی بقول ان کے ''تمہیں باغ بہشت میں شاخ طوبیٰ سے بھی دستیاب نہ ہوگی۔ داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی۔ سو سال بعد بھی دیمک لگ جائے تو پورے دام واپس کر دوں گا''۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ اپنے اصول کے پکے تھے۔ مطلب یہ کہ تمام عمر ''اونچی دکان' صحیح مال' غلط دام'' پر سختی سے کاربند رہے۔ سنا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے فیشن ایبل اسٹور ''ہیرڈز'' کا دعویٰ ہے کہ ہمارے یہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ قیمت بھی دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے! ہیرڈز اگر لکڑی بیچتا تو بخدا ایسی ہی اور ان ہی داموں بیچتا۔

۲

یہ چھوڑ کر آئے ہیں

کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو دنیا ہی اور تھی۔ اجنبی ماحول۔ بے روزگاری۔ بے گھری اس پر مستزاد۔ اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو مختلف زاویوں سے کھچوا لائے تھے۔ ''ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھیے۔ اور یہ شاٹ تو کمال کا ہے''۔ ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے ''یہ چھوڑ کر آئے ہیں''۔ جن دفتروں میں مکان کے الاٹ منٹ کی درخواستیں دی تھیں ان کے بڑے افسروں کو بھی کٹہرے کے اس پار سے تصویری ثبوت استحقاق دکھاتے: ''یہ چھوڑ کر آئے ہیں''۔ واسکٹ اور شیروانی کی جیب میں اور کچھ ہو یا نہ ہو' حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ یہ درحقیقت ان کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ کراچی کے فلیٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبیاں' کبھی ڈربے' کبھی کابک کہتے۔ لیکن جب تین مہینے جوتیاں چٹخانے کے باوجود ایک کابک میں بھی سر چھپانے کو جگہ نہ ملی تو آنکھیں کھلیں۔ احباب نے سمجھایا ''فلیٹ ایک گھنٹے میں مل سکتا ہے۔ کسٹوڈین کی ہتھیلی پر پیسہ رکھو اور جس فلیٹ کی چاہو چابی لے لو''۔ مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسہ رکھوانے کے عادی تھے' وہ کہاں مانتے۔ مہینوں فلیٹ الاٹ کروانے کے سلسلے میں بھوکے پیاسے' پریشان حال سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے۔ زندگی بھر کسی کے مہمان نہ رہے تھے۔ اب بیٹی داماد کے ہاں مہمان رہنے کا عذاب بھی سہا۔

''اب کیا ہوئے گا؟''

انسان جب کسی گھلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے:

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

بیٹی کے گھر ٹکڑے توڑنے یا اس پر بار بننے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کانپور میں کبھی اس کے ہاں کھڑے کھڑے ایک گلاس پانی بھی پیتے تو ہاتھ پر پانچ دس روپے رکھ دیتے۔ لیکن اب؟ صبح سر جھکائے ناشتہ کر کے نکلتے تو دن بھر خاک چھان کر مغرب سے ذرا پہلے لوٹتے۔ کھانے کے وقت کہہ دیتے کہ ایرانی ہوٹل میں کھا آیا ہوں۔ جوتے انہوں نے ہمیشہ رحیم بخش جفت ساز سے بنوائے اس لئے کہ اس کے بنائے ہوئے جوتے چرچراتے بہت تھے۔ ان جوتوں کے تلے اب اتنے گھس گئے تھے کہ چرچرانے کے لائق نہ رہے۔ پیروں میں ٹھیکیں پڑگ گئیں۔ شیروانیاں ڈھیلی ہوگئیں۔ بیمار بیوی رات کو درد سے کراہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سمدھیانے والوں کی نیند خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ ململ کے کرتوں کی لکھنوی کڑھائی میل میں چھپ گئی۔ چنٹیں نکلنے کے بعد آستینیں انگلیوں سے ایک ایک بالشت نیچے لٹکی رہتیں۔ خضابی مونچھوں کا بل تو نہیں گیا' لیکن صرف بل کھاتی ہوئی نوکیں سیاہ رہ گئیں۔ چار چار دن نہانے کو پانی نہ ملتا۔ موتیا کا عطر لگائے تین مہینے ہوگئے۔

بیوی گھبرا کر بڑے بھولپن سے مضافاتی لہجے میں کہتیں ''اب کیا ہوئے گا؟'' ہوگا کے بجائے ہوئے گا ان کے منہ سے بہت پیارا لگتا تھا۔ اس ایک فقرے میں وہ اپنی ساری سراسیمگی' معصومیت' بے بسی اور مخاطب کے علم نجوم اور اس کی بے طلب مدد پر بھروسا...... سبھی کچھ سمو دیتی تھیں۔ قبلہ اس کے جواب میں ہمیشہ بڑے اعتماد اور تمکنت سے ''دیکھتے ہیں'' کہہ کر ان کی تشفی کر دیتے تھے۔

یہ زورِ دست و ضربت کاری کا ہے مقام

ہر دکھ' ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر اپنا ایک راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کی چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دکھ بھری تپسیا سے گزرے تھے۔ جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا' آنکھیں اندھے کنوؤں کی تہ میں بے نور ہوئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری اٹکی رہ گئی' تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اور جتنا اور جس کارن آدمی دکھ بھوگتا ہے' ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ نروان ڈھونڈنے والے کو نروان مل جاتا ہے۔ اور جو دنیا کی خاطر کشٹ اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔

سو گلی گلی خاک پھانکنے اور دفتر دفتر دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلب حزیں پر کچھ القا ہوا۔ وہ یہ کہ قاعدے قانون داناؤں اور جابروں نے کمزور دل والوں کو قابو میں رکھنے کے لئے بنائے ہیں۔ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہ جائے وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ جام اس کا ہے جو بڑھ کر خود ساقی کو جام و مینا سمیت اٹھا لے۔ بالفاظ دیگر' جو بڑھ کر تالا توڑ ڈالے' مکان اسی کا ہوگیا۔ کانپور سے چلے تو اپنی جمع جتھا' شجرہ' اسپرنگ سے کھلنے والا چاقو' اختری بائی فیض آبادی کے تین ریکارڈ' مراد آبادی حقے اور صراحی کے سبز کیریر اسٹینڈ کے علاوہ اپنی دکان کا تالا بھی ڈھو کر لے آئے تھے۔ علی گڈھ سے خاص طور پر بنوا کر منگوایا تھا۔ تین سیر سے کم کا نہ ہوگا۔ مذکورہ بالا القا کے بعد برنس روڈ پر

ایک اعلیٰ درجہ کا فلیٹ اپنے لئے پسند فرمایا۔ ماربل کی ٹائلز' سمندری ہوا کے رخ کھلنے والی کھڑکیاں جن میں رنگین شیشے لگے تھے۔ دروازے کے زنگ آلود تالے پر اپنے علیگ تالے کی ایک ہی ضرب سے فلیٹ میں اپنی آبادکاری بلامنت سرکار کرلی۔ گویا پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے الفاظ میں' اول الذکر کو ثانی الذکر پر مار کر آخر الذکر کا قبضہ لے لیا۔ تختی دوبارہ پینٹ کروا کے لگادی۔ اس سے پہلے اس پر ''کسٹوڈین متروکہ املاک'' کا نام لکھا تھا۔ قبلہ عالم جلال میں اسے وہیں سے کیلوں سمیت اکھاڑ لائے تھے۔ تختی پر نام کے آگے مضطر کانپوری بھی لکھوادیا۔ پرانے واقف کاروں نے پوچھا ''آپ شاعر کب سے ہوگئے؟'' فرمایا ''میں نے آج تک کسی شاعر پر دیوانی مقدمہ چلتے نہیں دیکھا۔ نہ ڈگری' قرقی ہوتے دیکھی!''

فلیٹ پر قابض ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ اپنے جوڑی دار کا گھٹنا رفو کر رہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ مطلب یہ کہ نام کی تختی کو پھٹ پھٹایا۔ جیسے ہی انہوں نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا' آنے والے نے خود کا تعارف اس طرح کرایا گویا اپنے عہدے کی چپڑاس ان کے منہ پر اٹھا کے دے ماری: ''افسر' محکمہ کسٹوڈین' ایویکوی پراپرٹی'' پھر ڈپٹ کر کہا ''بڑے میاں! فلیٹ کا الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ'' قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر دکھایا ''یہ چھوڑ کر آئے ہیں''۔ اس نے فوٹو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا ''بڑے میاں! سنا نہیں؟ الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ''۔ قبلہ نے بڑی رسان سے اپنے بائیں پیر کا سلیم شاہی جوتا اتارا' اور اتنی ہی رسان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا کیا کرنے والے ہیں' اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولے ''یہ ہے یاروں کا الاٹ منٹ آرڈر! کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمایئے گا؟'' اس نے اب تک یعنی تادم تذلیل' رشوت ہی رشوت کھائی تھی' جوتے نہیں کھائے تھے۔ پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔

جس حویلی میں تھا ہمارا گھر

قبلہ نے بڑے جتن سے لی مارکٹ میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی دکان کا ڈول ڈالا۔ بیوی کے جہیز کے زیور اور ویبلی اسکاٹ کی بندوق اونے پونے بیچ ڈالی۔ کچھ مال ادھار خریدا۔ ابھی دکان ٹھیک سے جمی بھی نہ تھی کہ ایک انکم ٹیکس انسپکٹر آنکلا۔ کھاتے' رجسٹریشن' روکڑ بہی اور رسید بک طلب کیں۔ دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے ''مشتاق میاں! سنا آپ نے؟ مہینوں جوتیاں چٹخاتا' دفتروں میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا۔ کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ بھیا کون ہو! اب دل لگی دیکھئے' کل ایک انکم ٹیکس کا تیس مار خان دندناتا آیا۔ لقہ کبوتر کی طرح سینہ پھلائے۔ میں نے سالے کو یہ دکھا دی ''یہ چھوڑ کر آئے ہیں'' چندرا کر پوچھنے لگا ''یہ کیا ہے؟ ہم نے کہا ''ہمارے ہاں اسے محل سرا کہتے ہیں''۔

سچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انہیں سے روایت ہے کہ اس محل سرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے

اپنے فلیٹ کی کاغذی سی دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیوار کے اس پار والے پڑوسی نے آکر درخواست کی کہ ذرا کیل ایک فٹ اوپر ٹھونکیں تاکہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹکا سکوں۔ دروازہ زور سے کھولنے اور بند کرنے کی دھمک سے اس زنگیائی کیل پر ساری محل سراپنڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی گھر میں ڈاکیا یا نئی دھوبن بھی آتی تو اسے بھی دکھاتے ''یہ چھوڑ کر آئے ہیں''۔

اس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بارہا دیکھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کیمرے کو موتیا نظر آنے لگا ہے۔ لیکن کیمرے کے ضعف بصارت کو قبلہ اپنے زور بیان سے دور کر دیتے تھے۔ یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ گزرا ہوا درد بھی سہانا لگتا ہے۔ آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فینٹیسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔

نہ ہو اگر یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

شجرہ اور حویلی بھی ایک ایسی ہی جائے اماں تھی۔ ممکن ہے بے ادب نگاہوں کو یہ تصویر میں ڈھنڈار دکھلائی دے، لیکن جب قبلہ اس کی تعمیراتی نزاکتوں کی تشریح فرماتے تو اس کے آگے تاج محل بالکل سیدھا سپاٹ گنوار و گھروندا معلوم ہوتا۔ مثلاً دوسری منزل پر ایک دروازہ نظر آتا تھا جس کی چوکھٹ اور کواڑ جھڑ چکے تھے۔ قبلہ اس فرانسیسی دریچہ بتاتے تھے۔ اگر یہاں واقعی کوئی ولایتی دریچہ تھا تو یقیناً یہ وہی دریچہ ہوگا جس میں جڑے ہوئے آئینہ جہاں نما کو توڑ کر ساری کی ساری ایسٹ انڈیا کمپنی آنکھوں میں اپنے جوتوں کی دھول جھونکتی گزر گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے کا جو بے کواڑ پھاٹک تھا وہ دراصل شاہ جہانی محراب تھی۔ اس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا چھجا تھا جس پر سردست ایک چیل قیلولہ کر رہی تھی۔ یہ راجپوتی جھروکے کی باقیات بتائی جاتی تھیں، جن کے عقب میں ان کے دادا کے وقتوں میں ایرانی قالینوں پر آذربائیجانی طرز کی قوالی ہوتی تھی۔ پچھلے پہر جب نیند کے غلبے سے غلافی آنکھیں مندنے لگتیں تو وقفے وقفے سے نقرئی گلاب پاشوں سے حضار محفل پر عرق گلاب مقطر چھڑکا جاتا۔ فرش اور دیواریں قالینوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ '' جتے پھول غلیچے پہ تھے وتے ہی باہر بغیچے میں تھے''۔ یہاں اطالوی مخمل کے کارچوبی زیرانداز پر گنگا جمنی منقش اگالدان رکھے ہوتے تھے، جن چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی گلوریوں کی پیک جب تھوکی جاتی تو بلوریں گلے میں اترتی چڑھتی صاف نظر آتی، جیسے تھرمامیٹر میں پارا۔

وہ ازدحام کہ عقل دھرنے کی جگہ نہیں

حویلی کے چند اندرونی کلوز اپ بھی تھے۔ کچھ کیمرے کی آنکھ اور کچھ چشم تصور کی رہین منت۔ ایک سہ دری تھی جس کی دو محرابوں کی دراڑوں میں بازنطینی اینٹوں پر کانپوری چڑیوں کے گھونسلے نظر آرہے تھے۔ ان پر Moorish arches کی تہمت تھی۔ چراغ رکھنے کا ایک آلہ (طاقچہ) ایسے

آرٹسٹک زاویے سے ڈہاتا تھا کہ پرتگالی آرچ کے اثار دکھلائی پڑتے تھے۔ فوٹو میں' اس کے پہلو میں ایک چوبی گھڑونچی نظر آرہی تھی جس کا شاہ جہاں ڈیزائن ان کے جد نے آب دار خانۂ خاص سے بدستِ خود چُرایا تھا۔ شاہ جہانی ہو یا نہ ہو' اس کے مغل ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا' اس لیے کہ اس کی ایک ٹانگ تیموری تھی۔ حویلی کی غلام گردشیں فوٹو میں نظر نہیں آتی تھیں' لیکن ایک ہمسائے کا بیان ہے کہ ان میں گردش کے مارے خاندانی بڑے بوڑھے رُلے پھرتے تھے۔ شمالی حصے میں ایک ستون جو مدتیں ہوئیں چھت کا بوجھ اپنے اوپر سے اوچھے کے احسان کی طرح اتار چکا تھا' Roman Pillars کا نادر نمونہ بتایا جاتا تھا۔ حیرت تھی کہ یہ چھت سے پہلے کیوں نہ گرا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چاروں طرف گردن گردن ملبے میں دبے ہونے کے باعث' اس کے گرنے کے لئے کوئی خالی جگہ نہ تھی۔ ایک شکستہ دیوار کے ساتھ لکڑی کی بوسیدہ نسینی (سیڑھی) اس طرح کھڑی تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کس کے سہارے کھڑا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق جب دوسری منزل منہدم نہیں ہوئی تھی تو یہاں وکٹورین اسٹائل کا Grand staircase ہوا کرتا تھا۔ اس غیر موجود چھت پر جہاں اب چمگادڑیں بھی نہیں لٹک سکتی تھیں' قبلہ ان آہنی کڑیوں کی نشاندہی کرتے جن میں دادا کے زمانے میں المانوی فانوس لٹکے رہتے تھے' جن کے چمپئی روشنی میں وہ گھنگھرالی خنجریاں بجتیں جو کبھی دو کوہان والے باختری اونٹوں کی محمل نشینوں کے ساتھ آئی تھیں۔ اگر یہ فوٹو ان کی رننگ کمنٹری کے ساتھ نہ دیکھے ہوتے تو کسی طرح یا قیاس و ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ پانچ سو مربع گز کی ایک لڑکھڑاتی حویلی میں اتنے فنون تعمیر اوڈھیر ساری تہذیبوں کا ایسا گھمسان کا ازدحام ہوگا کہ عقل دھرنے کی جگہ نہ رہے گی۔ پہلی مرتبہ فوٹو دیکھیں تو خیال ہوتا تھا کہ کیمرہ ہل گیا ہے۔ پھر ذرا غور سے دیکھیں تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ ڈھنڈار حویلی اب تک کیسے کھڑی ہے۔ مرزا کا خیال تھا کہ اب اس میں گرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حویلی کے صدر دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر جہاں فوٹو میں گھوڑے پر ایک کالا مرغا گردن پھلائے اذان دے رہا تھا' وہاں ایک شکستہ چبوترے کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کے پتھروں کے جوڑوں اور درزوں میں سے پودے روشنی کی تلاش میں گھبرا کر باہر نکل پڑے تھے۔ ایک دن اس چبوترے کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے کہ یہاں آب مصفا سے لبریز سنگ سرخ کا ہشت پہلو حوض ہوا کرتا تھا جس میں ولایتی گولڈ فش تیرتی رہتی تھیں۔ عارف میاں اسمیں پایونیر اخبار کی کشتیاں تیرایا کرتے تھے۔ یہ کہتے تھے قبلہ جوش بیان میں اپنی چھڑی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے پھٹی ہوئی دری پر ہشت پہلو حوض کا نقشہ کھینچنے لگے۔ ایک جگہ فرضی لکیر قدرے ٹیڑھی کھینچی تو اسے پیر سے

رگڑ کا مٹایا۔ چھڑی کی نوک سے اس بدذات مچھلی کی طرف اشارہ کیا جو سب سے لڑتی پھرتی تھی۔ پھر ایک کونے میں اس مچھلی کی بھی نشان دہی کی جس کا جی ماندہ تھا۔ انہوں نے کھل کر تو نہیں کہا کہ آخر ہم ان کے خورد تھے' لیکن ہم سمجھ گئے کہ اس مچھلی کا جی کھٹی چیزیں اور سوندھی مٹی کھانے کو بھی چاہ رہا ہوگا۔

قبلہ کبھی ترنگ میں آتے تو اپنے اکلوتے بے تکلف دوست رئیس احمد قدوائی سے فرماتے کہ جوانی میں مئی جون کی ٹیک دوپہریا میں ایک حسین دوشیزہ کا کوٹھوں ننگے پیران کی حویلی کی تپتی چھت پر آنا' اب تک (مع ڈائیلاگ) یاد ہے۔ یہ بات مرزا کی سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اس لئے کہ ان کی حویلی سہ منزلہ تھی' جب کہ دائیں بائیں پڑوس کے دونوں مکان ایک ایک منزلہ تھے۔ حسین دوشیزہ اگر ننگے پیر ہواور زیور حیا اتارنے کے لئے اتاؤلی بھی ہو' تب بھی یہ کرتب ممکن نہیں' تاوقتیکہ حسینہ ان کے عشق میں دوشیزہ ہونے کے علاوہ دولخت بھی نہ ہو جائے۔

پلکھن

فوٹو میں حویلی کے سامنے ایک چھتنار پلکھن ☆ اداس کھڑی تھی۔ اس کا تخم ان کے جد اعلیٰ سمند سیاہ زانو پر سوار' کارچوبی کام کے چغے میں چھپا کر قحط کے زمانے میں دمشق سے لائے تھے۔ قبلہ کے قول کے مطابق' ان کے پردادا کے ابا جان کہا کرتے تھے کہ ''بے سروسامانی کے عالم میں تنگ خلائق' تنگ اسلاف' تنگ وطن ...... تنگ سر' تنگ پیر' گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر' ننگی تلوار ہاتھ میں لئے ...... خیبر کے سنگلاخ تنگ پہاڑوں کو پھلانگتا' وارد ہندوستان ہوا''۔ جو تصویر وہ فخریہ کھینچتے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بزرگوار کے پاس ستر پوشی کے لئے گھوڑے کی دم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جائیداد' محل سرا' خدام' مال ومتاع ...... سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔ البتہ اثاث البیت کا سب سے قیمتی حصہ یعنی شجرہ نسب اور پلکھن کا تخم ساتھ لے آئے۔ گھوڑا جوانی کی طرح نجیب الطرفین اور وطن مالوف سے بیزار تھا' تخم اور شجرے کے بوجھ سے رانوں تلے سے نکلا پڑ رہا تھا۔

شجرے کی ہر شاخ پہ نابغہ بیٹھا تھا

زندگی کی دھوپ جب کڑی ہوئی اور پیروں تلے سے زمین جائیداد نکل گئی تو آئندہ نسلوں نے اس شجر اور شجرے کے سائے تلے بسرام کیا۔ قبلہ کو اپنے بزرگوں کی ذہانت وفطانت پر بڑا ناز تھا۔ ان کا ہر بزرگ نادرۂ روزگار تھا' اور ان کے شجرے کی ہر شاخ پر ایک نابغہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

☆ پلکھن: جن پڑھنے والوں نے یہ درخت نہیں دیکھا' وہ اس کی تصویر قراۃ العین حیدر کے ''کار جہاں دراز ہے'' میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اس درخت کا فوٹو ہی دیکھا ہے۔ یہاں ہمارے پاس جتنے لغات ہیں ان میں یہ لفظ نہیں ہے۔ تذکیر وتانیث کا بھی علم نہیں۔ لیکن جس پیار اور للک سے اس کا ذکر کیا گیا اس پر ہم نے قیاس کیا کہ مونث ہی ہوگا۔

قبلہ نے ایک فوٹو اس پلکھن کے نیچے ٹھیک اس جگہ کھڑے ہوکر کھچوایا تھا جہاں ان کی نال گڑی تھی۔ فرماتے تھے' اگر کسی تخم نا تحقیق کو میری حویلی کی ملکیت میں شبہ ہوتو نال نکال کر دیکھ لے۔ جب آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کی نال کہاں گڑی ہے اور پرکھوں کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں' تو وہ منی پلانٹ کی طرح ہو جاتا ہے جو مٹی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ اپنی نال' پرکھوں اور پلکھن کا ذکر اتنے فخر' غلو اور کثرت سے کرتے کرتے یہ احوال ہوا کہ پلکھن کی جڑیں شجرے میں اتر آئیں' جیسے گھٹنوں میں پانی اتر آتا ہے۔

امپورٹڈ بزرگ اور یونانی ناک

وہ زمانے اور تھے۔ شرافت اور نجابت کے معیار بھی مختلف تھے۔ جب تک بزرگ اصلی امپورٹڈ یعنی ماوراء النہری اور خیبر کے اس پار سے آئے ہوئے نہ ہوں' کوئی ہندوستانی مسلمان خود کو عزت دار اور نجیب نہیں گردانتا تھا۔ غالب کو تو شیخی بگھارنے کے لئے اپنا (فرضی) استاد ملا عبدالصمد تک ایران سے امپورٹ کرنا پڑا۔ قبلہ کے بزرگوں نے جب بے روزگاری اور عسرت سے تنگ آ کر وطن چھوڑا تو آنکھیں نم اور دل گداز تھے۔ بار بار اپنا دست افسوس زانوئے اسپ پر مارتے اور ایک راوی شیوہ بیان کے بقول' ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے استغفر اللہ! استغفر اللہ! کہتے۔ تازہ ولایت جس سے ملے' اپنے حسن اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔

پہلے جان' پھر جان جاں' پھر ان جاناں ہو گئے

پھر یہی پیارے لوگ بتدریج

پہلے خاں' پھر خانخاں' پھر خانخاناں ہو گئے!

حویلی کے آرکی ٹیکچر کی طرح قبلہ کے امراض بھی شاہانہ ہوتے تھے۔ بچپن میں دائیں رخسار پر غالباً آموں کی فصل میں پھنسی نکلی تھی جس کا داغ ہنوز باقی تھا۔ فرماتے تھے' جس سال میرے یہ اورنگ زیبی پھوڑا نکلا' اسی سال بلکہ اسی ہفتے ملکہ وکٹوریہ رانڈ ہوئی۔ ساٹھ کے پیٹے میں آئے تو شاہجہانی حبس بول میں مبتلا ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ غالب مغل بچہ تھا۔ ستم پیشہ ڈومنی کو اپنے زہر عشق سے مار ڈالا۔ مگر خود اسی' گویا کہ میرے والے عارضے میں مرا۔ ایک خط میں مرقوم ہے ہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں اور قطرہ قطرہ خارج کرتا ہوں۔ دمے کا دورہ ذرا تھمتا تو قبلہ بڑے فخر سے فرماتے کہ فیضی کو بھی یہی مرض لاحق تھا۔ اس نے ایک قطعہ میں کہا ہے کہ دو عالم میرے سینے میں سما گئے' مگر آدھا سانس کسی طور نہیں سما رہا! اپنے والد مرحوم کے بارے میں فرماتے تھے کہ راج روگ یعنی اکبری سنگرہنی میں انتقال فرمایا۔ مراد اس سے آنتوں کی ٹی بی تھی۔ مرض تو مرض' قبلہ کی ناک تک اپنی نہیں تھی۔ یونانی بتاتے تھے۔

۳

''مردہ'' از غیب بروں آید و کارے بکند

قبلہ کو دو غم تھے۔ پہلے غم کا ذکر بعد میں آئے گا کہ وہ جانگسل تھا۔ دوسرا غم دراصل اتنا ان کا اپنا نہیں جتنا بیوی کا تھا جو بیٹے کی تمنا میں گھل رہی تھیں۔ اس غریب نے بڑی منتیں مانیں۔ قبلہ کو شربت میں نقش گھول گھول کر پلائے۔ ان کے تکیے کے نیچے تعویذ رکھے۔ چھپ چھپ کر مزاروں پر چادریں چڑھائیں۔ ہمارے ہاں لوگ جب زندوں سے مایوس ہو جاتے ہیں تو ایک ہی آس باقی رہ جاتی ہے:

مردہ از غیب بروں آید کارے بکند

پچاس میل کے دائرے میں کوئی مزار ایسا نہ بچا جس کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نہ روئی ہوں کہ اہل قبر کے پسماندگان بھی تدفین کے وقت یوں نہ روئے ہوں گے۔ اس زمانے کے اہل القبور، صاحب کرامات ہوں یا نہ ہوں، کم از کم قبر کے اندر ضرور ہوتے تھے۔ آج کل جیسا حال نہیں تھا کہ مزار اگر خالی از میت ہے تو غنیمت جانئے، ورنہ اللہ جانے اندر کیا دفن ہے جس کا اس دھوم سے عرس شریف منایا جا رہا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ کراچی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نہ دیکھتے ہوں کہ آج فلاں آستانہ عالیہ پر چادر شریف چڑھائی جا رہی ہے۔ پانچ بجے گاگر شریف، جلوس کی شکل میں لے جائی جائے گی۔ پھر اس سے مزار شریف کو غسل شریف دیا جائے گا۔ بعد نماز مغرب لنگر شریف تقسیم ہوگا۔ ہم نے بعض نو دریافت بزرگوں کے نوتعمیر مزاروں کے ضمن میں ''شریف'' پر تاکیداً اتنا زور دیکھا ہے کہ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگتے ہیں۔ ہم نہ ضعیف الاعتقاد ہیں نہ وہابی، لیکن کراچی کے ایک مزار کے بارے میں جو ہمارے سامنے پر ہوا ہے، ہم بالاعلان یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ اس سے متعلق ہر چیز شریف ہے، سوائے صاحب مزار کے۔

خیر، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو روانی میں پھیل کر پورا پیرا بن گیا۔ عرض یہ کرنا تھا کہ قبلہ خود کو کسی زندہ پیر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں جب یہ پتا چلا کہ بیوی اولاد نرینہ کی منت مانگنے چوری چھپے نامحرموں کے مزاروں پر جانے لگی ہیں تو بہت خفا ہوئے۔ وہ جب بہت خفا ہوتے تو کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ حلوائی کی دکان سے ربڑی، موتی چور کے لڈو اور کچوری لا کر کھا لیتے۔ دوسرے دن بیوی کاسنی رنگ کا دوپٹا اوڑھ لیتیں اور ان کے پسندیدہ کھانے یعنی دو پیازہ، ڈیوڑھی شکر والا زردہ اور بہت تیز مرچوں کے ماش کے دہی بڑے کھلا کر انہیں منا لیتیں۔ قبلہ انہی مرغوبات پر اپنے ایرانی اور عربی النسل بزرگوں کی نیاز دلواتے۔ البتہ ان کے دہی بڑوں میں مرچیں برائے نام ڈلواتے۔ مزاروں پر حاضری پر قدغن بڑھا۔ بیوی بہت روئیں دھوئیں تو قبلہ کچھ پگھلے۔ مزاروں پر جانے کی اجازت دے

دی، مگر اس شرط پر کہ مزار کا مکین ''ذات کا کمبوہ نہ ہو۔ کمبوہ مرد اور غزل گو شاعر سے پردہ لازم ہے، خواہ وہ مردہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں ان کے رگ و ریشہ سے واقف ہوں۔'' ان کے دشمنوں سے روایت ہے کہ قبلہ خود بھی جوانی میں شاعر اور ننھیال کی طرف سے کمبوہ تھے۔ اکثر فرماتے ''مرگ کمبوہ جشنے دارو''۔

کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں گھنٹی

رفتہ رفتہ بیوی کو صبر آ گیا۔ ایک بیٹی تھی۔ قبلہ کو وہ عزیز سے عزیز تر ہوتی گئی۔ انہیں اس حد تک صبر آ گیا کہ اکثر فرماتے، خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس نے بڑا فضل کیا کہ بیٹا نہ دیا۔ اگر مجھ پر پڑتا تو تمام عمر خوار ہوتا۔ اور اگر نہ پڑتا تو ناخلف کو عاق کر دیتا۔

سیانی بیٹی، کتنی بھی چہیتی ہو، ماں باپ کی چھاتی پر پہاڑ ہوتی ہے۔ لڑکی، ضرورت رشتہ کی اشتہاری اصطلاحوں کے مطابق، قبول صورت، سلیقہ شعار، خوش اطوار، امور خانہ داری سے بخوبی واقف۔ لیکن کس کی شامت آئی تھی کہ قبلہ کی بیٹی کا پیام دے۔ ہمیں آتش نمرود میں کودنے کا ذاتی تجربہ تو نہیں۔ لیکن وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آتش نمرود میں بے خطر کودنے سے کہیں زیادہ خطرناک کام نمرود کے شجرہ نسب میں کود پڑنا ہے۔ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، قبلہ ہمارے دوست بشارت کے پھوپا، چچا اور اللہ جانے کیا کیا لگتے تھے۔ دکان اور مکان، دونوں اعتبار سے، پڑوسی بھی تھے۔ بشارت کے والد بھی رشتے کے حق میں تھے، لیکن رقعہ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا کہ بہو کے بغیر پھر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔ لیکن ناک اور ٹانگ کے بغیر تو شخصیت نامکمل سی معلوم ہو گی۔ بشارت نے ریل کی پٹڑی سے خود کو بندھوا کر بڑی لائن کے انجن سے اپنی خودکشی کروانے کی دھمکی دی۔ رسیوں سے بندھوانے کی شرط خود اس لئے لگا دی کہ عین وقت پر اٹھ کر بھاگ نہ جائیں۔ لیکن ان کے والد نے صاف کہہ دیا کہ اس کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں تمہیں گھنٹی ڈالو۔

قبلہ ''مدمغ'' بد لحاظ، منہ پھٹ مشہور ہی نہیں، تھے بھی۔ وہ دل سے .... بلکہ بے دلی سے بھی ...... کسی کی عزت نہیں کرتے تھے۔ دوسرے کو حقیر سمجھنے کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور نکال لیتے۔ مثلاً اگر کسی کی عمر ان سے ایک مہینہ بھی کم ہو تو اسے لونڈا کہتے اور اگر ایک سال زیادہ ہو تو بڑھو!

ب و س ہ اور چار نقطے

بشارت نے ان دنوں بی۔ اے کا امتحان دیا تھا اور پاس ہونے کا امکان، بقول ان کے، ففٹی ففٹی تھا۔ ففٹی ففٹی اتنے زور، فخر اور وثوق سے کہتے تھے گویا اپنا کانٹا قول نصفا نصف نالائقی سے ممتحن کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ کیرم اور کوٹ پیس کھیلتے۔ روحوں کو بلاتے اور ان

سے ایسے سوال کرتے کہ رندوں کو حیا آتی۔ کبھی دن بھر بیٹھے نظیر اکبر آبادی کے کلیات میں وہ نقطے والے بلینک پُر کرتے رہتے جو منشی نول کشور پریس نے بہ تقاضائے تہذیب وتعزیرات ہند خالی چھوڑ دیے تھے۔ گفتگو میں ہر جملے کے بعد شعر کا ''ٹھیکا'' لگاتے۔ افسانہ نویسی کی مشق و مشقت بھی جاری تھی۔ نیاز فتح پوری کی اطلسی فقرہ طرازی اور ابوالکلام کی جھومتی جھامتی گنج گامنی نثر کی چھاپ' ایک انھی پر موقوف نہیں' اچھے اچھوں کی طرز تحریر پر تھی۔ بعضوں پر ماتھے کے جھومر کی مانند۔ کچھ پر دھوبی کے نشان کی طرح۔ اور کچھ پر اس طرح جیسے انگریز ملاح اپنی محبوباؤں کی تصویریں جسم پر گدوا لیتے ہیں۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ کسی کی محتاجی نہیں۔ اردو نثر اس زمانے میں فیل پا میں مبتلا تھی۔ اس میں کچھ افاقہ ہوا تو معجوم فلک سیر کھا کر ٹیگوری ادب پاروں کے اڑن غالیچے پر سوار ہو گئی۔ بشارت کے ایک افسانے کا کلائمکس کچھ اس طرح تھا:

''انجم آرا کی حسن آفرینیوں' سحر انگیزیوں اور حشر سامانیوں سے مشام جان معطر تھا۔ وہ لغزیدہ لغزیدہ قدموں سے آگے بڑھی اور فرط حیا سے اپنی اطلسی بانہوں کو اپنی ہی وزدیدہ وزدیدہ آنکھوں پر رکھا۔ سلیم نے انجم آرا کے دست حنائی کو اپنے آہنی ہاتھ میں لے کر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی ہیرا تراش کلائی اور ساق بلوریں کو دیکھا اور گلنار سے لبوں پر .... چار نقطے ثبت کر دیے۔'' اس زمانے میں لفظ ''بوسہ'' فحش سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس کی جگہ نقطے لگا دیئے جاتے تھے۔ بشارت گن کر اتنے ہی نقطے لگاتے جن کی اجازت اس وقت کے حالات' حیا یا ہیروئن نے دی ہو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں انجمن ترقی اُردو کے رسالے میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اس میں جہاں لفظ بوسہ آیا' وہاں مولوی عبدالحق نے بربنائے تہذیب اس کے ہجے یعنی ب و س ہ چھاپ کر الٹا اس کی لذت وطوالت میں اضافہ فرمادیا۔ یہاں ہمیں ان کا یا اپنے حبیب لبیب کی طرز نگارش کا مذاق اڑانا مقصود نہیں۔ ہر زمانے کا اپنا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے۔ لفظ کبھی انگرکھا' کبھی عبا و عمامہ' کبھی ڈنر جیکٹ یا فولس کیپ' کبھی پیر میں پائل یا بیڑی پہنے نظر آتے ہیں۔ اور کبھی کوئی مداری اپنی قاموسی ڈگڈگی بجاتا ہے تو لفظوں کے سدھے سدھائے بندر ناچنے لگتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنا سن پیدائش اس طرح بتاتے ہیں:

''یہ غریب الدیار عہد' نا آشنائے عصر' بیگانہ خویش' نمک پروردۂ ریش' خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد مدعو بابی الکلام ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔''

اب لوگ اس طرح نہیں لکھتے۔ اس طرح پیدا بھی نہیں ہوتے۔ اتنی خجالت' طوالت و اذیت تو آج کل سیزیرین پیدائش میں بھی نہیں ہوتی۔ ☆

کوہ آتش فشاں میں چھلانگ

بالآخر ایک سہانی صبح بشارت خود رقعہ لکھا اور رجسٹری سے بھجوادیا' حالانکہ مکتوب الیہ کے مکان کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ رقعہ ۲۳ صفحات اور کم و بیش پچاس اشعار پر مشتمل تھا جن میں سے آدھے اپنے اور آدھے عندلیب شادانی کے تھے جن سے قبلہ کے برادرانہ مراسم تھے۔ اس زمانے میں رقعے زعفران سے لکھے جاتے تھے' لیکن اس رقعے کے لئے تو زعفران کا ایک کھیت بھی ناکافی ہوتا۔ لہٰذا صرف القاب و آداب زعفران سے اور بقیہ مضمون سرخ روشنائی سے زیڈ کے موٹے نب سے لکھا۔ جن حصوں پر بطور خاص توجہ دلانی مقصود تھی انہیں نیلی روشنائی سے باریک حروف میں لکھا۔ مدعا اگرچہ گستاخانہ لیکن لہجہ برابر فدویانہ اور مضمون بے حد خوشامدانہ تھا۔ قبلہ کے حسن اخلاق' شفقت' خوش خوئی' خوش معاملگی' صلہ رحمی' نرم گفتاری' مردانہ وجاہت ...... مختصر یہ کہ ہر اس خوبی کی جی کھول کر تعریف کی جس کا شائبہ تک قبلہ کے کردار میں نہ تھا۔ ساتھ ساتھ قبلہ کے دشمنوں کی نام بنام ڈٹ کر برائی کی۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ ۲۳ صفحات کے کوزے میں بند کر کے کھرل کرنا انہی کا کام تھا۔ بشارت نے جی کڑا کر کے یہ تو لکھ دیا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں' لیکن اس وضاحت کی ہمت نہ پڑی کہ کس سے۔ مضمون بے ربط و ژولیدہ سہی لیکن قبلہ اپنے حسن سیرت اور دشمنوں کی حرمزدگیوں کے بیان سے بہت خوش ہوئے۔ اس سے پہلے ان کو کسی نے وجیہہ بھی نہیں کہا تھا۔ دو دفعہ پڑھ کر اپنے منشی کو پکڑا دیا کہ تم ہی پڑھ کر بتاؤ صاحبزادے کس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اوصاف تو میرے بیان کئے ہیں۔

قبلہ دیر تک اپنے مبینہ اوصاف حمیدہ پر دل ہی دل میں اترایا کئے۔ گلیشیر تھا کہ پگھلا جا رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے' منشی جی سے گویا ہوئے' بعضے بعضے بے استادے شاعر کے اشعار میں کبھی کبھی الف گرتا ہے۔ اس کے اشعار میں تو الف سے لے کر ے تک سارے حروف تہجی ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں۔ جیسے عیدگاہ میں نمازی ایک دوسرے کی کمر پر رکوع و سجود کر رہے ہوں۔

بشارت کی جرات رندانہ کی کہانی جس نے سنی ششدر رہ گیا۔ خیال تھا کہ کوہ آتش فشاں پھٹ

☆ اسی طرح نو طرز مرصع کا ایک جملہ ملاحظہ فرمائیے:

''جب ماہتاب عمر میرے کا بدرجہ چہاردہ سالگی کے پہنچا' روز روشن ابتہاج اس تیرہ بخت کا تاریک تر شب یلدہ سے ہوا' یعنی پیمانہ عمر و زندگانی مادر و پدر بزرگوار حظوظ نفسانی سے لبریز ہو کے اسی سال دست قضا سے دہلا''۔

کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ جب میں چودہ برس کا ہوا تو ماں باپ فوت ہو گئے۔ لیکن پیرایہ ایسا گنجلک اختیار کیا کہ والدین کے ساتھ مطلب بھی فوت ہو گیا۔

مرزا عبدالودود بیگ نے ایسے Pompous style کے لئے سبک ہندی کی طرز پر ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے: طرز اسطو خودوس۔ اس پر راقم الحروف کا نوٹ ''دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ'' کے باب پنجم میں ملاحظہ فرمائیے۔ ویسے اس کے لغوی معنی ہیں: نزلے اور پاگل پن کی ایک دوا جسے اطبا دماغ کی جھاڑو کہتے ہیں۔

پڑے گا۔ قبلہ نے اگر از راہ ترحم سارے خاندان کو قتل نہیں کیا تو کم از کم ہر ایک کی ٹانگیں ضرور توڑ دیں گے۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ قبلہ نے بشارت کو اپنی غلامی میں قبول کرلیا۔

۴

راون کیوں مارا گیا؟

قبلہ کی دکانداری اور اس کی لائی ہوئی آفتوں کی ایک مثال ہو تو بیان کریں۔ کوئی گاہک اشارۃ کنایۃً بھی ان کی کسی بات یا بھاؤ پر شک کرے تو پھر اس کی عزت ہی نہیں' ہاتھ پیر کی بھی خیر نہیں۔ ایک دفعہ عجلت میں تھے۔ لکڑی کی قیمت چھوٹتے دس روپے بتادی۔ دیہاتی گاہک نے پونے دس روپے لگائے اور یہ گالی دیتے ہوئے مارنے کو دوڑے کہ جٹ گنوار کو اتنی جرأت کیسے ہوئی۔ دکان میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی رہتی تھی' جس کے بانوں کو چرا چرا کر آرا کھینچنے والے مزدور چلم میں بھر کے سلفے کے دم لگاتے تھے۔ قبلہ جب باقاعدہ مسلح ہوکر حملہ کرنا چاہتے تو اس چارپائی کا سیروا یعنی سرہانے کی پٹی نکال کر اپنے دشمن یعنی گاہک پر جھپٹتے۔ اکثر سیروے کو پچکارتے ہوئے فرماتے'' عجب سخت جان ہے۔ آج تک اس میں فریکچر نہیں ہوا۔ لٹھ رکھنا بزدلوں اور گنواروں کا وتیرہ ہے۔ اور لاٹھی چلانا' قصائی کنجڑوں' غنڈوں اور پولیس کا کام ہے''۔ استعمال کے بعد سیروے کی فرسٹ ایڈ کر کے یعنی انگوچھے سے اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر واپس جھلنگے میں لگا دیتے۔ اس طریقہ واردات میں غالباً یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ چارپائی تک جانے اور سیروا نکالنے کے وقفے میں اگر غصے کو ٹھنڈا ہونا ہے تو ہوجائے۔ اور اگر ان کے معتوب کی بینائی اور عقل زائل نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی ٹانگوں کے استعمال میں مزید بخل سے کام نہ لے۔ ایک قدیم چینی کہاوت ہے کہ لڑائی کے جو ۳۷ پینترے داناؤں نے گنوائے ہیں' ان میں جو پینترا سب سے کارآمد بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بھاگ لو! اس کی تصدیق ہندو دیومالا سے بھی ہوتی ہے۔ راون کے دس سر اور بیس ہاتھ تھے۔ پھر بھی مارا گیا۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ بھاگنے کے لئے صرف دو ٹانگیں تھیں۔ حملہ کرنے سے پہلے قبلہ کچھ دیر خوخیاتے تا کہ مخالف اپنی جان بچانا چاہتا ہے تو بچالے۔ فرماتے تھے' آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی شخص کی ٹھکائی کرنے سے پہلے میں نے اس گالی دے کر خبردار نہ کیا ہو۔ کیا شعر ہے وہ بھلا سا؟ ہاں!

پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جب قصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

انسانی کردار میں مچھر کی صفات پیدا کر کے اتنا فخر کرتے ہم نے انہی کو دیکھا۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے' بی ٹی نے ان کے خیالات سے متاثر ہوکر اپنے دو بقراطی لیکچروں کے مجموعہ

بعنوان ''خطبات چاکسو'' کی آؤٹ لائن بنائی۔ ''مشرقی شعر و روایت میں پشہ کا مقام: تاریخی تناظر میں معروضی زاویے سے'' اور'' موازنہ پشہ وشاہین'' ہمارے قارئین ماشا اللہ عاقل ہیں۔ اشارے کی بھی ضرورت نہیں کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔

ہوں لائق تعزیر پہ الزام غلط ہے

قبلہ کی ہیبت سب کے دلوں پر بیٹھی تھی، بجز دائیں جانب والے دکاندار کے۔ وہ قنوج کا رہنے والا، نہایت خودسر، ہتھ چھٹ، بدمعاملہ اور بدزبان آدمی تھا۔ عمر میں قبلہ سے بیس سال کم ہوگا۔ یعنی جوان اور سرکش۔ چند سال پہلے تک اکھاڑے میں باقاعدہ زور کرتا تھا۔ پہلوان سیٹھ کہلاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک گاہک قبلہ کی سرحد میں ۳/۴ داخل ہو چکا تھا کہ پہلوان سیٹھ اسے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنی دکان میں لے گیا اور قبلہ ''مہارلج! مہاراج!'' پکارتے ہی رہ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی دکان میں گھس کر گاہک کو چھڑا کر لانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پہلوان سیٹھ نے ان کو وہ گالی دی جو وہ خود سب کو دیا کرتے تھے۔

پھر کیا تھا۔ قبلہ نے اپنے اسلحہ خانہ خاص یعنی چارپائی سے پٹی نکالی اور [5] ننگے پیر دوڑتے ہوئے اس کی دکان میں دوبارہ داخل ہوئے۔ گاہک نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور اولین غفلت میں اپنا دانت تڑوا کر مصالحتی کاروائی سے ریٹائر ہوگیا۔ دریدہ دہن پہلوان سیٹھ دکان چھوڑ کر بگٹٹ بھاگا۔ قبلہ اس کے پیچھے سرپٹ۔ تھوڑی دور جا کر اس کا پاؤں ریل کی پٹڑی میں الجھا اور وہ منہ کے بل گرا۔ قبلہ نے جالیا۔ پوری طاقت سے ایسا وار کیا کہ پٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ معلوم نہیں اس سے چوٹ آئی یا ریل کی پٹڑی پر گرنے سے۔ وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ اس کے گرد خون کی تلیا سی بن گئی۔

پہلوان سیٹھ کی ٹانگ کے multiple فریکچر میں گنگرین ہوگیا اور ٹانگ کاٹ دی گئی۔ فوجداری مقدمہ بن گیا۔ اس نے پولیس کو خوب پیسہ کھلایا۔ اور پولیس نے دیرینہ عداوت کی بنا پر قبلہ کا اقدام قتل میں چالان پیش کردیا۔ تعزیرات ہند کی اور بہت سے دفعات بھی لگا دیں۔ لمبی چوڑی فرد جرم سن کر قبلہ فرمانے لگے کہ ٹانگ کا نہیں، تعزیرات ہند کا ملٹی پل فریکچر ہوا ہے۔ پولیس گرفتار کرکے لے جانے لگی تو بیوی نے پوچھا ''اب کیا ہوئے گا؟'' کندھے اُچکاتے ہوئے بولے ''دیکھیں گے۔'' عدالت مجسٹریٹی میں بیچ بچاؤ کرنے والے گاہک کا دانت اور آلہ قتل یعنی چارپائی مع خون پلائی ہوئی پٹی کے بطور exhibits پیش ہوئے۔ مقدمہ سیشن سپرد ہوگیا۔ قبلہ کچھ عرصہ ریمانڈ پر جوڈیشل حوالات میں رہے تھے۔ اب جیل میں باقاعدہ خونیوں، ڈاکوؤں، جیب کتروں اور عادی مجرموں کے ساتھ رہنا پڑا۔ تین چار پیشیوں کے بعد وہ بھی قبلہ کو اپنا چچا کہنے اور ماننے لگے۔

ان کی طرف سے، یعنی بحیثیت وکیل صفائی، کانپور کے ایک لائق بیرسٹر مصطفے رضا قزلباش نے

پیروی کی۔ مگر وکیل اور موکل کا کسی ایک نکتے پر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ مثلاً قبلہ بضد تھے کہ میں حلف اٹھا کر یہ بیان دوں گا کہ مضروب نے اپنی ولدیت غلط لکھوائی ہے۔ اس کی صورت اپنے باپ سے نہیں، باپ کے ایک اوباش دوست سے ملتی ہے۔ بیرسٹر موصوف یہ موقف اختیار کرنا چاہتے تھے کہ چوٹ ریل کی پٹڑی پر گرنے سے آئی ہے، نہ کہ ملزم کی مبینہ ضرب سے۔ اُدھر قبلہ کمرہ عدالت میں فلمی بیرسٹروں کی طرح ٹہل ٹہل کر اور کٹہرے کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ اعلان کرنا چاہتے تھے کہ میں سپاہی بچہ ہوں۔ دکانداری میرے لئے کبھی ذریعہ عزت نہیں رہی۔ بلکہ عرصہ دراز سے ذریعہ آمدنی بھی نہیں رہی۔ ٹانگ پروار کرنا ہماری شان سپہ گری اور شیوۂ مردانگی کی توہین ہے۔ میں تو دراصل اس کا سر پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اگر مجھے سزا دینی ہی ضروری ہے تو ٹانگ توڑنے کی نہیں، غلط نشانے کی دیجیے۔ ہوں لائق تعزیر پہ الزام غلط ہے۔

ایام اسیری اور جوں کا ''بلڈ ٹیسٹ''

عدالت میں فوجداری مقدمہ چل رہا تھا۔ قرائن کہتے تھے کہ سزا ہو جائے گی اور خاصی لمبی۔ گھر میں ہر پیشی کے دن رونا پیٹنا مچتا۔ اعزہ اور احباب اپنی جگہ پریشان اور سراسیمہ کہ ذرا سی بات پر یہ نوبت آگئی۔ پولیس نے انہیں ہتھکڑی پہنائے سارے شہر کا چکر دلا کر عدالت میں پیش کرتی اور پہلوان سیٹھ سے حق الخدمت وصول کرتی۔ بھولی بھالی بیوی کو یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتیں ''بھیا! کیا سچ مچ ہتھکڑی پہنائی تھی؟'' عدالت کے اندر اور باہر قبلہ کے تمام دشمنوں یعنی سارے شہر کا ہجوم ہوتا۔ سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ مگر قبلہ نے کبھی منہ پر تولیہ اور ہتھکڑی پر رومال نہیں ڈالا۔ گشت کے دوران مونچھوں پر تاؤ دیتے تو ہتھکڑی جھن جھن جھن کرتی۔ رمضان آئے تو کسی نے مشورہ دیا کہ نماز روزہ شروع کر دیجیے۔ اپنے کان ہی پور کے ☆ مولانا حسرت موہانی تو روزے میں چکی بھی پیستے تھے۔ قبلہ نے بڑی حقارت سے جواب دیا ''لاحول ولا قوۃ! میں شاعر تھوڑا ہی ہوں۔ یہ نام ہوگا غم روزگار سہ نہ سکا''۔

بیوی نے کئی مرتبہ پچھوایا ''اب کیا ہوئے گا؟''

ہر بار ایک ہی جواب ملا ''دیکھ لیں گے۔''

طیش کے عالم میں جو بات منہ سے نکل جائے یا جو حرکت سرزد ہو جائے، اس پر انہیں کبھی نادم ہوتے نہیں دیکھا۔ فرماتے تھے کہ آدمی کے اصل کردار کی جھلک تو طیش کے کوندے میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ اپنے کسی کرتوت یعنی اصل کردار پر پشیمان یا پریشان ہونے کو مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک دن ان کا بھتیجا شام کو جیل میں کھانا اور جوئیں مارنے کی دوا دے گیا۔ دوا کے

☆ کان ہی پور کے: کانپور والے اکثر ''کانپور ہی کے'' کہنے کے بجائے ''کان ہی پور کے'' کہتے ہیں!

اشتہار میں لکھا تھا کہ اس کے ملنے سے جوئیں اندھی ہوجاتی ہیں۔ پھر انہیں آسانی سے پکڑ کر مارا جاسکتا ہے۔ جوں اور لیکھ مارنے کی مروجہ ترکیب بھی درج تھی۔ یعنی جوں کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھو اور دائیں انگوٹھے کے ناخن سے چٹ سے کچل دو۔ اگر جوں کے پیٹ سے کالا یا گہرا عنابی خون نکلے تو فوراً ہماری دوا ''اکسیر جالینوس'' مصفی خون پی کر اپنا خون صاف کیجیے۔ پرچے میں یہ ہدایت بھی تھی کہ دوا کا کورس اس وقت تک جاری رکھئے جب تک کہ جوں کے پیٹ سے صاف شدہ سرخ خون نہ نکلنے لگے۔ قبلہ نے جنگلے کے اس طرف اشارے سے بھتیجے کو کہا کہ اپنا کان میرے منہ کے قریب لاؤ۔ پھر اس سے کہا کہ برخوردار! زندگی کا بھروسا نہیں۔ دنیا' اس جیل سمیت' سرائے فانی ہے۔ غور سے سنو۔ یہ میرا حکم بھی ہے اور وصیت بھی۔ لوہے کی الماری میں دو ہزار روپے آڑے وقت کے لئے ردی اخباری کے نیچے چھپا آیا تھا۔ یہ رقم نکال کر الن (شہر کا نامی غنڈہ) کو دے دینا۔ اپنی چچی کو میری طرف سے دلاسا دینا۔ الن کو میری دعا کہنا اور یہ کہنا کہ ان چھوں کی ایسی ٹھکائی کرے کہ گھر والے صورت نہ پہچان سکیں۔ یہ کہہ کر اخبار کا ایک مسلا ہوا پرزہ بھتیجے کو تھما دیا' جس کے حاشیے پر ان چھ گواہان استغاثہ کے نام درج تھے' جن کو پٹوانے کا انہوں نے جیل میں اس وقت منصوبہ بنایا تھا جب ایسی ہی حرکت پر انہیں آج کل میں سزا ہونے والی تھی۔

ایک دفعہ اتوار کو ان کا بھتیجا جیل میں ملاقات کو آیا اور ان سے کہا کہ جیلر تک بآسانی سفارش پہنچائی جاسکتی ہے۔ اگر آپ کا جی کسی خاص کھانے مثلاً زردہ یا دہی بڑے' شوق کی مثنوی' سگرٹ یا مہوبے کے پان کو چاہے تو چوری چھپے ہفتے میں کم از کم ایک بار آسانی سے پہنچایا جاسکتا ہے۔ چچی نے تاکید سے کہا ہے۔ عید نزدیک آرہی ہے۔ رو رو کر آنکھیں سجالی ہیں۔

قبلہ نے جیل کے کھدر کے نیکر پر دوڑتا ہوا کھٹمل پکڑتے ہوئے کہا' مجھے قطعی کسی چیز کی حاجت نہیں۔ اگلی دفعہ آؤ تو سراج فوٹو گرافر سے حویلی کا فوٹو کھنچوا کے لے آنا۔ کئی مہینے ہو گئے دیکھے ہوئے۔ جدھر تمہاری چچی کے کمرے کی چق ہے' اس رخ سے کھینچے تو اچھی آئے گی۔

سنتری نے زمین پر زور سے بوٹ کی تھاپ لگاتے اور تھری ناٹ تھری رائفل کا کندہ بجاتے ہوئے ڈپٹ کر کہا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا۔ عید کا خیال کر کے بھتیجے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ قبلہ نے اس کا کان پکڑا اور کھینچ کر اپنے منہ تک لانے کے بعد کہا' ہاں! ہو سکے تو جلد ایک تیز چاقو' کم از کم چھ انچ کے پھل والا' ڈبل روٹی یا عید کی سویوں میں چھپا کر بھجوا دو۔ دوم' بمبئی میں Pentangular☆ شروع ہونے والا ہے۔ کسی

☆Pentangular : بمبئی میں سالانہ کرکٹ ٹورنامنٹ ہوتا تھا' جس میں ہندو' مسلم' پارسی' اینگلو انڈین اور یوروپین ٹیمیں حصہ لیتی تھیں۔

ترکیب سے مجھے روزانہ اسکور معلوم ہو جائے تو اللہ! ہر روز روزہ عید ہو' ہر شب شب برات! خصوصاً وزیر علی کا اسکور دن کے دن معلوم ہو جائے تو کیا کہنا۔

سزا ہو گئی۔ ڈیڑھ سال قید بامشقت۔ فیصلہ سنا۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ گویا آسمان سے پوچھ رہے ہوں ''تو دیکھ رہا ہے! یہ کیا ہو رہا ہے؟ "How's that?" پولیس نے ہتھکڑی ڈالی۔ قبلہ نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ جیل جاتے وقت بیوی کو کہلا بھیجا کہ آج میرے جداعلیٰ کی روح پرفتوح کتنی مسرور ہو گی۔ کتنی خوش نصیب بی بی ہو تم کہ تمہارا دولہا (جی ہاں! یہی لفظ استعمال کیا تھا) ایک حرامزادے کی ٹھکائی کر کے مردوں کا زیور پہنے' جیل جا رہا ہے۔ لکڑی کی ٹانگ لگوا کر گھر نہیں آ رہا۔ دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھنا۔ بھتیجے کو تاکید کی کہ حویلی کی مرمت کراتے رہنا۔ اپنی چچی کا خیال رکھنا۔ ان سے کہنا' یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ دل بھاری نہ کریں اور جمعہ کو کاسنی دوپٹا اوڑھنا نہ چھوڑیں۔

بیوی نے پچھوایا' اب کیا ہوئے گا؟

جواب ملا' دیکھا جائے گا

ٹارزن کی واپسی

دو سال تک دکان میں تالا پڑا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد چپ چپاتے کہیں اور چلے جائیں گے۔ قبلہ جیل سے چھوٹے۔ ذرا جو بدلے ہوں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں جوڑ نہیں تھے۔ جاپانی زبان میں کہاوت ہے کہ بندر درخت سے زمین پر گر پڑے' پھر بھی بندر ہی رہتا ہے۔ سو وہ بھی ٹارزن کی طرح !A Auuaauuuu چنگھاڑتے جیل سے نکلے۔ سیدھے اپنے آبائی قبرستان گئے۔ والد کی قبر کی پائنتی کی خاک سر پر ڈالی۔ فاتحہ پڑھی اور کچھ سوچ کر مسکرا دیے۔ دوسرے دن دکان کھولی۔ کیبن کے باہر ایک بلی گاڑ کر اس پر ایک لکڑی کی ٹانگ بڑھئی سے بنوا کر لٹکا دی۔ صبح و شام اس کو رسی سے کھینچ کر اس طرح چڑھاتے اور اتارتے تھے جس طرح اس زمانے میں چھاؤنیوں میں یونین جیک چڑھایا اتارا جاتا تھا۔ جن نادہندوں نے دو سال سے رقم دبا رکھی تھی انہیں یاددہانی کے دھمکی آمیز خطوط لکھے۔ اور اپنے دستخطوں کے بعد بریکٹ میں (سزا یافتہ) لکھا۔ جیل جانے سے پہلے خطوط میں خود کو بڑے فخر سے ''ننگ اسلاف'' لکھا کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس سے اتفاق کرے۔ اتفاق تو درکنار' مارے ڈر کے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اپنے نام کے ساتھ ننگ اسلاف کے بجائے ''سزا یافتہ'' اس طرح لکھنے لگے جیسے لوگ ڈگریاں یا خطاب لکھتے ہیں۔ قانون اور جیل سے ان کی جھجک نکل چکی تھی۔

تو قبلہ جیسے گئے تھے ویسے ہی جیل کاٹ کر واپس آ گئے۔ طنطنے اور آواز کے کڑکے میں ذرا فرق

نہ آیا۔ اس اثنا میں اگر زمانہ بدل گیا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ اب ان کی رائے میں قطعیت کے علاوہ فقطیت بھی پیدا ہوگئی۔ ان کا فرمایا ہوا مستند تو پہلے ہی تھا' اب حتمی بھی ہوگیا۔ سیاہ مخمل کی رامپوری ٹوپی اور زیادہ ترچھی ہوگئی۔ یعنی اتنی جھکا کر ٹیڑھی اوڑھنے لگے کہ دائیں آنکھ ٹھیک سے نہیں کھول سکتے تھے۔ اب بھی بیوی گھبرا کے ''اب کیا ہوئے گا؟'' کہتیں تو وہ ''دیکھتے ہیں'' کے بجائے ''دیکھ لیں گے'' اور ''دیکھتی جاؤ'' کہنے لگے۔ رہائی کے دن نزدیک آئے تو داڑھی کے علاقے کے بال بھی گپھے دار مونچھوں میں شامل کر لئے جواب اتنی گھنی ہوگئی تھیں کہ ایک ہاتھ سے پکڑ کر نہیں اٹھاتے' تب کہیں دوسرے ہاتھ سے منہ میں لقمہ رکھ پاتے تھے۔ جیل ان کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ فرماتے تھے'' یہیں تیسری بیرک میں ایک منشی فاضل پاس جعلیا ہے۔ فصاحت یار خاں۔ غبن اور دھوکہ دہی میں تین سال کی کاٹ رہا ہے۔ با مشقت۔ پہلے شعلہ' اب حزیں تخلص کرتا ہے۔ بلا کا بسیار گو۔ چکی پیستے میں اپنی ہی تازہ غزل گاتا رہتا ہے۔ موٹا پیستا ہے اور پٹتا ہے۔ اب یہ کوئی شاعری تو ہے نہیں۔ تس پر خود کو غالب سے کم نہیں سمجھتا۔ حالاں کہ مماثلت صرف اتنی ہے کہ دونوں نے جیل کی ہوا کھائی۔ خود کو روہیلہ بتاتا ہے۔ ہوگا۔ لگتا نہیں۔ قیدیوں سے بھی منہ چھپائے پھرتا ہے۔ اپنے بیٹے کو ہدایت کر رکھی ہے کہ میرے بارے میں کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ والد صاحب عارضی طور پر نقل مکانی کر گئے ہیں۔ جیل کو کبھی جیل نہیں کہتا۔ زنداں کہتا ہے۔ اور خود کو قیدی کے بجائے اسیر! ارے صاحب! غنیمت ہے جیلر کو عزیز مصر نہیں کہتا۔ اسے تو چکی کو آسیا کہنے میں بھی عار نہ ہوتی' مگر میں تو جانوں پاٹ کی عربی معلوم نہیں۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ استفراغ اور اسہال کہنے سے قے دست تو بند نہیں ہوتے، بدبو جاتی رہتی ہے۔ ٹھیک ہی سمجھتا ہے۔ کس واسطے کہ اس کے باپ کا انتقال ہیضے میں ہوا تھا۔ ارے صاحب! میں یہاں کسی کی جیب کاٹ کے تھوڑا ہی آیا ہوں۔ شیر کو پنجرے میں قید کر دو' تب بھی شیر ہی رہتا ہے۔ گیدڑ کو کچھار میں آزاد چھوڑ دو' اور زیادہ گیدڑ ہو جائے گا۔ اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ جیل کا گھٹنا (گھٹنوں تک نیکر) پہنتے ہی طبیعت میں سوز و گداز پیدا ہو جائے''۔ بلکہ ہمیں تو قبلہ کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ پھٹا ہوا کپڑا پہننے اور جیل میں قیام فرمانے کو سنت یوسفی سمجھتے ہیں۔ ان کے مزاج میں جو ٹیڑھ تھی' وہ کچھ اور بڑھ گئی۔ کوے پر کتنے ہی صدمے گزر جائیں' کتنا ہی بوڑھا ہو جائے' اس کے پر و بال کالے ہی رہتے ہیں۔ اکل کھرے، کھرے، کھردرے کھرے یا کھوٹے، وہ جیسے کچھ بھی تھے، ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔

تن اُجرا (اُجلا) من گادلا (گدلا) بگلا جیسے بھیس

ایسے سے کاگا بھلے' باہر بھیتر ایک

فرماتے تھے، الحمدللہ! میں منافق، ریاکار نہیں۔ میں نے گناہ ہمیشہ گناہ سمجھ کر کیا۔

دکان دو سال سے بند پڑی تھی۔ چھوٹ کر گھر آئے تو بیوی نے پوچھا:

''اب کیا ہوئے گا:؟''

''بیوی، ذرا تم دیکھتی جاؤ۔''

''لب معشوق''

اب کے دکان چلی اور ایسی چلی کہ اوروں ہی کو نہیں خود انہیں بھی حیرت ہوئی۔ دکان کے باہر اسی شکارگاہ یعنی کیبن میں اسی ٹھسے سے گاؤ تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ مگر زاویہ پسر گیا تھا۔ پیروں کا رخ اب فرش کی بہ نسبت آسمان کی طرف زیادہ تھا۔ جیل میں سکونت پذیر ہونے سے پہلے قبلہ گاہک کو ہاتھ کے ملتجیانہ اشارے سے بلایا کرتے تھے۔ اب صرف انگشت شہادت کے خفیف سے اشارے سے طلب کرنے لگے۔ انگلی کو اس طرح حرکت دیتے جیسے ڈانواں ڈول پتنگ کو ٹھمکی دے کر اس کا قبلہ درست کر رہے ہوں۔ حقے کی نے میں اب ایک فٹ کا اضافہ کرلیا۔ حقہ اب پیتے کم' گڑگڑاتے زیادہ تھے۔ بدبودار دھوئیں کا چھلا اس طرح چھوڑتے کہ گاہک کی ناک میں نتھ کی طرح لٹک جاتا۔ اکثر فرماتے ''واجد علی شاہ' جان عالم پیا نے جو خوبصورت نام رکھنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے' حقے کا کیسا پیارا نام رکھا تھا......لب معشوق! جو شخص کبھی حقے کے پاس سے بھی گزرا ہے' وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جان عالم پیا کا پالا کیسے لبوں سے پڑا ہوگا۔ چنانچہ معزولی کے بعد وہ فقط حقہ اپنے ہمراہ مٹیا برج لے گئے۔ پری خانے کے تمام معشوق لکھنو میں ہی چھوڑ گئے۔ اس لئے کہ معشوق کو نیچہ پکڑ کے گڑگڑایا نہیں جا سکتا۔

''بلی پہ لٹکا دوں گا''

منشی دیا نرائن نگم کے رسالے ''زمانہ'' کے کاتب سے عرفی کا مشہور شعر احاطے کی دیوار پر ڈامر سے لکھوا دیا:

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدارا ☆

ہمیں اس شعر سے نسلی عصبیت اور جانبداری کو بو آتی ہے۔ کتے اگر شعر کہہ سکتے تو دوسرا مصرع کچھ یوں ہوتا:

آواز گدا کم نہ کند رزق سگاں را (+)

☆ مطلب یہ کہ عرفی تو رقیبوں کے شور و غوغا کرنے سے اندیشے میں مبتلا نہ ہو۔ کتوں کے بھونکنے سے گدا کا رزق کم نہیں ہوتا۔

(+) گدا کی صدا سے کتوں کا رزق کم نہیں ہوتا۔

کچھ دن بعد ان کا لنگڑا دشمن یعنی پہلوان سیٹھ دکان بڑھا کر کہیں اور چلا گیا۔ قبلہ بات بے بات ہر ایک کو دھمکی دینے لگے کہ سالے کو بلی پہ لٹکا دوں گا۔ ہیبت کا یہ عالم کہ اشارہ تو بہت بعد کی بات ہے، قبلہ جس گاہک کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھ لیں، اسے کوئی دوسرا نہیں بلاتا تھا۔ اگر وہ از خود دوسری دکان میں چلا بھی جائے تو دکاندار اسے لکڑی نہیں دکھاتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سڑک پر یوں ہی کوئی راہ گیر منہ اٹھائے جا رہا تھا کہ قبلہ نے اسے انگلی سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جس دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا تھا، اس کا مالک اور منیم اسے گھسیٹتے ہوئے قبلہ کی دکان میں اندر دھکیل گئے۔ اس نے قبلہ سے روہانسا ہو کر کہا کہ میں تو مول گنج پتنگوں کے پیچ دیکھنے جا رہا تھا!

۵

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

پھر یکایک ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ وہ کٹر مسلم لیگی تھے۔ اس کا اثر ان کی بزنس پر پڑا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ انہوں نے اپنے نعرے کو حقیقت بنتے دیکھا۔ اور دونوں کی پوری قیمت ادا کی۔ گاہکوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ لکڑ منڈی کے چوہے شیر ہو گئے۔ عزیز و اقارب، جن سے وہ تمام عمر لڑتے جھگڑتے اور نفرت کرتے رہے، ایک ایک کر کے پاکستان چلے گئے تو ایک جھٹکے کے ساتھ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان نفرتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور جب اکلوتی بیٹی اور داماد بھی اپنی دکان بیچ کھوچ کے کراچی سدھارے تو انہوں نے بھی اپنے خیمے کی طنابیں کاٹ ڈالیں۔ دکان اونے پونے ایک دلال کے ہاتھ بیچی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ''بے نامی'' سودا ہے۔ دلال کی آڑ میں دکان دراصل اسی لنگڑے پہلوان سیٹھ نے خرید کر ان کی ناک کاٹی ہے۔ خفیف سا شبہ تو قبلہ کو بھی ہوا تھا، مگر ''اپنی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے'' والی صورت حال تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں پیڑھیوں کے رشتے ناتے ٹوٹ گئے اور قبلہ نے پرکھوں کی جنم بھوم چھوڑ کر ان کے خوابوں کی سرزمین کا رخ کیا۔

ساری عمر شیش محل میں اپنی مور پنکھ انا کا ناچ دیکھتے دیکھتے، قبلہ ہجرت کر کے کراچی آئے تو نہ صرف زمین اجنبی لگی، بلکہ اپنے پیروں پر نظر پڑی تو وہ بھی کسی اور کے لگے۔ کھولنے کو تولی مارکٹ میں ہر چند رائے روڈ پر لستم پشتم دکان کھول لی، مگر بات نہیں بنی۔ گجراتی میں مثل ہے کہ پرانے مٹکے پر نیا منہ نہیں چڑھایا جا سکتا۔ آنے کو تو وہ ایک نئی سرسبز زمین میں آ گئے، مگر ان کی بوڑھی آنکھیں پلکھن کو ڈھونڈتی رہیں۔ پلکھن تو در کنار انہیں تو کراچی میں نیم تک نظر نہ آیا۔ لوگ جسے نیم بتاتے تھے وہ دراصل بکائن تھی جس کی 'بنولی' کو لکھنو میں حکیم صاحب عالم، پیچش اور بواسیر کے نسخوں میں لکھا کرتے تھے۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

کہاں کانپور کے دیہاتی گاہک' کہاں کراچی کے نخریل ساگوان خریدنے والے۔ درحقیقت انہیں جس بات سے سب سے زیادہ تکلیف ہوئی وہ یہ تھی کہ یہاں اپنے قرب و جوار میں' یعنی اپنے سایہ زحمت میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے وہ بے وجہ و بے خطر گالی دے سکیں۔ ایک دن کہنے لگے'' یہاں تو بڑھی آری کا کام زبان سے لیتا ہے۔ چار پانچ دن ہوئے۔ ایک دریدہ دہن بڑھی آیا۔ اقبال مسیح نام تھا۔ میں نے کہا' ابے! پرے ہٹ کر کھڑا ہو۔ کہنے لگا' حضرت عیسیٰ بھی تو ترکھان تھے۔ میں نے کہا' کیا کفر بکتا ہے؟ ابھی بلی پہ لٹکا دوں گا۔ کہنے لگا' اوہ لوک وی ایہی کہیندے ساں! (وہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ سے یہی کہتے تھے!)

میر تقی میر کراچی میں

پہلی نظر میں انہوں نے کراچی کو اور کراچی نے ان کو مسترد کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے کراچی میں کیڑے ڈالتے۔ شکایت کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا:

''حضت! یہ مچھر ہیں یا مگر مچھ؟ کراچی کا مچھر ڈی ڈی ٹی سے بھی نہیں مرتا۔ صرف قوالوں کی تالیوں سے مرتا ہے۔ یا غلطی سے کسی شاعر کو کاٹ لے تو باؤلا ہو کر بے اولاد مرتا ہے۔ نمرود مردود کی موت ناک میں مچھر گھسنے سے واقع ہوئی تھی۔ کراچی کے مچھروں کا شجرۂ نسب کئی نمرودوں کے واسطے سے اسی مچھر سے جا ملتا ہے۔ اور ذرا زبان تو ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے پہلی مرتبہ ایک صاحب کو پٹے والے کو پکارتے سنا تو میں سمجھا اپنے کتے کو بلا رہے ہیں۔ معلوم ہوا یہاں چپراسی کو پٹے والا کہتے ہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ پھڈا اور لفڑا ہوتا رہتا ہے۔ ٹوکو تو کہتے ہیں' اُردو میں اس صورتحال کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ بھائی میرے! اردو میں یہ صورت حال بھی تو نہیں ہے۔ بمبئی والے لفظ اور صورت حال دونوں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ میر تقی میر اونٹ گاڑی میں منہ باندھے بیٹھے رہے۔ اپنے ہم سفر سے اس لئے بات نہ کی کہ ''زبان غیر سے اپنی زباں بگڑتی ہے''۔ میر صاحب کراچی میں ہوتے تو بخدا ساری عمر منہ پر ڈھاٹا باندھے پھرتے' یہاں تک کہ ڈاکوؤں کا سا بھیس بنائے پھرنے پر کسی ڈکیتی میں دھر لئے جاتے۔ اماں! ٹونک والوں امرود کو صفریٰ کہتے تو ہم نے بھی سنا تھا۔ یہاں امرود کو جام کہتے ہیں۔ اور اس پر نمک مرچ کے بجائے' صاحب' لگا دیں تو مراد نواب صاحب لسبیلہ ہوتے ہیں۔ اپنی طرف وکٹوریہ کا مطلب ملکہ ٹوریہ ہوتا تھا۔ یہاں کسی ترکیب سے دس بارہ جنے ایک گھوڑے پر سواری گانٹھ لیں تو اسے وکٹوریہ کہتے ہیں۔ میں دو دن لاہور رُکا تھا۔ وہاں دیکھا کہ جس بازار میں کوئلوں سے منہ کالا کیا جاتا ہے، وہ ہیرا منڈی کہلاتی ہے! اب یہاں نیا فیشن چل پڑا ہے۔ گانے والے کو گلوکار اور لکھنے والے کو قلم کار کہنے لگے ہیں۔ میاں! ہمارے وقتوں میں تو صرف نیکوکار اور بدکار ہوا کرتے تھے۔ قلم اور گلے سے یہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔

''میں نے لالوکھیت، بہار کالونی، چاکی واڑہ گولیمار کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ آدمی (اخبار والے اب آدمی کو آدمی کہنے سے شرماتے ہیں۔ افراد اور نفوس کہتے ہیں!) ضرور رہتے ہوں گے۔ لیکن کہیں کتابوں اور عطریات کی دکان نہ دیکھی۔ کاغذ تک کے پھول نظر نہ آئے۔ کانپور میں ہم جیسے شرفا کے گھروں میں کہیں نہ کہیں موتیا کی بیل ضرور چڑھی ہوتی تھی۔ حضور والا! یہاں موتیا صرف آنکھوں میں اترتا ہے! حد ہوگئی، کراچی میں لکھ پتی، کروڑ پتی سیٹھ لکڑی اس طرح تلواتا ہے کہ گویا کم خواب کا پارچہ خرید رہا ہے۔ لکڑی دن میں دو فٹ بکتی ہے اور برادہ خریدنے والے پچاس! میں نے برسوں اُپلوں پر پکایا ہوا کھانا بھی کھایا ہے۔ لیکن برادے کی انگیٹھی پر جو کھانا پکے گا وہ صرف دوزخی مردوں کے چالیسویں کے لئے مناسب ہوگا۔

''بھر پائے ایسی بزنس سے! مانا کہ روپیہ بہت کچھ ہوتا ہے، مگر سب کچھ تو نہیں۔ زر کو حاجت روا کرنے والا، قاضی الحاجات کہا گیا ہے۔ تسلیم۔ مگر جب یہ خود سب سے بڑی حاجت بن جائے تو وہ صرف موت سے رفع ہوگی۔ میں نے تو زندگی میں ایسی کانی کھتری لکڑی نہیں بیچی۔ نہ فرو ختنی، نہ سوختنی۔ بڑھئی کی یہ مجال کہ چھاتی پہ چڑھ کر کمیشن مانگے۔ نہ دو تو مال کو گندے انڈے کی طرح قیامت تک سیتے رہو۔ ہائے! نہ ہوا کانپور! بسولے سے سالے کی ناک اتار کر ہتھیلی پر رکھ دیتا کہ جا! اپنی جروا کو دین مہر میں دے دینا! واللہ! یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سنتا ہوں یہاں کے بازار حسن نیپیئر روڈ اور جاپانی روڈ پر شب زاویاں اپنے اپنے درشن دریچوں میں لال بتیاں جلتے ہی خنجراب چھاتیوں کے خوانچے لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ فلموں میں بھی اشرف المعلقات ہی کی نمائش ہوتی ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ اوچھے کے گھر تیتر، باہر باندھوں کہ بھیتر۔ جمہوریہ اسلامیہ کی سرکار بے سروکار کچھ نہیں کہتی۔ لیکن کسی طوائف کو شادی بیاہ میں مجرے کے لئے بلانا ہو تو پہلے اس کی اطلاع تھانہ متعلقہ کو دینی پڑتی ہے! رنڈی کو پرمٹ راشن کارڈ پہ ملتے ہم نے یہیں دیکھا۔ نقد عیش عندالطلب نہ ملا تو کس کام کا۔ درشنی منڈیوں میں درشنی ہنڈیوں کا کیا کام''۔

مرزا عبدالودود بیگ اس صورت حال کی کچھ اور ہی تاویل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائف کو تھانے سے NOC (نو ابجکشن سر ٹیفکیٹ) اس لئے لینا پڑتا ہے کہ پولیس پوری طرح اطمینان کر لے کہ وہ اپنے دھندے پر ہی جا رہی ہے۔ وعظ سننے یا سیاست میں حصہ لینے نہیں جا رہی۔

ایک دن قبلہ فرمانے لگے ''ابھی کچھ دن ہوئے۔ کراچی کی ایک نامی گرامی طوائف کا گانا سننے کا اتفاق ہوا۔ اماں! اس کا تلفظ تو چال چلن سے بھی زیادہ خراب نکلا۔ ہائے! ایک زمانہ تھا کہ شرفا اپنے بچوں کو ادب آداب سیکھنے کے لئے چوک کی طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجتے تھے۔''

اس باب میں بھی مرزا سوءظن سے کام لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر تو اس لئے

بھیجتے تھے کہ بزرگوں کی صحبت اور گھر کے ماحول سے بچے رہیں!

دوڑتا ہوا درخت

کراچی شہر انہیں کسی طور اور کسی طرف سے اچھا نہیں لگا۔ جھنجھلا کر بار بار کہتے ''اماں! یہ شہر ہے یا جہنم؟'' مرزا کسی دانا کے قول میں تصرف بیجا کر کے فرماتے ہیں کہ قبلہ اس دارالمحن سے کوچ فرمانے کے بعد اگر خدانخواستہ وہیں پہنچ گئے جس سے کراچی کو تشبیہ دیا کرتے تھے تو چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد یہی ارشاد ہوگا کہ ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا سا جہنم ہے۔ جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا!

ایک دفعہ ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا کہ ''تمہیں معاشرے میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں تو بیٹھے بیٹھے ان پر کڑھنے کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرو۔''

ارشاد فرمایا ''سنو! میں نے ایک زمانے میں پی ڈبلیو ڈی کے کام بھی کیے ہیں' مگر دوزخ کی ایئر کنڈیشننگ کا ٹھیکہ نہیں لے سکتا۔''

بات صرف اتنی تھی کہ اپنی چھاپ' تلک اور چھب چھنوانے سے پہلے وہ جس آئینے میں خود کو دیکھ دیکھ کر ساری عمر اترایا کیے' اس میں جب نئی دنیا اور نئے وطن کو دیکھا تو وہ امتداد زمانہ سے ☆ distorting mirror بن چکا تھا جس میں ہر شکل اپنا ہی منہ چڑاتی نظر آتی تھی۔

ان کے کاروباری حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ بزنس نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کی دکان کی دیوار پر ایک تازہ وصلی آویزاں دیکھ کر ہمیں بڑا دکھ ہوا:

نہ پوچھ حال مرا' چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

ہم نے ان کا دل بڑھانے کے لئے کہا' آپ کو چوب خشک کون کہہ سکتا ہے؟ آپ کی جواں ہمتی اور مستعدی پر ہمیں تو رشک آتا ہے۔ خلاف معمول مسکرائے۔ جب سے ڈینچر ز ٹوٹے' منہ پہ رومال رکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ کہنے لگے۔'' ہاں میاں! آپ جوان آدمی ہیں۔ اپنا تو یہ احوال ہوا کہ

''منفعل'' ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں ''ابتذال'' کہاں

پھر منہ سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا ''برخوردار! میں وہ درخت ہوں جو ٹرین میں جاتے ہوئے مسافر کو دوڑتا ہوا نظر آتا ہے''۔

☆ ہم نے کہیں اور اس کا ترجمہ ''مسخائینہ'' کیا ہے۔ یعنی وہ آئینہ جس کا کام ہی مشکل کو مسخ کرنا اور مضحکہ خیز بنانا ہے۔

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا

یوں وہ حتی الامکان اپنے غصے کو کم نہیں ہونے دیتے تھے۔ کہتے تھے، میں ایسی جگہ ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتا جہاں آدمی کسی پر غصہ ہی نہ ہو سکے۔ اور جب انہیں ایسی ہی جگہ رہنا پڑا تو وہ زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے روٹھے۔ اب وہ آپ کڑھتے۔ اندر ہی اندر کھولتے، جلتے، سلگتے رہتے:

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا

میں ہی اگنی، میں اپنی ایندھن

انہی کا قول ہے کہ یاد رکھو، غصہ جتنا کم ہوگا، اس کی جگہ اُداسی لیتی چلی جائے گی۔ اور یہ بڑی بزدلی کی بات ہے۔ بزدلی کے ایسے ہی اداس لمحوں میں اب انہیں اپنا آبائی گاؤں جہاں بچپن گزرا تھا، بے تحاشہ یاد آنے لگتا۔ واماندگی زیست نے ماضی میں اپنی پناہیں تراش لیں۔ گویا البم کھل گیا۔ دھندلاتے سیپیا رنگ کی تصویریں چشم تصور کے سامنے بکھرتی چلی جاتیں۔ ہر تصویر کے ساتھ زمانے کا ورق الٹتا چلا گیا۔ ہر اسنیپ شاٹ کی اپنی ایک کہانی تھی: دھوپ میں ابرق کے ذروں سے چلکتی کچی سڑک پر گھوڑوں کے پسینے کی نرمہکار۔ بھیڑ کے نوزئیدہ بچے کو گلے میں مفلر کی طرح ڈالے شام کو خوش خوش لوٹتے کسان۔ چلمنوں کے پیچھے ہارسنگھار کے پھولوں سے رنگے ہوئے دوپٹے۔ ارہرے کے ہرے بھرے کھیت میں پگڈنڈی کی مانگ۔ خشک سالی میں ساون کے تھوتھے بادلوں کو رہ رہ کر تکتی نراس آنکھیں۔ جاڑے کی اجاڑ راتوں میں ٹھٹھرتے گیدڑوں کی منحوس آوازیں۔ چراغ جلے باڑے میں لوٹتی گاریوں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں۔ کالی بھنور رات میں چوپال کی جلتی بجھتی گشتی چلم پر طویل سے طویل تر ہوتے ہوئے کش۔ موتیا کے گجروں کی لپٹ کے ساتھ کنوارے پنڈے کی بگولا مہکار۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں تازہ قبر پر جلتی ہوئی اگربتی کا بل کھاتا دھواں۔ دہکتی بالو میں تڑختے چنوں کی سوندھی لپٹ سے پھڑکتے ہوئے نتھنے۔ میونسپلٹی کی مٹی کے تیل کی لالٹین کا بھبکا۔ یہ تھی ان کے گاؤں کی ست سگند۔ یہ ان کے اپنے نافہ ماضی کی مہکار تھی جو یادوں کے دشت میں دوانی پھرتی تھی۔

اولتی کی ٹپا ٹپ

ستر سالہ بچے کے ذہن میں تصویریں گڈ مڈ ہونے لگتیں۔ خوشبوئیں، نرماہٹیں اور آوازیں بھی تصویر بن بن کر ابھرتیں۔ اسے اپنے گاؤں میں مینہ برسنے کی ایک ایک آواز الگ سنائی دیتی۔ ٹین کی چھت پر تڑتڑ بجتے ہوئے تاشے۔ سوکھے پتوں پر کراری بوندوں کا شور۔ پکے فرش پر جہاں انگل بھر پانی کھڑا ہو جاتا، وہاں موٹی بوند گرتی تو ایک موتیوں کا تاج سا ہوا میں اچھل پڑتا۔ تپتی کھپریلوں پر اڑتی بدلی کے چھالے کی سنسناہٹ۔ گری دانوں سے اپڑے بالک بدن پر برکھا کی پہلی پھوار، جیسے کسی نے منتھول میں نہلا دیا ہو۔ جوان بیٹے کی قبر پر پہلی بارش اور ماں کا ننگے سر آنگن میں آ کر آسمان کی

طرف دیکھنا۔ پھبک اٹھنے کے لئے تیار مٹی پر ٹوٹ کے برسنے والے بادل کی ہراول گرم لپٹ۔ ڈھولک پر ساون کے گیت کی تال پر بجتی چوڑیاں اور بے تال قہقہے۔ سوکھے تالاب کے پیندے کی چکنی مٹی میں پڑی ہوئی دراڑوں کے لوزاتی جال میں ترساترسا کر برسنے والی بارش کے سرسراتے ریلے۔ تھونی سے لٹکی ہوئی لالٹین کے سامنے، تاحدِ روشنی' موتیوں کی رم جھم جھالر' ہمک ہمک کر پرائے آنگن میں گرتے پرنالے۔ آموں کے پتوں پر مجیرے بجاتی ترسل بوچھاڑ۔ اور جھولوں پر پینگیں لیتی دوشیزائیں۔

اور پھر رات کے سناٹے میں' پانی تھمنے کے بعد' سوتے جاگتے ہیں' اولتی ☆ کی ٹپاٹپ!

اولتی کی ٹپاٹپ تک پہنچتے پہنچتے قبلہ کی آنکھیں جل تھل ہوجاتیں۔ بارش تو ہم انہیں اپنے لاہور اور نتھیا گلی کی ایسی دکھا سکتے تھے کہ عمر رفتہ کی ساری ٹپاٹپ بھول جاتے۔ پر اولتی کہاں سے لاتے؟ اسی طرح آم تو ہم ملتان کا ایک سے ایک پیش کر سکتے تھے۔ دسہری۔ لنگڑا۔ ثمر بہشت۔ انور رٹول۔ لیکن ہمارے پنجاب میں تو ایسے درخت ناپید ہیں جن میں آموں کے بجائے دوشیزائیں لٹکی ہوئی ہوں۔ چنانچہ ایسے نازک موقعوں پر ہم خاموش' ہمہ تن گوش' بلکہ خرگوش بنے اولتی کی ٹپاٹپ سنتے رہتے۔

قبلہ کا ریڈیو اونچا سنتا تھا

دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے میں تو خیر کوئی نقصان نہیں۔ ہمارا مطلب ہے، دریا کا نقصان نہیں۔ لیکن قبلہ تو سیکڑوں فٹ کی بلندی سے گرتے ہوئے آبشار نیاگرا پر تیر کر چڑھنا چاہتے تھے۔ یا یوں کہیئے کہ تمام عمر نیچے اترنے والے ایس کے لیٹر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے رہے اور ایس کے لیٹر بنانے والے کو گالیاں دیتے رہے۔ ایک دن کہنے لگے۔ ''مشتاق میاں! یہ تمہارا کراچی بھی عجب مردم ناشناس شہر ہے۔ نہ خریداری کی تمیز۔ نہ خوردی کے آداب۔ نہ کسی کی بزرگی کا لحاظ ملاحظہ۔ میں جس زمانے میں بشارت میاں کے ساتھ بہار کالونی میں رہتا تھا' ایک بیٹری سے چلنے والا ریڈیو خرید لیا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو میں کار کی بیٹری لگانی پڑتی تھی۔ بہار کالونی میں بجلی نہیں تھی۔ اس کا رکھنا اور چلانا ایک دردِ سر تھا۔ بشارت میاں روزانہ بیٹری اپنے کارخانے لے جاتے اور چارج ہونے کے لئے آرا مشین میں لگا دیتے۔ سات آٹھ گھنٹے میں اتنی چارج ہوجاتی تھی کہ بس ایک آدھ گھنٹے بی بی سی سن لیتا تھا۔ اس کے بعد ریڈیو سے آرا مشین کی آوازیں آنے لگتیں اور میں اٹھ کر چلا آتا۔ گھر کے پچھواڑے ایک پچیس فٹ اونچی نہایت قیمتی' بے گانٹھ بلی گاڑ کر ایریل لگا رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ ریڈیو اونچا سنتا تھا۔ آئے دن پتنگ اڑانے والے لونڈے میرے ایریل سے پیچ لڑاتے۔ مطلب یہ کہ اس میں پتنگ الجھا کر زور آزمائی کرتے۔ ڈور ٹوٹ جاتی' ایریل خراب ہوجاتا۔ ارے صاحب، ایریل

☆ اولتی: چھپر یا کھپریل کا نچلا کنارا جہاں سے بارش کا پانی نیچے گرتا رہتا ہے۔

کیا تھا پتنگوں کا فضائی قبرستان تھا۔ اس پر یہ کٹی پتنگیں چوبیس گھنٹے اس طرح پھڑ پھڑاتی رہتیں جیسے سڑک کے کنارے کسی نوفوتیدہ پیر کے مزار پر جھنڈیاں۔ پچیس فٹ کی اونچائی پر چڑھ کر ایریل دوبارہ لگانا' نہ پوچھیے کیسا عذاب تھا۔ بس یوں سمجھئے سولی پہ لٹک کے بی بی سی سنتا تھا۔ بہر حال جب بزنس روڈ کے فلیٹ میں منتقل ہونے لگا تو سوچا' وہاں تو بجلی ہے۔ چلو ریڈیو بیچتے چلیں۔ بشارت میاں بھی عاجز آ گئے تھے۔ کہتے تھے، اس تو پتنگوں کی پھڑ پھڑاہٹ براڈ کاسٹ ہوتی رہتی ہے۔ ایک دور کے پڑوسی ۲۵۰ روپے میں سودا پکا ہوگیا۔ علی الصبح وہ نقد رقم لے آیا اور میں نے ریڈیو اس کے حوالے کردیا۔ رات کو گیارہ بجے پھاٹک بند کرنے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص اور اس کے بیل جیسی گردن والے دو بیٹے کدال پھاوڑا لئے مزے سے ایریل کی بلی اکھاڑ رہے ہیں۔ میں ڈپٹ کر پوچھا' یہ کیا ہو رہا ہے؟ سینہ زوری دیکھئے! کہتے ہیں بڑے میاں، بلی اکھاڑ رہے ہیں۔ ہماری ہے۔

''ڈھائی سو روپے میں ریڈیو بیچا ہے۔ بلی سے کیا تعلق؟'

''تعلق نہیں تو ہمارے ساتھ چلو اور ذرا بلی کے بغیر بجا کے دکھا دو۔ یہ تو اس کی accessory ہے۔''

''نہ ہوا کانپور۔ سالے کی زبان گدی سے کھینچ لیتا۔ اور ان حرامی پلوں کی بیل جیسی گردن ایک ہی وار میں بھٹا سی اڑا دیتا۔ میں نے تو زندگی میں ایسا بد معاملہ' بے ایمان آدمی نہیں دیکھا۔ اس اثنا میں وہ نابکار بلی اکھاڑ کے زمین پہ لٹال چکا تھا۔ ایک دفعہ جی میں تو آئی کہ اندر جا کر ۱۲ بور لے آؤں اور اسے بھی بلی کے برابر لمبا لٹال دوں۔ پھر خیال آیا کہ بندوق کا لائسنس تو ختم ہو چکا ہے۔ اور کمینے کے منہ کیا لگنا۔ اس کی بے قصور بیوی رانڈ ہو جائے گی۔ وہ زیادہ قانون چھانٹنے لگا تو میں نے کہا' جا! جا! تو کیا سمجھتا ہے؟ بلی کی حقیقت کیا ہے۔ یہ دیکھ یہ چھوڑ کے آئے ہیں۔''

قبلہ حویلی کی تصویر دکھاتے ہی رہ گئے اور وہ تینوں بلی اٹھا کر لے گئے۔

۶

معذور بیوی اور گشتی چلم

ان کی زندگی کا ایک پہلو ایسا تھا جس کا کسی نے ان کو اشارتاً بھی ذکر کرتے نہیں سنا ہم اس کی طرف ابتدائی حصے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ ان کی شادی بڑے چاؤ چونچلے سے ہوئی تھی۔ بیوی بہت خوبصورت نیک طینت اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ شادی کے چند سال بعد ایک ایسا مرض لاحق ہوا کہ پہنچوں تک دونوں ہاتھوں سے معذور ہو گئیں۔ قریبی اعزہ بھی ملنے سے گریز کرنے لگے۔ روزمرہ کی ملاقاتیں' شادی غمی میں شرکت' سبھی سلسلے رفتہ رفتہ منقطع ہو گئے۔ گھر کا سارا کام نوکر اور مامائیں تو نہیں کر سکتیں۔ قبلہ نے جس محبت اور دل سوزی سے تمام عمر بے عذر خدمت اور دیکھ ریکھ کی' اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی چوٹی بے گندھی اور دوپٹہ بے چنا ہوا۔ یا جمعہ کو کاسنی رنگ کا نہ ہو۔ سال گزرتے

چلے گئے۔ وقت نے سر پر کاسنی دوپٹے کے نیچے روئی کے گالے جمادیے۔ مگر ان کی توجہ اور پیار میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ایثار و رفاقت کا یہ پیکر وہی مغلوب الغضب آدمی ہے جو گھر کے باہر ایک چلتی ہوئی تلوار ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ ہو تو صبر اور سبھاؤ کی آزمائش کے ہزار مرحلے آتے ہیں۔ مگر انہوں نے اس معذور بی بی سے کبھی اونچی آواز میں بھی بات نہیں کی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی جھلاہٹ اور غیظ و غضب کی ابتدا اسی سانحہ معذوری سے ہوئی۔ وہ بی بی تو مصلے پر ایسی بیٹھیں کہ دنیا ہی میں جنت مل گئی۔ قبلہ کو نماز پڑھتے کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن زندگی بھر جیسی سچی محبت اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر جیسی بے عذر اور خاموش خدمت انہوں نے چالیس برس تک کی وہی ان کی عبادت و ریاضت، وہی ان کا ورد و وظیفہ اور وہی ان کی دعائے نیم شبی تھی۔ وہ بڑا بخشن ہار ہے۔ شاید یہی ان کا وسیلہ بخشائش بن جائے۔

ایک دور ایسا بھی آیا کہ بیوی سے ان کی پریشانی نہ دیکھی گئی۔ خود کہا' کسی رانڈ بیوہ سے شادی کرلو۔ بولے' ہاں! بھاگوان! کریں گے۔ کہیں دوگز زمین کا ایک ٹکڑا ہے جو نہ جانے کب سے ہماری برات کی راہ دیکھ رہا ہے۔ وہیں چار کاندھوں پہ ڈولا اترے گا۔ بیوی! مٹی سدا سہاگن ہے۔ سو جائیں گے اک روز زمیں اوڑھ کے ہم بھی۔

بیوی کی آنکھ میں آنسو دیکھے تو بات کا رخ پھیر دیا۔ وہ اپنی ساری 'امیجری' لکڑی' حقے اور تمباکو سے کشید کرتے تھے۔ بولے، بیوی! یہ رنڈ بیوی کی قید تم نے کیا سوچ کے لگائی؟ مانا کہ شیخ سعدی کہہ گئے ہیں، زن بیوہ مکن اگر چہ حوراست۔ مگر تم نے شاید وہ پوربی مثل نہیں سنی: پہلے بیوے بھکوا۔ پھ ربیوے تمکوا۔ پیچھے بیوے چلم چاٹ۔ یعنی جو شخص پہلے حقہ پیتا ہے وہ بدھو ہے کہ دراصل وہ تو چلم سلگانے اور تاؤ پر لانے میں ہی جتا رہتا ہے۔ تمباکو کا اصل مزہ تو دوسرے شخص کے حصے میں آتا ہے۔ اور جو آخر میں پیتا ہے وہ جلے ہوئے تمباکو سے خالی بھک بھک کرتا ہے۔

جدھر جائیں دہکتے جائیں

کراچی میں دکان تو پھر بھی تھوڑی بہت چلی' مگر قبلہ بالکل نہیں چلے۔ زمانے کے تغیر اور گردش پر کس کا زور چلا ہے جو ان کا چلتا۔ حوادث کو روا نہیں جاسکتا۔ ہاں' تہذیب حواس سے حوادث کا زور توڑا جاسکتا ہے۔ شخصیت میں پیچ پڑ جائیں تو دوسروں کے علاوہ خود کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ نکلنے لگیں تو اور زیادہ اذیت ہوتی ہے۔ کراچی ہجرت کرنے کے بعد اکثر فرماتے کہ ڈیڑھ سال جیل میں رہ کر جو تبدیلی مجھ میں نہ آئی وہ یہاں ایک ہفتے میں آگئی۔ یہاں تو بزنس کرنا ایسا ہے جیسے سنگھاڑے کے تالاب میں تیرنا۔ کانپور ہی کے چھٹے ہوئے چھاکٹے یہاں شیر بنے وندناتے پھرتے ہیں۔ اور اچھے اچھے شرفا ہیں ہ گیدڑ کی طرح دم کٹوا کے بھٹ میں جا بیٹھے۔ ایسا بجوگ پڑا کہ

خود بخود ''بل'' میں ہے ہر شخص سمایا جاتا

جو دانا ہیں وہ اپنی دمیں چھپائے بلوں میں گھسے بیٹھے ہیں۔ باہر نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس پر مرزا نے ہمارے کان میں کہا:

انیس ''دم'' کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ

ایک دوست نے اپنی آبرو جوکھم میں ڈال کر قبلہ سے کہا کہ گزرا ہوا زمانہ لوٹ کر نہیں آسکتا۔ حالات بدل گئے ہیں۔ آپ بھی خود کو بدلیے۔ مسکرائیے۔ فرمایا' خربوزہ خود کو گول کر لے تب بھی تربوز نہیں بن سکتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ زمانے کا رخ پہچاننے کی صلاحیت' حلم و بردباری' نرمی اور لچک نہ ان کی سرشت میں تھی' اور نہ زمیندارانہ ماحول اور معاشرے میں ان کا شمار خوبیوں میں ہوتا تھا۔ سختی' خودرائی' تمکنت' خشونت اور جلالی مزاج عیب نہیں بلکہ فیوڈل کردار کی راستی اور مضبوطی کی دلیل تصور کیے جاتے تھے۔ اور زمیندار تو ایک طرف رہے، اس زمانے کے علما تک ان اوصاف پر فخر کرتے تھے۔

ہم نہ نکہت ہیں' نہ گل ہیں' جو مہکتے جاویں
آگ کی طرح جدھر جاویں دہکتے جاویں

قبلہ کے حالات تیزی سے بگڑنے لگے تو ان کے بہی خواہ میاں انعام الٰہی نے جو اپنی خوردی کے باوصف ان کے مزاج اور معاملات میں درخور رکھتے تھے، عرض کیا کہ دکان ختم کر کے ایک بس خرید لیجئے۔ گھر بیٹھے آمدنی کا وسیلہ ہے۔ روٹ پرمٹ میرا ذمہ۔ آج کل اس دھندے میں بڑی چاندی ہے۔ یک بارگی جلال آ گیا۔ فرمایا چاندی تو طبلہ سارنگی بجانے میں بھی ہے۔ ایک وضع داری کی ریت بزرگوں سے چلی آ رہی ہے۔ جس کا تقاضا ہے کہ خراب و خوار ہی ہونا مقدر میں لکھا ہے تو اپنے آبائی اور آزمودہ طریقے سے ہوں گے۔ بندہ ایسی چاندی پر لات مارتا ہے۔

چرخ اب ہمیں جو دے ہے، نہیں لیتے ہم
کونین بھی گو دے ہے، نہیں لیتے ہم
ہم لیتے ہیں جس ڈھب سے، نہیں دیتا وہ
جس ڈھب سے کہ وہ دے ہے، نہیں لیتے ہم

آخری گالی

کاروبار مندا بلکہ بالکل ٹھنڈا۔ طبیعت زنگ رنگ ۔ بے دلی کے عالم میں دن گزر رہے تھے۔ دکانداری اب ان کی مالی نہیں، نفسیاتی ضرورت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دکان بند کر دی تو گھر میں پڑے کیا کریں گے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ ان کا نیا پٹھان ملازم زرین گل خان کئی گھنٹے دیر سے آیا۔ ہر چند غصے کو پینے کی کوشش کرتے، لیکن پرانی عادت کہیں جاتی ہے۔ چند ماہ قبل انہوں نے ایک ساٹھ

سالہ منشی آدھی تنخواہ پر رکھا تھا جو گیروے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا جبہ پہنے، ننگے پیر زمین پر آلتی پالتی مارے حساب کتاب کرتا تھا۔ کرسی یا کسی بھی اونچی چیز پر بیٹھنا اس کے مسلک میں منع تھا۔ وارثی سلسلے کے کسی بزرگ سے بیعت تھا۔ فرض شناس' ایمان دار' پابند صوم وصلوٰۃ' زود رنج' کام میں چوپٹ۔ قبلہ نے طیش میں آ کر ایک دن اسے حرامخور کہہ دیا۔ سفید داڑھی کا لحاظ بھی نہ کیا۔ اس نے رسان سے کہا'' بجا! حضور کے ہاں جو شے وافر ملتی ہے وہی تو فقیر کھائے گا۔ سلام علیکم''۔ یہ جا وہ جا۔ دوسرے دن سے منشی جی نے نوکری پر آنا اور قبلہ نے حرام خور کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن حرام خور کے علاوہ اور بھی تو دل دکھانے والے بہتیرے لفظ ہیں۔ زرین گل خان کو سخت سست کہتے کہتے ان کے منہ سے روانی اور سرگرانی میں وہی گالی نکل گئی جو اچھے دنوں میں ان کا تکیہ ہوا کرتی تھی گالی کی بھیا نگ گونج درہ آدم خیل کے پہاڑوں تک ٹھنٹھناتی پہنچی جہاں زرین گل کی بیوہ ماں رہتی تھی۔ وہ چھ سال کا تھا جب ماں نے بیوگی کی چادار اوڑھی تھی۔ بارہ سال کا ہوا تو اس نے وعدہ کیا تھا کہ ماں! میں اور بڑا ہو جاؤں تو کراچی میں نوکری کر کے تجھے پہلی تنخواہ سے بغیر پیوند کی چادر بھیجوں گا۔ اسے آج تک کسی نے یہ گالی نہیں دی تھی۔ جوان خون' غصیلا مزاج۔ پٹھان کی غیرت اور پختو کا سوال تھا۔ زرین گل خان نے ان کی ترچھی ٹوپی اتار کر پھینک دی اور چاقو تان کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا'' بڈھے! میرے سامنے سے ہٹ جا' نہیں تو ابھی تیرا پیٹ پھاڑ کے کلیجہ کچا چبا جاؤں گا۔ تیرا پلید مردہ بلی پہ لٹکا دوں گا۔''

ایک گاہک نے بڑھ کر چاقو چھینا۔ بڈھے نے جھک کر زمین سے اپنی مخملی ٹوپی اٹھائی اور گرد جھاڑے بغیر سر پر رکھ لی۔

کون کیسے ٹوٹتا ہے

دس پندرہ منٹ بعد وہ دکان میں تالا ڈال کر گھر چلے آئے اور بیوی سے کہہ دیا' اب ہم دکان نہیں جائیں گے۔ کچھ دیر بعدِ محلے کی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اور وہ دوسرے ہی اللہ اکبر پر وضو کر کے کوئی چالیس سال بعد نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو بیوی دھک سے رہ گئیں کہ خیر تو ہے۔ وہ خود بھی دھک سے رہ گئے، اس لئے کہ انہیں دو سورتوں کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ وتر بھی ادھورے چھوڑ کر سلام پھیر لیا کہ یہ تک یاد نہیں آ رہا تھا کہ دعائے قنوت کے ابتدائی الفاظ کیا ہیں۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آدمی اندر سے ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ اور یوں ٹوٹتا ہے! اور جب ٹوٹتا ہے تو اپنوں بے گانوں سے، حد یہ کہ اپنے سب سے بڑے دشمن سے بھی صلح کر لیتا ہے۔ یعنی اپنے آپ سے۔ اسی منزل پر بصیرتوں کا نزول ہوتا ہے۔ دانش وبینش کے باب کھلتے ہیں۔

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر

منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

ایسے بھی محتاط لوگ ہیں جو پیکار و فشار زیست سے بچنے کی خاطر خود کو بے عملی کے حصار عافیت میں قید رکھتے ہیں۔ یہ بھاری اور قیمتی پردوں کی طرح لٹکے لٹکے ہی لیرلیر ہو جاتے ہیں۔ کچھ کم صم گمبھیر لوگ اس دیوار کی مانند تڑختے ہیں جس کی مہین سی دراڑ جو عمدہ پینٹ یا کسی آرائشی تصویر سے بآسانی چھپ جاتی ہے۔ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ نیو اندر ہی اندر کسی صدمے سے زمین میں دھنس رہی ہے۔ بعض لوگ چینی کے برتن کی طرح ٹوٹتے ہیں کہ مسالے سے آسانی سے جڑ تو جاتے ہیں مگر بال اور جوڑ پہلے نظر آتا ہے، برتن بعد میں۔ اس کے برعکس کچھ ڈھیٹ اور چپکو لوگ ایسے اٹوٹ مادے کے بنے ہوتے ہیں کہ چیونگ گم کی طرح کتنا ہی چباؤ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتے۔ کھینچنے سے کھنچے ہیں، چھوڑے سے جاتے ہیں سکڑ۔ آپ انہیں حقارت سے تھوک دیں تو جوتے سے اس بری طرح چپکتے ہیں کہ چھٹائے سے نہیں چھوٹتے۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس سے تو دانتوں تلے ہی بھلے تھے کہ پپول تو لیتے تھے۔ یہ چیونگ گم لوگ خود آدمی نہیں، پر آدم شناس ہیں۔ یہ کامیاب و کامران و کامگار لوگ ہیں۔ یہ وہ ہیں جنھوں نے انسان کو دیکھا، پرکھا اور برتا ہے اور جب اسے کھوٹا پایا تو خود بھی کھوٹے ہو گئے۔ وقت کی اٹھتی موج نے اپنے حباب کا تاج ان کے سر پہ رکھا اور ساعت گزراں نے اپنے تخت رواں پہ بٹھایا۔

اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ کار کے ونڈ اسکرین کی مانند ہوتے ہیں۔ ثابت و سالم ہیں تو سینہ عارف کی طرح شفاف کہ دو عالم کا نظارہ کر لو۔ اور یکا یک ٹوٹے تو ایسے ٹوٹے کہ نہ بال پڑا، نہ درکے، نہ تڑخے۔ یکبارگی ایسے ریزہ ریزہ ہوئے کہ نہ عارف رہا نہ دو عالم کی جلوہ گری، نہ آئینے کا پتہ کہ کہاں تھا، کدھر گیا۔ نہ حذر رہا نہ خطر رہا، جو رہی تو بے خبری رہی۔

اور ایک انا ہے کہ یوں ٹوٹتی ہے جیسے جابر سلطانوں کا اقبال، یا حضرت سلیمان کا عصا جس کی ٹیک لگائے وہ کھڑے تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ لیکن ان کا قالب بے جان ایک مدت تک اسی طرح استادہ رہا اور کسی کو شبہ تک نہ گزرا کہ وہ رحلت فرما چکے ہیں۔ وہ اسی طرح بے روح کھڑے رہے اور ان کے اقبال اور رعب و دبدبہ سے کاروبار سلطنت حسب معمول سابق چلتا رہا۔ ادھر عصا کو دھیرے دھیرے گھن اندر سے کھاتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن وہ چٹاخ سے ٹوٹ گیا اور حضرت سلیمان کا جسد خاکی فرش زمین پر آرہا ہے۔ اس وقت ان کی امت اور رعیت پر کھلا کہ وہ دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں۔

سو وہ دیمک زدہ عصائے پندار و جلال جس کے بل قبلہ نے بے غل و غش زندگی گزاری آج شام ٹوٹ گیا اور زیست کرنے کا وہ طنطنہ اور ہمہمہ سرنگوں ہوا۔

میں پا بن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ

انہیں اس رات نیند نہیں آئی۔ فجر کی اذاں ہو رہی تھی کہ ٹمبر مارکٹ کا ایک چوکیدار ہانپتا کانپتا آیا اور خبر دی کہ ''صاحب جی! آپ کی دکان اور گودام میں آگ لگ گئی ہے۔ آگ بجھانے کے انجن تین بجے ہی آگئے تھے۔ سارا مال کوئلہ ہوگیا۔ صاحب جی! آگ کوئی آپ ہی آپ تھوڑی لگتی ہے۔'' وہ جس وقت دکان پہنچے تو سرکاری اصطلاح میں آگ پر قابو پایا جاچکا تھا' جس میں فائر بریگیڈ کی مستعدی اور کارکردگی کے علاوہ اس کو بھی بڑا دخل تھا کہ اب جلنے کے لئے کچھ رہا نہیں تھا۔ شعلوں کی لپلپاتی دوشاخہ زبانیں کالی ہو چلی تھیں۔ البتہ چیڑ کے تختے ابھی تک دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔ اور فضا دور دور تک ان کی تیز خوشبو کے آتشیں آبشار میں نہائی ہوئی تھی۔ مال جتنا تھا سب جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ صرف کونے میں ان کا چھوٹا سا دفتر بچا تھا۔ عرصہ ہوا' کانپور میں جب لالہ رمیش چندر نے ان سے کہا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ گودام کی انشورنس پالیسی لے لو، تو انہوں نے ململ کے کرتے کی چنی ہوئی آستین الٹ کر اپنے بازو کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں دکھاتے ہوئے کہا تھا ''یہ رہی یاروں کی انشورنس پالیسی!'' پھر اپنے ڈنٹر پھلا کر لالہ رمیش چندر سے کہا ''ذرا چھو کر دیکھو''۔ لالہ جی نے اچنبھے سے کہا ''لوہا ہے! لوہا!'' ''نہیں۔ فولاد کہو''۔

دکان کے سامنے خلقت کے ٹھٹ لگے تھے۔ ان کو لوگوں نے اس طرح راستہ دیا جیسے جنازے کو دیتے ہیں۔ ان کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ نہ لب بے سوال پر کوئی لرزش۔ انہوں نے اپنے دفتر کا تالا کھولا۔ انکم ٹیکس کے حسابات اور گوشوارے بغل میں مارے اور گودام کے مغربی حصے میں جہاں چیڑ سے ابھی شعلے اور خوشبوؤں کے لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ تیز تیز قدموں سے گئے۔ پہلے انکم ٹیکس کے کھاتے اور ان کے بعد چابیوں کا گچھا نذر آتش کیا۔ پھر آہستہ آہستہ، دائیں بائیں نظر اٹھائے بغیر، دوبارہ اپنے دفتر میں داخل ہوئے۔ حویلی کا فوٹو دیوار سے اتارا۔ رومال سے پونچھ کر بغل میں دبایا اور دکان جلتی چھوڑ کر گھر چلے آئے۔

بیوی نے پوچھا' اب کیا ہوئے گا؟

انہوں نے سر جھکا لیا۔

اکثر خیال آتا ہے، اگر فرشتے انہیں جنت کی طرف لے گئے جہاں موتیا دھوپ ہوگی اور کاسنی بادل' تو وہ باب بہشت پر کچھ سوچ کر ٹھٹک جائیں گے۔ رضوان جلد اندر داخل ہونے کا اشارہ کرے گا تو وہ سینہ تانے اس کے قریب جا کر کچھ دکھاتے ہوئے کہیں گے:

''یہ چھوڑ کر آئے ہیں''۔

☆☆☆

شاہ جی کی کہانی، دوسرے شاہ جی کی زبانی

صدورِ گرامی قدر، خواتین و حضرات!

شفیع عقیل دانا و جہاں دیدہ اور درویش بے ریا و ریش ہیں۔ اس تقریب دل پذیر کے لیے انہوں نے مروجہ دستور اور روایت کے مطابق ایک سرپرست اعلیٰ، ایک صدر، ایک مہمان خصوصی اور ایک مہمان اعزازی کو زحمت دینے کے بجائے چاروں کو کرسی صدارت پر بٹھا دیا۔ اس خوش گوار حالت ہم نشینی و مساوات منصبی کو presidium یا مجلس صدارت کہتے ہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود تمام

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

نظر بد دور، شفیع عقیل پچیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایسے طرح دار مصنف اور اس کی تصنیفات کا احاطہ کرنا ایک صدر کے بس کا کام نہیں۔ آج کل وفاقی دستور کے ضمن میں checks and balances کا بہت چرچہ ہے۔ اگر دستور پاکستان میں بھی ایک کے بجائے چار ہوتے تو جو انہونی بار بار ہوتی آئی ہے وہ نہ ہوتی، مثلاً خاں صاحب نے، میرا مطلب ہے غلام اسحاق خاں نے دو خودسر پرائم منسٹروں کو کھڑے کھڑے ڈِسمس کر دیا اور وہ دونوں اپنے مشیروں کے سروں پر کف افسوس مل مل کر افتخار عارف کے خوب صورت شعر کا خون کرتے ہوئے دیکھے گئے:

تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں

خان! بہت شرمندہ ہیں

پانچ سال ہونے کو آئے، میں نے اعلان کیا تھا کہ میں ادبی اعتکاف میں ہوں، صدارت سے معذور سمجھا جاؤں۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبوں میں مضمون پڑھنے کا نہ حوصلہ اور سلیقہ، نہ استعداد۔ آج اعتکاف شکنی کے بارے میں بس اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ:

لایا ہے ترا شوق مجھے حجرے سے باہر

زندگی میں صرف ایک ہی رونمائی میں بہ رضا و رغبت بلکہ بہ دلی فرحت شرکت کی ہے۔ مگر وہ غیر کتابی رونمائی تھی۔ یعنی اصلی اور نتیجہ خیز۔ ہمارے ہاں شادی بیاہ کی رسمیں خالی از علت و مصلحت نہیں ہوتیں، مثلاً رونمائی ہی کو لیجیے۔ دولہا اس وقت تک اپنے چہرے سے عیب پوش سہرا نہیں ہٹاتا جب

تک کہ رسم نکاح قانوناً مکمل نہ ہو جائے اور دلہن کے گواہ اور وکیل آکر سب کے سامنے یہ اعلان نہ کردیں کہ دلہن نے قبول کیا۔ اسی طرح دولہا دولہن ایک دوسرے کی شکل وصورت کو آئینے کی خرابی اور روشنی کی کمی پر محمول کرتے ہیں۔ ہماری پانچویں اور آخری زیر تصنیف کتاب کے بارے میں ہمارے یار طرح دار مرزا عبدالودود بیگ کی تجویز ہے کہ اب یہ لازمی قرار دے دینا چاہیے کہ تقریب اجرا کے دوران مصنف بہت دبیز اور گھا ہوا سہرا باندھے رہے گا تاکہ سامعین اسے شناخت نہ کرسکیں اور وہ ان کا فطری ردعمل دیکھ کر ہراساں نہ ہو۔

شفیع عقیل نے جب از راہ محبت مجلس صدارت میں شمولیت کی دعوت دی تو میں نے عرض کیا کہ مجھے تنقیدی یا تقریظی مضمون لکھنا نہیں آتا۔ دل کے آپریشن کے بعد ڈاکٹروں نے تقریر پر بھی پابندی لگا دی ہے۔ گویا تحریر و تقریر' دونوں سے معذور۔ بولے' اسی لیے تو آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ آپ کو قطعاً کچھ کہنا یا کرنا نہیں ہوگا' بس باوقار انداز سے خاموش بیٹھے رہیے گا'۔

عرض کیا ''حضرت! آپ مجھے تقریب اجرا کی صدارت کی دعوت دینے آئے ہیں یا صدر مملکت کی؟''

پھر عرض کیا کہ میں ڈائس پر بت بنا...... خاموش بیٹھا رہوں' یہ مجھے قبول نہیں' اس لیے کہ بت کا بھاری بھر کم اور قوت گویائی سے محروم ہونا ضروری ہے۔ پوجے جانے کی اہلیت رکھنا بھی لازمی ہے۔ یہ بات آپ سے پوشیدہ نہیں کہ میں علمی و تنقیدی مضمون لکھنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ نیز آپ کی ہمہ جہت اور جامع الحیثیات شخصیت سے صحیح معنوں میں واقفیت نہیں۔ کہنے لگے' میں اپنا تعارف آپ کرانے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا تعارف ایسے ہی خوبصورت طریقے سے کرایا جیسا کہ ایک سردار جی نے کرایا تھا' جن کے پڑوس میں ایک حسین خاتون نئی نئی آئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خود کو کس طرح متعارف کرائیں۔ بالآخر ایک انوکھی ترکیب سوجھی۔ ایک دن وہ گھر کے باہر کھڑی نظر آئی۔ یہ لپک کر گئے اور کہنے لگے' دیکھیے' آپ کی بکری میری گلابوں کی کیاری چر گئی'۔

'میری تو کوئی بکری نہین ہے!' وہ چونک کر بولی۔

'تو میری کون سی گلابوں کی کیاری ہے؟' سردار جی نے جواب دیا۔

تو جب خیالی بکری فرضی گلابوں کی کیاری پیٹ بھر کے چر چکی تو ہم نے شفیع عقیل کا ایک نہایت مفصل' بے تکلف اور دلچسپ انٹرویو ریکارڈ کیا' جس کے حوالے آپ کو اس مضمون میں جا بہ جا ملیں گے۔ اس کے علاوہ آج سے آٹھ برس پہلے جو مضمون 'مثنوی سیف الملوک' کی تعارفی تقریب میں پڑھا تھا' اس کے بھی چند اقتباسات پیش کروں گا۔ شفیع عقیل نے ڈھارس بندھائی کہ آپ خاطر جمع رکھیں' بیش تر حاضرین آپ کی میری عمروں کے ہوں گے اور ان کے حافظے بھی ہمارے جیسے ہوں

گے۔ لیکن اب جو سامعین کے شگفتہ و شاداب چہروں پر نظر ڈالتا ہوں تو ہم عمری کے دعوے کی تردید سب سے پہلے میری بیگم ہی کریں گی!......

میں نے اپنی دانست میں جو معقول عذر کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ میں نے تقریب اجرا میں متعارف ہونے والی تینوں کتابوں میں سے ایک بھی نہیں پڑھی۔ کتاب پڑھنے سے پہلے اگر اس پر گفتگو کروں گا تو بالکل الہامی معلوم ہوگی جس پر ضعیف العقیدہ سامعین ایمان نہیں لائیں گے۔ پڑھنے کے بعد جھوٹ بولنے کے لیے دگنی ذہانت درکار ہے، جس کا میں دعویٰ نہیں کرسکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ بقول بلھے شاہ:

جھوٹھ آکھاں تے کچھ بچدا اے

سچ آکھاں تے بھانبڑ مچدا اے

مطلب یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں تو پھر بھی کچھ بچتا ہے، سچ کہہ دوں تو شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔

کتابوں کے مطالعے سے محرومی کا فوری ازالہ تو انہوں نے اس طرح کردیا کہ دو کتابیں اسی وقت مرحمت فرمائیں اور تیسری کل رات کو۔ خود صاحب کتاب سے ملاقات بڑی باقاعدگی سے ہر پانچویں برس ہوجاتی ہے۔ مرزا کا قول ہے کہ جب کسی دوست یا شناسا سے عرصہ دراز تک ملاقات نہ ہو تو یقین جانو کہ وہ کراچی ہی میں ہے اور خیریت سے ہے! اگر لاہور یا کہیں اور ہوتا تو ضرور ملنے آتا۔ ایک اچھی بات ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں جانتے۔ اسی لیے ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے ہیں۔

شفیع عقیل مجھے 'شاہ جی' کہتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی 'خاں صاحب' کہہ کر میرے درجات بلند کرتے ہیں۔ میرے عزیز اور بے تکلف دوست مسرور حسن خان مجھے 'سید صاحب' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ تم مجھے سید صاحب کیوں کہتے ہو؟ فرمایا کہ معاف کرنا' جب یوسفی کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا طنز کررہا ہوں۔ اس لیے کہ حضرت یوسف سے تمہاری نسبت اور مشابہت صرف نام کی حد تک ہے۔ تمہیں دیکھ کر زلیخا کی سہیلیاں کبھی چاقو سے اپنے ہاتھ نہیں کاٹیں گی' نیبو ہی کاٹیں گی بلکہ بعضی بعضی تو نیبو تک کاٹنے سے انکار کردے گی۔

میں نے شفیع عقیل سے پوچھا' بندہ پرور! آپ مجھے شاہ جی کیوں کہتے ہیں جب کہ میں نے تو حاشا وکلا اپنے سوا کبھی کسی کو گم راہ نہیں کیا؟ فرمایا' خدا کی قسم' میں آپ کو شاہ جی احتراماً نہیں کہتا محض عادتاً کہتا ہوں۔ (یعنی مقصود اس عز و عقیدت نہیں مجھے)۔ ڈرائیور چپراسی اور ماسی کو بھی شاہ جی کہہ کر ہی بلاتا ہوں' وہ تو برا نہیں مانتے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا' دلی میں ایک کانفرنس کے دوران ایک سردار جی سے ملاقات ہوئی۔ میں انہیں بھی شاہ جی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ بہت خوش ہوتے تھے وقت رخصت بغل گیر

ہوئے۔ پھر مجھے اپنی ہڈی توڑ چھنی سے release کرتے ہوئے کہنے لگے کہ زندگی میں پہلی بار کسی نے عزت سے پکارا ہے! ورنہ سردار جی! سردار جی! سنتے سنتے میرے تو کان پک گئے۔

اب میں بھی شفیع عقیل کو شاہ جی کہنے لگا ہوں۔ خدا اور قارئین گواہ ہیں کہ میں بھی احتراماً نہیں کہتا بلکہ محض تکیہ تخاطب کے طور پر!

شفیع عقیل نے کبھی کسی اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ جس کا واحد سبب وہ غربت اور صرف غربت قرار دیتے ہیں۔ لیکن بے استادے کبھی نہیں رہے۔ انہیں وہ استاد کامل ملا جو شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ زمانے سے بہتر کوئی معلم اور استاد نہیں۔ کسی دانا کا قول ہے کہ جب آدمی نے جو کچھ پڑھا لکھا تھا وہ سب ذہن سے محو ہو جائے تو جو کچھ بچ رہے گا' اسے تعلیم کہتے ہیں یعنی اکوالف تجھے درکار۔ انہیں بچپن میں سگے ماموں نے اغوا کر کے بیگار لی۔ عرصے تک ان کی بھیڑ بکریاں چراتے رہے۔ عدالت کے ذریعے ان کی بازیابی عمل میں آئی۔ رہائی کے بعد انہوں نے کسی سے دو پیسے ادھار لے کر عید کارڈ خریدا' لیکن جس پڑھے لکھے شخص سے اس پر پتا اور پیغام لکھوانا چاہتے تھے اس نے ٹال مٹول کی تو انہوں نے کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا اور مصمم ارادہ کیا کہ اب میں پڑھ لکھ کر دکھاؤں گا۔ جب کچھ شد بد ہوئی تو سڑک پر پڑے ردی اخباروں کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر پڑھتے رہے۔ فرماتے ہیں کہ جیسے جیسے پڑھنے لگا' یوں محسوس ہوا جیسے زمین سے اٹھتا جا رہا ہوں! ۱۹۴۷ میں سڑکوں پر لاشیں پڑی ہوتی تھیں اور ٹرینوں سے بھی گاجر مولی کی طرح کٹی ہوئی لاشیں نکلتی تھیں۔ انہوں نے نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو کر لاشیں اٹھائیں۔ چنوں کی بوریاں ڈھو ڈھو کر مہاجروں میں راشن تقسیم کیا۔ مدتوں کوڑے کے ڈھیروں سے ٹین ڈبے اور بوتلیں جمع کرتے رہے۔ جلد سازی سیکھی۔ ایک دوست کی شراکت میں سائن بورڈ پینٹ کرنے کی دکان اس جگہ کھولی جہاں آج کل لاہور ٹی وی اسٹیشن واقع ہے۔ مدتوں بوجھ ڈھوئے۔ سڑک کے کنارے چھابڑی لگائی۔ ان کے والد راج مزدور تھے۔ بیٹے نے بھی ریت نبھائی' مزدوری کی اور غربت میں باوقار اور حوصلہ مند رہنے کا جاں گسل ہنر سیکھا۔ ایکٹر بننے کا شوق بھی چرایا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دھندے سارے کیے ہیں۔ ناکام نہیں گزرا۔ ہر کام جم کے کیا۔ رج کے کیا۔

۱۹۵۰ میں کراچی آئے تو ادیب فاضل کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ رخت سفر میں ایک رجسٹر تھا۔ جس کے افسانے مجید لاہوری کو بہت پسند آئے۔ مئی ۱۹۵۰ سے 'جنگ' اخبار میں کام کرنے لگے۔ وفاداری بہ شرط استواری کی زندہ و تابندہ مثال ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مئی ۲۰۰۰ میں 'جنگ' اخبار اپنے اس دیرینہ خادم و محسن کی گولڈن جوبلی شایان شان طریقے سے منائے۔ انہیں اس زمانے میں 'جنگ' سے ساٹھ روپے اور رسالہ 'نمک دان' سے پینسٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ

اس رقم کو کیسے اور کس مد میں خرچ کریں؟ ایک جھگی میں رہتے تھے۔ صدر سے پیر الٰہی بخش کالونی کا بس کا کرایہ پانچ پیسے تھا جو وہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

چنانچہ ابراہیم جلیس، عزیز کارٹونسٹ اور دو تین دوست مل کر نیو چالی سے کالونی تک گاتے بجاتے پیدل جاتے۔ بعد کو ایک کھولی میں رہنے لگے۔ ایک رضائی تھی جسے گرمیوں میں بچھا لیتے اور سردیوں میں سب دوست اوڑھ کر سو جاتے تھے۔ ہوٹل والا چار آنے ادھار پر کھلا دیتا تھا۔ اتوار کو ادھار کی 'لمٹ' بڑھا کر چھ آنے کر دیتا تھا۔

شفیع عقیل ہر اعتبار سے غیر معمولی انسان ہیں۔ جس عمر میں ہم جیسے گنہ گاروں کو شادی کی خواہش رسماً، شرعاً یا ضرورتاً محسوس ہوئی ہے، اس عمر میں ان کی ساری عمر کنوارا رہنے کی بڑی شدت سے خواہش ہوئی جو آج بھی بہ دستور قائم ہے۔ بھری جوانی میں انہوں نے کنواروں کا ایک کلب بنایا جس میں بہ شمول ان کے کل تین ممبر تھے۔ اپنی دانست میں یہ لڑکیوں کو رجھانے اور اچنبھے میں ڈالنے کے لیے ایک کیموفلاژ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں ان کا پیچھا کریں گی، مگر ہوا یہ کہ پولیس ان کے پیچھے پڑ گئی۔ گویا جال انہوں نے مچھلی پکڑنے کے لیے پھینکا تھا، اس میں آدم خور مگر مچھ پھنس گیا۔ دو ممبروں کے کنوار پن کا خاتمہ بلا خیر و خوبی سامنے فلیٹ میں رہنے والی لڑکیوں کے عشق سے ہوا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اس فلیٹ کے باقی ماندہ رومانی امکانات پر توجہ نہیں فرمائی۔

بولے، میں دن بھر چنے کی بوریاں اور مردے ڈھوتے ڈھوتے اتنا تھک جاتا تھا کہ کسی زندہ کو handle کرنے کے لائق نہیں رہتا تھا!

شفیع عقیل کو گھر میں کبھی بیوی کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ جس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان کا بیش تر وقت اپنے گھر میں نہیں گزرتا۔ شادی کے خیال سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ متاہلانہ زندگی یعنی ازدواجی زندگی کو محبت یا مشقت سے تعبیر کرتے ہیں اور گرہستی جیون کو جنسی گزر بسر کی ایک شریفانہ، بزدلانہ اور با کفایت شکل قرار دیتے ہیں۔

میں نے دریافت کیا، اس زمانے میں کوئی عشق بھی کیا؟ فرمایا کیوں نہیں؟ خود سے دگنی عمر کی ایک سکھنی پر دل و جاں سے عاشق ہو گیا تھا۔ اسے فانی بدایونی کے اشعار سناتا تھا، جن سے وہ ایسی بدکی کہ ملنا ہی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی فانی بدایونی کے دیوان کو ہاتھ نہیں لگایا۔

اس باب میں ہم نے زیادہ کریدا تو اپنے دریائے شباب کو ایک جملے کے کوزے میں بند کر دیا۔ فرمایا 'شاہ جی! میں نے ہر مزہ چکھا ہے۔' وہ کسر نفسی سے کام لیتے ہیں۔ مسلسل پچاس سال کے شغل اور ایک عمر کی بد پرہیزی کو اگر محض 'چکھنا' کہتے ہیں تو ہماری تا حیات محرومی اور حسرت آوارگی کے لیے اردو ڈکشنری میں کوئی لفظ نہیں ملتا۔ ممکن ہے عربی میں ہو۔ عربی کا حوالہ میں نے اس لیے دیا کہ شنید

ہے کہ یک زوجیے یعنی ایک ہی بیوی پر قناعت کرنے والے شوہر کو ابوظہبی' دبئی میں 'مسکین' کہتے ہیں! واللہ مرزا کہتے ہیں کہ دانا منھ بنا کے پیتے ہیں اور نادان پی کے منھ بناتے ہیں۔ ہمارے شاہ جی نے ہر کام' منھ پھیر کر ادھر کو' ادھر کو بڑھا کے ہاتھ' کیا ہے! بچپن میں ہم نے درسی کتاب میں ایک شعر پڑھا تھا جو اس زمانے میں زباں زد جوان و نوجوان تھا:

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگانی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

شاہ جی نے کرنے اور نہ کرنے کے کاموں کے لیے مناسب وقت اور موقعے کا انتظار نہیں کیا۔ ادھر علالت سے قبل' تقریباً ہر سال' گیارہ مہینے کی جمع شدہ حسرت سیر و شکار نکالنے اور فارن ایکسچینج کا سالانہ کوٹا ٹھکانے لگانے یورپ جاتے اور نت نئے مشاہدات و تجربات کی سوغات سے لدے پھندے لوٹتے تھے۔ ابن انشا مرحوم بہت یاد آتے ہیں۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں' گڑیاں ضرور خرید کر لاتے تھے۔ دوستوں کو دکھا کر بچوں کی طرح خوش ہوتے اور سفرنامہ پڑھنے کی تلقین کرتے۔

شاہ جی تادم تحریر کنفرمڈ کنوارے ہیں۔ ان کی سدا سہاگن جوانی سے توقع نہیں کہ شادی کا تکلف کر کے خود کو خواہ مخواہ تکلیف میں مبتلا کریں گے۔ کنوارے ہیں' کنوارے ہی رہیں گے۔ لیکن کیسے کنوارے؟ ایسے ویسے؟ وقت کم ہے اور محفل میں خواتین بھی موجود ہیں' لہٰذا صرف اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ وہ عورت ہوتے تو کبھی کی' کاروکاری' ہو چکی ہوتی۔ یہ بات میں الزام یا بہتان طرازی کے طور پر نہیں کہہ رہا' کاروکاری کی مذمت مقصود ہے' بڑی بری رسم ہے۔

پسند ناپسند کا ذکر آیا تو کہنے لگے' 'کتاب سے عشق ہے' بہت پڑھتا ہوں۔ مگر زندگی میں کبھی کوئی کتاب دوبارہ نہیں پڑھی۔

افسانے نہیں پڑھتا' ناول سے ہول آتا ہے' نان فکشن پڑھتا ہوں جب تک زندہ ہوں پڑھتا لکھتا رہوں گا۔'

ادبی تقریبوں اور جلسوں میں نہیں جاتے' فرماتے ہیں' صرف اپنے فنکشن میں جاتا ہوں' غالباً اس لیے کہ اس میں انہیں طوعاً و کرہاً تالی نہیں بجانی پڑتی۔

میں نے پوچھا' شاہ جی' آپ کو بال کس رنگ کے پسند ہیں؟' بولے' کسی بھی رنگ کے ہوں' میں تعصب نہیں برتتا' بس سفید نہ ہوں۔

سوال: 'آپ کو کراچی میں رہتے پچاس برس ہو گئے۔ اب آپ کو شہر زندہ دلاں لاہور کیسا لگتا ہے؟'
جواب: 'خود کو اجنبی محسوس کرتا ہوں۔ لیکن جہاں جہاں بچپن میں مصیبتیں جھیلیں اور مشقتیں اٹھائیں' جہاں چھابڑی لگائی' بوجھ ڈھوئے۔ وہ سب جگہیں مجھے پہچانتی ہیں۔ دور سے اشارے کر کر کے بلاتی

ہیں۔ لاہور میں اگر ایک گھنٹے بھی قیام کروں تو تین مقامات پر ضرور حاضری دیتا ہوں۔ داتا صاحب میاں میر صاحبؒ اور شاہ حسینؒ۔

’آپ ان تین آستانوں پر ایک گھنٹے میں کیسے پہنچ جاتے ہیں؟‘ میں نے چھیڑا۔

یہ بھی بزرگوں کا فیضان ہے‘ انہوں نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے فرمایا اور منھ دوسری طرف پھیر لیا۔

سوال: آپ نے دنیا دیکھی ہے‘ مے خانہ نشینی سے ترقی کرتے کرتے خانہ نشینی پر اتر آئے ہیں۔ اپنی عمر کے کس حصے کو آپ بہترین دور گردانتے ہیں؟‘‘

جواب: ’لا ابالی پن والا زمانہ جب میں جھگی میں رہتا تھا!‘

یہ دعویٰ عاجزانہ اور اعتراف فاخرانہ شاہ حسین اور بلھے شاہ کا شیدائی ہی کر سکتا ہے۔

انہوں نے کچھ غلط نہیں کہا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں ساری عمر عیش کیا ہے۔ غالب نے تفتہ کے نام ایک خط میں عیش کی جو تعریف کی ہے وہ اس باب میں حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں ’سنو صاحب‘ جس شخص کو جس شغل کا شوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے‘ اس کا نام عیش ہے۔‘ شاہ جی نے اس عیش فراواں میں اپنے پڑھنے والوں کو بھی برابر شریک رکھا ہے۔ زندگی کے مصائب و شدائد ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ فالج تک ان کے قہقہے کی گونج اور گمک کو دھیمی نہ کر سکا۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک عقد نا گہانی اور ہے

ایک ہفتے قبل ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ کو چاق چوبند دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ بولے ہاں‘ بالکل نارمل ہوں۔ بس ذرا تیز نہیں چل سکتا۔ میں نے کہا کہ جو لوگ روزانہ صبح سویرے ساحل سمندر اور پارکوں میں تیز قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں انہیں اپنی ٹانگوں کے حسن کارکردگی پر کون سا صدارتی ایوارڈ یا اولمپک گولڈ میڈل ملتا ہے؟

فرمایا ’شاہ جی! ہم دونوں ہی سچ کہتے ہیں۔‘

یہ کہا اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ان کے قہقہے کے لیے انگریزی لفظ Belly laugh سے بہتر کوئی لفظ نہیں ملتا یعنی ایسا قہقہہ جو منہ‘ حلق یا فقط ساؤنڈ باکس سے نہیں بلکہ معدے کی گونجیلی گہرائیوں سے نکلتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنے لطیفے اور فقرے کی داد خود ہی اس طرح دیتے اور طلب کرتے ہیں کہ قہقہے کے بعد اپنا زانو پیٹتے اور سیدھا ہاتھ پھیلا دیتے ہیں تاکہ دوسرا اس پر ہاتھ مار کر داد دے۔ شاہ جی کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ دوسرے کے فقرے پر بھی اپنا ہاتھ پھیلا کر داد سماعت وصول کرتے اور پرایا زانو پیٹتے ہیں‘ مطلب یہ کہ دوسرے کے فقرے کو اپنا فقرہ اور دوسرے

کی ران کو اپنی ران سمجھ کر پیٹ پیٹ کر لال کر دیتے ہیں۔
'بیلی لاف' پر یاد آیا کہ میں نے انٹرویو کے دوران پوچھا' 'آپ کو ڈانس کون سا پسند ہے؟'
بولے' Belly Dance' میں نے کہا' شاہ جی! یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لیے کہ بیلی ڈانس میں فقط پاپی پیٹ ناچتا ہے۔ باقی وجود دیکھتا رہ جاتا ہے۔'
فرمایا' 'شاہ جی! ہم دونوں ہی سچ کہتے ہیں'۔
اس مرد مجرد کے ایام جوانی کا قصہ ہے۔ ۱۹۵۲ میں انہوں نے جنسی افسانوں کا ایک سلگتا بھبکتا مجموعہ شائع کیا' جس کا نام' بھوکے' تھا۔ فرماتے ہیں' نام بدل بدل کر ہر افسانے یں بھوکا میں ہی تھا!' واضح ہو کہ بھوک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو گنتی کے نوالے حلق سے اتارنے کے بعد مٹ جاتی ہے۔ دوسری زیادہ شدید بھوک وہ جو یہ نوالے ہضم ہونے کے بعد خون صالح سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ انسان کی دوسری بھوک اور پہلی پیاس ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر زیر دفعہ ۱۹۲ تعزیرات پاکستان فحاشی کا فوج داری مقدمہ ثریا بیگم' مجسٹریٹ کی عدالت میں چلا۔ گواہان صفائی کی فہرست میں شورش کاشمیری' سعادت حسن منٹو' مولانا عبدالمجید سالک اور دیگر بڑے ادیب تھے جن کو عدالت میں پیش کرنا شفیع عقیل کے بس کے بات نہ تھی۔ اکابرین کی یہ فہرست تو کہاوت والی مینڈکوں کی پنسیری ثابت ہوئی جو کچھ پوری نہیں ہوتی۔۔۔ مینڈک انصاف کی ترازو سے پھدک پھدک کر نکل جاتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ عدالت نے چھ ماہ قید اور ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا سنادی۔
میں نے پوچھا' 'آپ پہلے ادیب ہیں جسے عریانی اور فحاشی کے جرم میں چھ ماہ کی قید کی سزا سنائی گئی۔ کیا آپ کے خیال میں آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی؟'
بولے۔ 'نہیں۔ نا انصافی قطعاً نہیں۔ وہ افسانے تھے بھی اسی لائق کہ مصنف کو جیل بھیج دیا جائے'۔
اڑتالیس سال گزرنے کے بعد اس سزا پر شاہ جی کا واحد اعتراض یہ تھا کہ صرف تین مہینے کی ہونی چاہیے تھی جو کسی بھی amateur اور سیکنڈ فحش نگار کے جوش جوانی کو اعتدال پر لانے کے لیے کافی ہوتی۔
جوانی کے سارے کام انہوں نے نوجوانی میں ہی نمٹا دیے جو سہواً یا اتفاقاً باقی رہ گئے انہیں پیری کی پختہ کاری کے لیے اٹھا رکھا۔ کچھ بچے وقت سے پہلے جوان ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ عین جوانی میں بڑھاپے کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ عمر رواں کا شدید احساس انہیں تنگ جوتے کی طرح ہمہ وقت کاٹتا رہتا ہے۔ ہم بعض ایسے شاعروں سے واقف ہیں جو مدت العمر سے شدت العمر میں مبتلا ہیں۔ چند ایسے بھی ہیں جن کی ایام جوانی کی شاعری میں ذم کا پہلو جھلکتا ہے اور عہد پیری کے اشعار

سے زم زم چھلکتا ہے! لیکن کچھ شاعر اور ادیب ایسے ہو گزرے ہیں جنکے لفظ کی امر جوانی پر بڑھاپے کے سائے کبھی نہیں پڑے۔ گردش لیل و نہار انکا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ چشم تصور خیام اور حافظ شیرازی کو بڑھاپے کے روپ میں دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس کا اطلاق ممتاز مفتی اور ضمیر جعفری کے سدابہار قلم پر بھی ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شفیع عقیل کی تحریر بھی نکھرتی' اجلتی اور سنورتی جاتی ہے۔ موقع و محل دیکھ کر چٹکی لینے اور اٹھلانے کو بھی گناہ نہیں سمجھتی۔

پنجابی لوک کہانیوں اور پنجابی کے قدیم شعراء کے ترجمے جس لگن اور للک سے شفیع عقیل کم و بیش ربع صدی سے کرتے رہے ہیں' وہ دونوں زبانوں سے ان کی شیفتگی اور عہد وفا کی استواری کا ثبوت ہیں۔ ان کے منظوم ترجموں کی نظر پار see-through چلمن سے متن کا اصل حسن لشکارے مارتا ہے۔ ترجمے کی دشواریاں کچھ مترجم ہی جانتے ہیں۔ اپنی زبان میں' کسی دوسرے کا مدعا' کسی تیسرے شخص کو سمجھانا قلم جوکھم کا کام ہے۔ اس کا نتیجہ بالعموم دہرے تہرے قتل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ کچھ ترجمے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اصل سے زیادہ مقبول ہوتے ہیں' جیسے فٹز جیرلڈ کا رباعیات خیام کا انگریزی ترجمہ۔ ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں کہ مجھے تو انگریزی ترجمہ اس سے بہت بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ مجھے فارسی نہیں آتی۔

اس کے برعکس بعض اوریجنل (طبع زاد) تخلیقات ایسی ہوتی ہیں جن میں ترجمے کی شان پائی جاتی ہے، جیسے مخدومی و مکرمی جناب عبدالعزیز خالد کا کلام۔ جب تک آدمی فاضل اجل اور عالم بے بدل نہ ہو' اور جب تک چار پانچ زبانوں میں مہارت نامہ نہ رکھتا ہو' یہ انتہائی نادر و نایاب خصوصیت کلام میں پیدا نہیں ہوتی۔ ایسے ترجمے کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ جب تک اس کا بھی مزید ترجمہ نہ کیا جائے' اصل خرابی واضح نہیں ہوتی۔ تفنن برطرف' جب تک ہماری طرح آپ کو بھی چار پانچ زبانوں سے گہری ناواقفیت نہ ہو' آپ ان کے کلام کی داد نہیں دے سکتے۔

شعری کی خوبی یہ ہے کہ شعر ہی معلوم ہو' اس پر ہماری نثر کا گمان نہ ہو۔ جب کہ ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ نہ معلوم ہو۔ جناب شان الحق حقی نیا نٹونی اینڈ کلوپیٹرا کا دلی کی با محاورہ زبان میں جو رواں دواں اور چٹخارے دار ترجمہ کیا ہے' وہ اپنی جگہ ایک شاہکار سے کم نہیں بلکہ بعض صائب الرائے احباب کا خیال ہے کہ شیکسپیر کے متن سے بہتر ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہوگا' ہم اس عہد کے سب سے بڑے زباں داں سے اصلاح لیتے رہے ہیں اور انہیں اپنا استاد و مرشد جانتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم یہ کہیں کہ ان کا ترجمہ اصل سے بہتر ہے تو اندیشہ ہے کہ ہمارے بدخواہ اسے شاگردانہ خوشامد (جسے پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے' بی ٹی تملق معلمانہ کہتے ہیں) تصور کریں گے۔ لیکن اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ شیکسپیئر اگر اردو میں لکھتا تو بلینک ورس میں لاکھ زور مارتا ہمارے استاد سے بہتر نہیں

لکھ سکتا تھا بلکہ ہماری طرح اصلاح لینے کے بعد بھی اپنا گستاخ سفید فام زانوئے تلمذ تہ کیے بیٹھا رہتا' تا آنکہ زانو سن ہو جاتا اور وہ تعظیم دینے کے لیے اٹھنے کے لائق بھی نہ رہتا۔

مثنوی 'سیف الملوک' کے مبسوط اور محققانہ مقدمے سے اس جگر کاری اور عرق ریزی کا اندازہ ہوتا ہے جو متن کی صحت' تدوین اور تلخیص کی خاطر گوارا کی گئی۔ کوئی ماخذ ایسا نظر نہیں آتا جسے انہوں نے کھنگالا نہ ہو۔ رواں اور برجستہ ترجمے میں انہوں نے کہیں بھی لطف کو لفظ پر قربان نہیں کیا۔ تحقیق و تدقیق ہمارا میدان نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی بھی چھوٹے یا بڑے میدان سے ہمارا واسطہ نہیں رہا۔ ہم تو ان میں سے ہیں جن کی درماندگی شوق ایک چھوٹی سی پناہ تراش کر آسودہ ہو جاتی ہے۔ ساری زندگی اعداد و شمار اور گنتی سے سروکار اور شغف رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے گن کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مقدمے میں اے سنین کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اس پر قیاس کر لیجئے کہ تصنیفات و واقعات کی صحت اور تعین زمانی کے ضمن میں انہوں نے کتنی اور کیسی محنت کی ہوگی؟ انہوں نے بہ کمال صحت و لطف ترجمہ کیا ہے اور جم کر داد تحقیق دی ہے۔ انہوں نے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو مستقبل میں ایک معتبر حوالے اور سند کا درجہ پائے گا۔

میاں محمد بخش کی مثنوی عظیم کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے' وہ ہمارے تہذیبی ورثے کا گراں قدر حصہ ہے۔ یہ ایک شہزادے کی داستان ہے جو لوک لہجے میں بیان کی گئی ہے۔ ظاہر ہے' 'سیف الملوک' کو کلام الملوک تو نہیں کہیں گے لیکن اس کے ملوک الکلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ پنجابی شعر و ادب اور لوک کہانیوں کی اشاعت دونوں زبانوں کی تفہیم و ترویج کے عمل کو تیز کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ مستقبل کی اردو کا لب و لہجہ آہنگ' محاورہ اور روزمرہ وہی ہوگا جو اس کے بولنے اور برتنے والوں کا ہوگا۔۔ پاکستانی زبانوں کے کلاسیکی ادب کے تراجم' اردو بولنے لکھنے اور پڑھنے والوں کو اساطیری تلمیحات' صدیوں پرانی لوک روایات' امثال اور Imagery کے نو دریافت خزانوں سے روشناس کرائیں گے۔ اردو ان صحت مند نامیاتی اضافوں کو خوش دلی اور خندہ جبینی کے ساتھ جز و زباں بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ماضی میں اس کا ساختیاتی ارتقا اس کی فطری لچک اور انجذابی اور ایجابی صلاحیتوں کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہ کسی بوسیدہ دیوار پر قدیم آرائشی اینٹیں لگانے کا عمل نہیں بلکہ ایک لچک دار شاخ پر دوسری ہری بھری جیتی جاگتی شاخ کی قلم لگانے کی ابتدا ہے جو دونوں کی بقا اور پھولنے پھلنے کی ضامن ہے۔۔

خدائے حی و قیوم ان ہاتھوں کو سلامت با کرامت رکھے جو اس ثمر یک رنگ و چہاررس کے سدابہار شجر کی آبیاری میں دل و جاں سے منہمک ہیں۔

ایک زیرک صحافی کی چشم نم سے شفیع عقیل نے پچاس برسوں میں کوئی بیس حکومتوں کو دھوم

دھڑکے سے بنتے' بڑھکیں مارتے اور بے عزتی سے رخصت ہوتے دیکھا ہے۔ حیف در چشم زدن شہرت من آخر شد۔ اور ایک انھی پر موقوف نہیں ساری قوم جاگتی آنکھ سے خواب دیکھتی اور سوتی آنکھ سے حالات حاضرہ کا مشاہدہ کرتی رہی ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ حالی کا سوا سو سال پرانا مگر حسب حال شعر دوسرے مصرعے میں تصرف کے ساتھ اکثر پڑھتے ہیں:

آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مندی

اس میں سندھی ہیں' مہاجر بھی ہیں' پنجابی بھی

جب دو آنکھیں زائد از ضرورت معلوم ہونے لگیں اور ایک آنکھ سے دیکھنے کی عادت پڑ جائے تو تسلیم و رضا کا شیوہ اتنا پختہ اور ایمان اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ ذاتی نالائقی بھی من جانب اللہ معلوم ہوتی ہے۔

صحافت اور 'جنگ' سے ان کی پیشہ ورانہ اور جذباتی وابستگی نے پچاس بہاریں دیکھی ہیں:

یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

جو کام بھی انہیں تفویض ہوا یا صحافت اور تصنیف و تالیف کا جو شعبہ یا عنوان انہوں نے اپنے لیے تجویز کیا' اس کی بجا آوری اور تکمیل میں اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لائے۔ ان کی لگن' تن دہی اور جگر کاری کا ثبوت پچیس کتابوں کے علاوہ وہ بکھرے ہوئے مضامین بھی ہیں جو کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔ ان کے ذاتی خزینے میں نادر پینٹنگز اور ان پر وہ مضامین بھی شامل ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔ انہوں نے صحافت کی تاریخ کے سارے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ فراز کم' نشیب زیادہ۔ اور اس سے بھی بدتر جمود بے ضمیری کا چٹیل اور بے برگ و بار پلیٹو۔ انہوں نے ظفر علی خاں' چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک کا آخری دور دیکھا۔ ڈھلتے سورج کی تابش و تابناکی کو جذب کیا۔ پھر نیرنگی دوراں نے وہ دن بھی دکھائے جب صحافت میں جب جاہ و زر کی قلم لگائی گئی جسے عرف عام میں 'لفافہ جرنلزم' کہتے ہیں۔ شاہ جی اس گلشن پر خار سے خود کو زخمائے بغیر بے نیازانہ گزر گئے۔ سیاست کی کثافت اور Polarization کی مخرب اقدار کشش سے کتنے صحافی اور کالم نویس ہیں جو خود کو بچا سکے ہیں۔ ان حالات میں حکومتیں اگر Fourth Estate کو اپنا زر خرید ترجمان و تابع فرمان بنانا چاہیں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ صحافی ہو یا سیاست داں' جج ہو یا بینکر اور بیوروکریٹ ...... یہ سب اسی ترکیب سے 'پکڑائی' دیتے ہیں' جس طرح بعض علاقوں میں بندر پکڑے جاتے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ ناریل میں اتنا سوراخ بنا دیا جاتا ہے کہ صرف بندر کا پنجہ اندر جا سکے۔ بندر نرم و شیریں کھوپرے کے لالچ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے اور مٹھی میں بہت سا کھوپرا بھر لیتا ہے۔ لیکن بھری مٹھی کو تنگ سوراخ سے نہیں نکال پاتا۔ مٹھی کھول کر کھوپرا چھوڑنے اور ہاتھ چھڑانے کا وہ تصور بھی

نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اسی طرح ایک ہاتھ ناریل میں پھنسائے تین پایہ بنا لنگڑاتا پھرتا ہے اور آسانی سے پکڑا جاتا ہے۔ پھر ساری عمر مداری کی ڈگڈگی اور اشاروں پر قریہ قریہ گلی گلی اچھل کود دکھاتا اور ہاتھ پھیلا کر پیسے بٹورتا ہے۔ مداری اگر رحم کھا کر اسے جنگل میں آزاد چھوڑ بھی دے تو واپس آجاتا ہے اور کسی نئے مداری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔

سو یہی حال ان حضرات کا ہوتا ہے جن کے معزز پیشوں کے نام ابھی اوپر گنوائے گئے ہیں۔ صحافیوں کی تخصیص نہیں۔ ایں خانہ ہمہ داغدار است۔ پھر بدگمانی اور شک وشبہ سے مملو ایسی فضا پیدا ہوجاتی ہے جس میں اگر کوئی شخص حالیہ بارش یا نئی فصل کے خربوزے کی بھی تعریف کرے تو اسے حکومت کا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں تو بے توقیری اتنی بڑھ گئی کہ حکومت نے صحافیوں کو بے اثر و بے ضرر جان کر انہیں پکڑنا چھوڑ دیا جس سے ان کی بڑی ہیٹی ہوئی۔

پس نوشت

اس مضمون کے چیدہ چیدہ حصے بطور ۴ر۱ خطبہ صدارت' شفیع عقیل صاحب کی تین کتابوں کی تقریب اجرا میں پڑھے گئے۔ اس کے چند روز بعد وہ غریب خانے پر تشریف لائے اور میرے سہو تسامح کی' جسے غلط بیانی کہنے میں ان کی شائستگی مانع تھی' نشان دہی کی۔ ایک پرچہ میرے حوالے کیا جس پر چار قابل اصلاح و ناقابل درگزر غلطیوں کی وضاحت کی تھی جو ان کے الفاظ میں کچھ یوں ہیں:

۱۔ 'آپ نے لکھا ہے' 'میں افسانے نہیں پڑھتا'، جب کہ میں نے کہا تھا' میں آج کل افسانے نہیں پڑھتا'

یہ واقعی بڑا باریک فرق ہے، مثلاً کوئی ملزم یہ کہے کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں قتل نہیں کرتا بلکہ یہ کہا تھا کہ 'میں آج کل قتل نہیں کرتا' تو عدالت اسے بری کرنے سے پہلے دس دفعہ سوچے گی۔

۲۔ تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں

جان بہت شرمندہ ہیں

'آپ نے یہ شعر افتخار عارف کے حوالے سے لکھا ہے' یہ عبید اللہ علیم کا ہے۔'

عرض ہے کہ یہ شعر افتخار عارف کے پہلے مجموعے 'مہر دونیم' میں موجود ہے۔ وہ بہت محتاط اور دیانتدار آدمی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے دیوان میں شامل کرنے سے پہلے انہوں نے پوری طرح اطمینان کرلیا ہوگا کہ یہ شعر انہیں کا ہے۔

جب یہ کتاب چھپ رہی تھی تو میں نے لندن میں افتخار عارف سے کہا تھا کہ عزیزم! یہ شعر حذف کردو۔ اس لیے کہ، تمہارے ذہین وشاداب چہرے پر مجھے شرمندگی کی کوئی رمق نظر نہیں آتی بلکہ تازہ فتوحات کی علامات ہویدا ہیں۔ مزید برآں' محض زندہ بچ جانے پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں'

جوان آدمی کے لیے شرمندہ ہونے کا کوئی نا معقول جواز ضروری ہے۔
جہاں دیدہ ہیں۔ بولے، بلا وجہ شرمندہ پھرنے سے دوسروں کی انا کی تسکین ہوتی ہے۔
۳۔ 'کھڑکیوں میں کھڑی ہونے والی لڑکیوں اور کنوارا کلب کے واقعات گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ لڑکیوں کا قصہ ۱۹۴۸ کا ہے اور لاہور میں دکان کے حوالے سے ہے۔ جب کہ کنوارا کلب ہم نے ۱۹۵۲ میں کراچی میں بنائی تھی'۔
مجھے واقعی افسوس ہے کہ میں نے لاپروائی سے لذت آوارگی کو نحوست تجرد سے خلط ملط کر دیا۔
ان کی وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی آزادہ روی اور آوارگی کے بیان میں بھی وہ طریقہ وجائے واردات اور سنین وغیرہ کی صحت کا اتنا ہی خیال رکھتے ہیں جتنا کہ مرحوم شاعروں کی زندگی پر خشک تحقیق کے دوران چھان پھٹک سے کام لیتے ہیں۔
۴۔ 'بھیڑ بکریوں کی بجائے مویشی چرانا ہے'۔
اس التباس کا اعتراف لازم ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ نے بھی ہمیں ڈانٹا کہ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ چرواہوں اور قصائیوں کی sno bbery میں بڑا فرق ہے۔ بھیڑ بکری کا گوشت بیچنے والا قصائی گائے بھینس کا گوشت بیچنے والے قصائی سے برتر اور زیادہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس گائے بھینس چرانے والا چرواہا، بھیڑ بکری چرانے والے گڈریے پر فوقیت رکھتا ہے۔
ہمیں اس کا علم نہیں تھا۔ اس لیے کہ ہمیں تو بچپن میں صرف مرغیاں چگانے اور انہیں ہنکال کر ڈربے میں بند کرنے کا تجربہ ہے۔ اللہ جانے اس درجہ بندی میں ہمیں کس سیڑھی پر کھڑا کیا جائیگا۔
مرزا نے یہ بھی کہا کہ تم نے لکھا ہے کہ 'میں (یعنی شاہ جی) بکریاں چراتا رہا'۔ جب یہ مضمون چھپواؤ تو ازراہ کرم چراتا کی چ پر زبر ضرور لگانا' جلی قلم سے۔ یہ اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ آگے چل کر تم نے لکھا ہے کہ شاہ جی کو چھ ماہ کی سزائے قید ہوئی ہے۔ جس طرح بعض لکھنے والے واقعات کو غلط ملط کر دیتے ہیں، اسی طرح کچھ پڑھنے والے اعراب ادھر کے ادھر کر دیتے ہیں۔ زیر کی جگہ زبر کی بجائے پیش لگا دیتے ہیں!۔۔

☆☆☆

MUNTEKHABAAT
-E-
YUSUFI

DR. MAIMOONA MASOOD

DEPT. OF URDU,
OSMANIA UNIVERSITY
HYDERABAD, A.P.